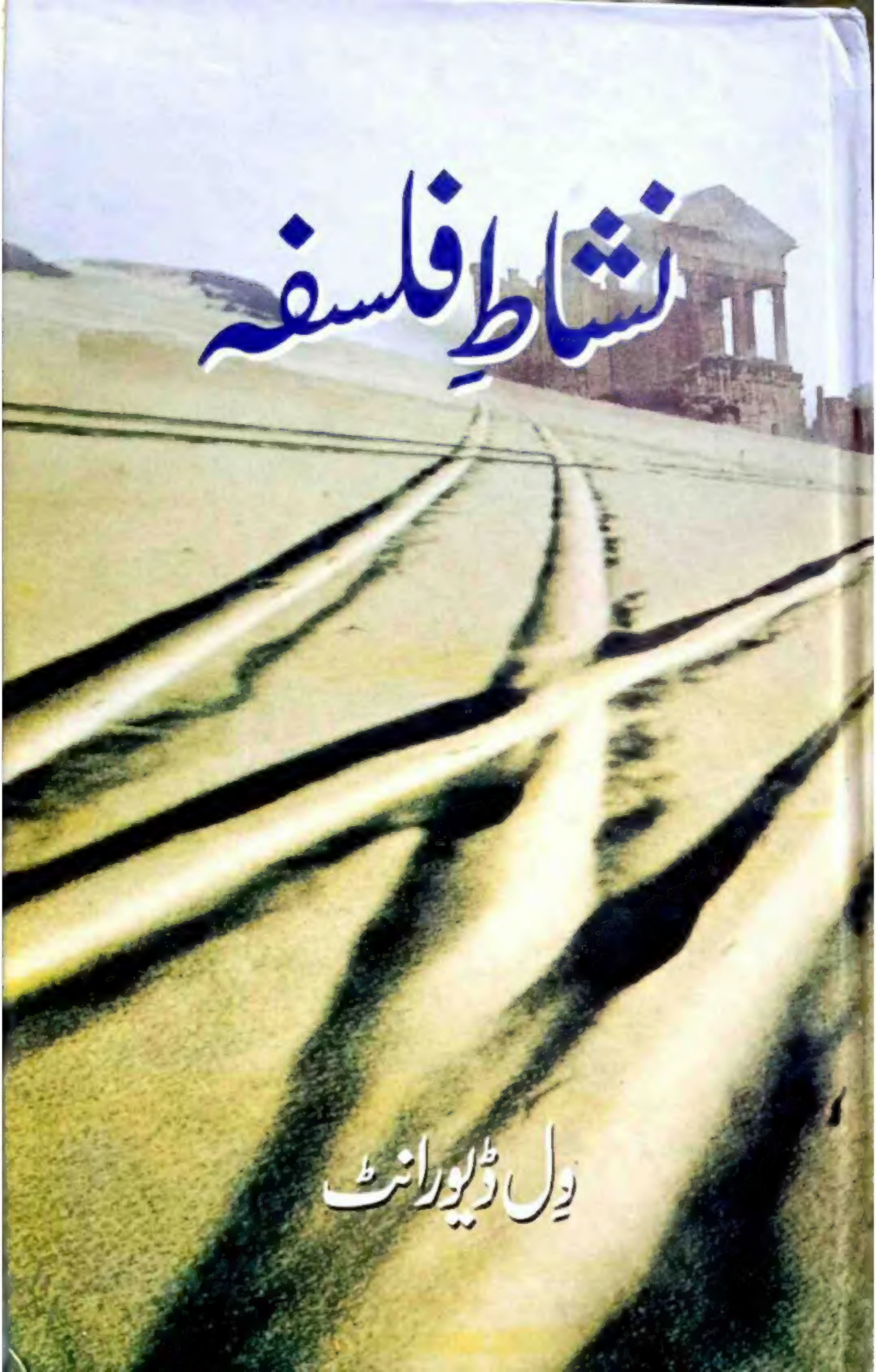
نشاطِ فلسفہ
وِل ڈیورانٹ

نشاطِ فلسفہ

ول ڈیورانٹ

ترجمہ: محمد اجمل

ایم۔اے، پی ایچ۔ڈی (لندن)

صدر شعبہ نفسیات، گورنمنٹ کالج، لاہور

فکشن ہاؤس

لاہور ○ کراچی ○ حیدرآباد

e-mail: fictionhouse1991@gmail.com

فہرست مندرجات

دعوت فکر 11

حصہ اول: مقدمہ

باب اول:۔۔۔۔ فلسفے کا سحر

1 ابتدائیہ 16
2 ماہرین فلسفہ علم 18
3 عالمان دین 20
4 سائنس دان 23
5 سائنسوں کی ملکہ 28

حصہ دوم: منطق اور فسلفہ علم

باب دوم:۔۔۔۔ حقیقت کیا ہے؟

1 حواس اور عقل 33
2 رموز علم 40
3 عقل اور جبلت 47

حصہ سوم: مابعد الطبیعیات

باب سوم:۔۔۔ مادہ زندگی اور ذہن

1 لاادری کا مقدمہ 55

2 مادیت 56
3 عینیت 59
4 مادہ کیا ہے؟ 61
5 زندگی 67
6 مادہ پرست کا نظریہ 69
7 عینیت پرست کا جواب 72
8 ترکیب 74

باب چہارم:۔۔۔۔ کیا انسان ایک مشین ہے؟

1 تناظر 78
2 میکانکیت 83
3 جبریت 89
4 حیاتیات کا عہد 97

حصہ چہارم: مسائل اخلاق

باب پنجم:۔۔۔۔ ہمارے بدلتے ہوئے اخلاق

1 اخلاق کی اضافیت 97
2 زراعتی نظام اخلاق 99
3 صنعتی نظام اخلاق 102
4 ہمارے بداخلاق بزرگ 107
5 خاندان 109
6 اسباب 110

باب ششم:۔۔۔۔ اخلاق اور بد اخلاقی

1 اخلاق ذہانت کی حیثیت سے 114

2 فطری اخلاق 116
3 اخلاق کی کسوٹی 120
4 عالمگیر اخلاق 123
5 جنس اور اخلاق 125

باب ہفتم:۔۔۔۔ عشق

1 ہم عشق کیوں کرتے ہیں؟ 127
2 ایک حیاتیاتی نظریہ 128
3 بدنیاتی بنیاد 130
4 روحانی ارتقاء 134

باب ہشتم:۔۔۔۔ مرد اور عورت

1 محبت کی جنگ 141
2 شخصیت کے اختلافات 142
(ا) نسلی جبلتیں 142
(ب) انفرادی جبلتیں 145
(ج) اجتماعی جبلتیں 148
3 ذہنی اختلافات 151
4 عورت اور فطنیت 153
5 کیا یہ اختلافات فطری ہیں؟ 156

باب نہم:۔۔۔۔ عصر حاضر کی عورت

1 انقلاب عظیم 159
2 اسباب 161
3 ہماری بیٹیاں 165
4 ہماری بڑی بوڑھیاں 170

باب دہم:۔۔۔۔ شادی کی شکست

1 شادی کا ارتقاء 174
2 شادی کا تنزل 177
3 شادی کی تعمیر نو 181
4 بچے پیدا کرنا 188

باب یازدہم:۔۔۔۔ بچوں کے متعلق ایک اعتراف

1 ذاتی 191
2 جسمانی 192
3 اخلاقی 194
4 جنسی 201
5 ذہنی 202
6 دربارۂ سرور 207

باب دوازدہم:۔۔۔۔ شخصیت کی تعمیر نو

1 شخصیت کے عناصر 208
2 سلبی شخصیت 213
3 ایجابی شخصیت 216
4 شخصیت کی دوبارہ تعمیر کرنا 219
5 نسخے 223

حصہ پنجم: جمالیات

باب سیزدہم:۔۔۔۔ حسن کیا ہے؟

1 فلسفیوں کا جمالیاتی شعور 230
2 حیوانوں میں جمالیاتی احساس 232

3 بنیادی حسن: اشخاص 234
4 ثانوی حسن: فطرت 234
5 حسن ثالث: فن 241
6 معروضی حسن 245

حصہ ششم: فلسفہ تاریخ

باب چہاردہم:۔۔۔۔ تاریخ کا مفہوم ایک مکالمہ

1 پوما نوک میں افتتاحیہ 249
2 تاریخ کی مذہبی تاویل 254
3 تاریخ کی جغرافیائی تعبیر 258
4 تاریخ کی نسلی تعبیر 266
5 تاریخ کی معاشی تعبیر 273
6 تاریخ کی نفسیاتی تعبیر 281
7 مجتمع تاریخ 288

باب پانزدہم:۔۔۔۔ کیا ترقی سراب ہے؟

1 ترقی کا آغاز 293
2 ترقی کا عروج 296
3 ترقی کا تنزل 299
4 چند اور فروعی باتیں 302
5 تاریخ کا خلاصہ 305

باب شانزدہم:۔۔۔۔ تہذیب کی تقدیر

1 اعصابی دور 315
2 اقوام کی فنا 317
3 اقتصادیات اور تاریخ 320

4 حیاتیات اور تہذیب 323
5 اجتماعات اور تہذیب 326
6 تہذیب کی بقائے دوام 328
7 امریکا کا مستقبل 330

حصہ ہفتم: فلسفہ سیاست

باب ہفدہم:۔۔۔۔ آزادی کے محاسن

1 شراب اور آزادی 335
2 آزادی کا مسلک 338
3 مزاجیت 341
4 آزادی کی مشکلات 344
5 جیفرسن کا تصور ریاست 347

باب ہشدہم:۔۔۔۔ کیا جمہوریت ناکام رہی ہے؟

1 جمہوریت کے ماخذ 351
2 جمہوریت کا زوال 353
3 جمہوریت کے طریقہ ہائے عمل 358
4 عطائی نسخہ 362

باب نوزدہم:۔۔۔۔ رئیسیت

1 رئیسیت کا احیاء 367
2 طرز ہائے حکومت 368
3 سیاستدانی 370
4 قدامت پسندی 372
5 حکومت اور تہذیب 374
6 جمہوریت اور انتشار 376

7 رنیسیت کی خامیاں 377
8 ایک اور عطائی نسخہ 381

باب بستم:۔۔۔۔ ہم نے جنت الارض کیونکر بنائی؟

1 جنت الارض کے فوائد 385
2 میئر جانتا ہے 388
3 وہ عظیم مجلس مشاورت 389
4 تعلیم کے ذریعہ حکومت 392
5 لکھ پتیوں کی اشتراکیت 395
6 جنت الارض کے لئے سرمایہ 397
7 لیکن در حقیقت! 398

حصہ ہشتم: مذہب ــــــ ایک مکالمہ

باب بست و یکم:۔۔۔۔ باغ میں: مذہب کی تشکیل

1 مادہ میں روح دیکھنا 403
2 سحر 407
3 ٹوٹم اور تحریم 412
4 آبا پرستی 413
5 فطرت پرستی 416

باب بست و دوم ۔۔۔۔ کھانے کی میز پر: کنفیوشس سے مسیح تک

1 کنفیوشس 424
2 تصوف 427
3 یہودیت 431
4 مسیحیت 436

5 کیتھولک مسلک اور پروٹسٹنٹ مسلک 443

باب بست و سوم:۔۔۔ کتب خانہ میں: خدا اور بقاء

449
1 بقا 456
2 خدا کے تغیر پذیر تصورات 464
3 مذہب کا منصب 471
4 خدا کا نیا تصور

حصہ نہم

باب بست و چہارم:۔۔۔ زندگی اور موت

1 بچپن 476
2 شباب 477
3 کہولت 480
4 موت 483

دعوت فکر

اس کتاب میں ایک مربوط فلسفہ حیات ترتیب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ میری کتاب "داستان فلسفہ" میں بڑے بڑے مفکروں کی شخصیتوں اور ان کے فلسفوں کو بیان کیا گیا تھا اور انہیں آسان زبان میں ادا کرنے اور موجودہ حالات کی روشنی میں پرکھنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس کے برعکس اس کتاب میں فلسفہ کے مسائل کو سلجھایا گیا ہے۔ لیکن اس کتاب میں نہ قصے کہانیاں ہیں اور نہ عظیم مفکروں کے اقوال جن سے پہلی کتاب میں موضوع کی گرانباری گوارا بن جاتی تھی۔ لیکن اس سے شاید ہمیں یہ فائدہ ہو کہ ہم اپنی زندگی کے مسائل کے قریب تر آ جائیں' کیونکہ یہاں ہمارا موضوع خود ہماری ذات ہے۔

جب سے دولت اور فلسفہ کے ظہور نے یونان کے روایتی مذہب کو ختم کیا ہے' انسانی کردار اور ایمان میں کبھی اتنی گہری اور خطرناک تبدیلیاں نہیں ہوئیں جتنی آج کل ہو رہی ہیں۔ آج پھر سقراط کا زمانہ ہے۔ ہماری اخلاقی زندگی خطرہ میں ہے اور پرانے رسوم و عقاید کے انحطاط سے ہماری ذہنی زندگی میں تب و تاب اور وسعت پیدا ہو رہی ہے۔ ہمارے خیالات اور اعمال کی بنیاد ندرت اور تجربہ ہے۔ کوئی بات قطعی طور پر طے شدہ اور یقینی نہیں رہی۔ ہمارے زمانہ میں جس سرعت سے طرح طرح کی تبدیلیاں ہو رہی ہیں' اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئیں۔ حتیٰ کہ پیریکلیز کے عہد میں بھی نہیں ہوئیں۔ ہر چیز بدل گئی ہے۔ ان اوزاروں سے لے کر جو ہماری مشقت کو پیچیدہ بناتے ہیں اور ان پہیوں سے لے کر جو ہمیں زمین پر گھمائے پھرتے ہیں' ہمارے جنسی تعلقات کے نت نئے اسالیب اور ہماری روحوں کی الم ناک حقیقت پسندی تک' ہر چیز بدل رہی ہے۔ زراعت سے صنعت' دیہات سے قصبہ' اور قصبے سے شہر کے ارتقا نے سائنس کے مقام کو بلند تر کر دیا ہے' اور فن کی حیثیت کو گرا دیا ہے۔ فکر کو آزادی ملی ہے۔ ملوکیت اور ریسیست کا خاتمہ ہوا ہے۔ جمہوریت اور اشتراکیت نے جنم لیا ہے۔ عورت کو حریت حاصل ہوئی ہے۔ شادی کے علائق اور پرانے اخلاقی نظام شکستہ ہو گئے ہیں۔ رہبانیت کی جگہ عیاشی اور پارسائی کی جگہ

لذت پرستی نے لے لی ہے اور تعیش کو سکون قلب سے بلند تر مرتبہ حاصل ہوا ہے۔ جنگوں کی تعداد کم تو ہو گئی ہے لیکن وہ خطرناک تر ہو گئی ہیں۔ ہم سے ہمارے محبوب دینی ذہنی عقاید چھن گئے ہیں۔ اور ان کے عوض میں ہمیں ایک میکانکی اور قسمت پرست فلسفہ حیات کا غلام بننا پڑا ہے۔ یہ سب کچھ سائنس کے ارتقا کا نتیجہ ہے۔ اور ہم اس انقلاب میں کوئی مرکز اور استحکام تلاش کر رہے ہیں۔

ہر پھلتے پھولتے تمدن میں ایک ایسا زمانہ آتا ہے جب پرانے رجحانات اور عادتیں نئے حالات پر قابو پانے کے لئے ناکافی ثابت ہوتی ہیں۔ اور قدیم نظام اخلاق زندگی سے نئی نشوونما کے بوجھ سے پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔ جب سے ہم نے کارخانوں اور دفتروں کی خاطر کھیتوں اور گھروں کو خیرباد کہا ہے۔ ہر شعبہ زندگی میں فطری اسالیب ترتیب و عمل ختم ہو گئے ہیں۔ عقل نئے نئے تجربوں میں اس لئے الجھ رہی ہے کہ جبلتوں کی آبائی معمولی اور سادگی کو شعوری ہدایت کے سپرد کر دیں بچوں کی غذا کے بارے میں معمولی اصولوں اور ہمارے ژولیدہ دماغ ماہرین غذائیات کی حیاتین سے لے کے تجارتی بدنظمیوں و دور رس کی کوششوں تک ہر مسئلہ میں ہمیں فکر و تدبر سے کام لینا پڑتا ہے۔ ہم اس آدمی کی طرح ہیں جو اپنی ٹانگوں کے متعلق سوچے بغیر چل نہیں سکتا یا اس کھلاڑی کی طرح ہیں جو کھیلتے وقت بھی اپنی ہر حرکت کا تجزیہ کرنے پر مجبور ہے۔ جبلت کی وحدت ہم سے جدا ہو گئی ہے۔ ہم فکر اور تشکک کے سمندر میں غوطے کھا رہے ہیں۔ وسیع علم اور طاقت کے باوجود ہم اپنے مقاصد' اپنی اقدار' اور اپنے منصوبوں کے متعلق کوئی پختہ یقین نہیں رکھتے۔

کسی صحت مند ذہن کے لئے اس انتشار سے ایک ہی مناسب راہ فرار ہے اور وہ یہ کہ وہ لمحہ اور جزو سے ابھر کر کل پر غور کرے۔ ہماری سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ ہم نے ایک مربوط زاویہ نگاہ کھو دیا ہے۔ زندگی ہمارے لئے اس قدر پیچیدہ اور متحرک ہو گئی ہے کہ ہم اس کی وحدت اور اہمیت کی تھاہ نہیں لا سکتے۔ ہم شہری نہیں رہے' فقط افراد بن کے رہ گئے ہیں۔ ہم ایسے مقاصد سے محروم ہیں جو ہمیں موت سے آگے کوئی بات بجھا سکیں۔ ہم انسانیت کے چیتھڑے ہیں اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ آج ہم میں سے کسی میں یہ ہمت نہیں کہ زندگی کے سارے پہلوؤں کا جائزہ لے سکے۔ تجزیہ میں اضافہ ہو رہا ہے لیکن ترتیب میں کمی۔ ہم ہر شعبہ میں ماہرین سے خائف ہیں اور تحفظ کی خاطر اپنے مخصوص پیشوں کی چار دیواری میں محبوس ہو کر رہ گئے ہیں۔ زندگی کے ڈرامے میں ہر شخص کو اپنا پارٹ تو یاد ہے لیکن وہ اس کے مطلب سے نابلد ہے۔ زندگی بے معنی ہو رہی ہے اور آج

جبکہ اس کے بھرپور ہونے کے بہت امکانات ہیں، وہ تہی دامن نظر آتی ہے۔

آؤ، ہم بے باکی سے آتش نمرود میں کود پڑیں اور اپنے مسائل کا اس طرح مطالعہ کریں کہ ہر جز و کل میں سما جائے۔ ہمارے نزدیک فلسفہ کی تعریف ایک مربوط زاویہ نظر ہے جس میں ذہن زندگی پر محیط ہو جاتا ہے اور بد نظمی میں وحدت اور ترتیب پیدا ہو جاتی ہے۔ فلسفہ ہمارے لئے چند بے جان تصورات کو الٹنے پلٹنے کا نام نہیں۔ وہ تصورات جو ہماری روزمرہ زندگی سے کوسوں دور ہیں، بلکہ ان تمام مسائل کا مجموعہ ہے، جو ہماری زندگی کی قدر و اہمیت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ پہلے ہم منطق سے دوچار ہو لیں اور پیلاطس کے اس سوال کا جواب دیں کہ "حق کیا ہے؟" ہم پہلے مختصر طور پر فلسفہ علم کو بیان کریں گے اور انسانی عقل کی حدود کو متعین کریں گے۔ ان علوم کو دنیائے فلسفہ میں ناجائز اہمیت دی گئی ہے۔ لیکن اس کتاب میں انہیں مختصراً بیان کیا جائے گا کہ قصر فلسفہ میں انہیں اس سے برتر مقام حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد ہم مابعد الطبیعات کے مسائل پر غور و خوض کریں گے اور مادیت کے بارے میں کسی قطعی نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کریں گے۔ ہم یہ دریافت کرنے کی کوشش کریں گے کہ فکر مادہ کا وظیفہ ہے کہ نہیں؟ اور "انتخاب" ایک مشین کا جو عارضی طور پر زندگی سے معمور ہے التباس فکر تو نہیں؟ اس کے بعد ہم اخلاقیات کی اقلیم کی سیر کریں گے، اور اچھی زندگی کی نوعیت دریافت کریں گے۔ ہم اخلاقی انقلاب، شکستہ، شتہ عقد اور بے کیف محبت کے اسباب و نتائج پر غور کریں گے۔ ہم موجودہ زمانہ کی عورت کے بارے میں بے جا احترام یا جذبہ انتقام میں مبتلا ہوئے بغیر اظہار خیال کریں گے۔ ہم زینو اور اپی کیورس کو ایک دوسرے کے مقابلے میں لاکھڑا کریں گے۔ اور خوشی کے ایوانوں کی تلاش کریں گے۔ ہم اپنے نتائج کو یکجا کر کے تعلیم و تدریس اور شخصیت کی تعمیر کے لئے مشعل ہدایت بنائیں گے۔ چند لمحوں کے لئے ہم جمالیات کے مسائل، حسن کی نوعیت اور آرٹ کی ممکنات کا جائزہ لیں گے۔ ہم تاریخ کا مطالعہ کریں گے اور اس کے مطالب و قوانین متعین کریں گے۔ ہم ترقی کے معانی سمجھیں گے۔ اوز اپنے تمدن کے ستارہ تقدیر پر کمند پھینکیں گے۔ پھر ہم فلسفہ سیاست کی طرف رجوع کریں گے اور سرکش جوانوں کی طرح نراج، اشتراکیت، اشتمالیت، جمہوریت، رئیسیت اور آمریت کے مسائل پر بحث و تمحیص کریں گے۔ فلسفہ مذہب ہمیں ہستی باری تعالیٰ اور بقائے روح کے پرانے سوالوں میں الجھائے گا۔ اور ہم تاریخ مذہب کی روشنی میں مسیحیت کے ماضی اور مستقبل کا مطالعہ کریں گے اور آخر میں یاسیت اور امید آفرینی کے دیوتا ہم کو انسانی زندگی

لے کر ہم اپنی زندگی کی قدر و
کی لذت و الم کا مفہوم سمجھائیں گے۔ اور پھر کل کا جائزہ
اہمیت بیان کریں گے۔ یہ سیاحت لامتناہی ہے۔
مصروف ناظر یہ سوال کرے گا۔ کیا یہ تمام فلسفہ مفید ہے؟ اس طرح کا سوال افسوس
ناک ہے۔ ہم یہ سوال شاعری کے بارے میں نہیں پوچھتے' حالانکہ شاعری بھی ایک ایسی
کائنات کی تخیلی تعمیر ہے' جسے ہم پوری طرح نہیں سمجھ پاتے۔ اگر شاعری ہم پر حسن کے
وہ اسرار و رموز واضح کرتی ہے جنہیں ہماری ناتربیت یافتہ آنکھیں نہیں دیکھ پاتیں تو فلسفہ
ہمیں سمجھنے اور جذبہ عفو سے آراستہ ہونے کی دانش بخشتا ہے۔ اس سے زیادہ ہمیں اور کیا
چاہئے؟ یہ ساری کائنات کی دولت سے کہیں زیادہ قیمتی خزانہ ہے۔ فلسفہ ہماری جیبوں کو
گرم نہیں کر سکتا اور نہ ہمیں جمہوری ریاست کے معزز عہدوں سے سرفراز کر سکتا ہے۔
ممکن ہے کہ ہمیں ان لذتوں سے کسی قدر بے نیاز کر دے۔ کیونکہ آخر دولت اور بلند
مرتبوں کی حیثیت ہی کیا ہے! اگر ہمارا ذہن بے خبر رہے' ہماری شخصیت متزلزل' ہمارا کردار
متوحش' ہماری آرزوئیں اور امنگیں بے ربط' شوریدہ سر' اور ہمارہ سکون مفقود رہے؟

پختگی حاصل زندگی ہے۔ شاید فلسفہ "بشرط استواری و وفاداری" ہماری روحوں کو
وحدت کی صحت سے مالا مال کر دے۔ ہم اپنے تفکر میں کس قدر خام اور بے ربط ہیں۔ یہ
ہو سکتا ہے کہ فلسفہ کے ذریعے ہم اپنے خیالات میں صفائی اور ربط پیدا کر لیں' اور متناقض
آرزوؤں اور عقیدوں کو اپنے دل و دماغ میں دیکھ کر شرم سے سر جھکا لیں' اور ممکن ہے کہ
ذہن کی یہ مرکزیت ہمارے مقاصد میں وہ ہم آہنگی پیدا کر دے' جو شخصیت کی جان ہے اور
ہماری ہستی کو توازن اور برتری بخشتی ہے۔ فلسفہ وہ مربوط علم ہے جو زندگی میں آہنگ پیدا
کرتا ہے۔ شخصیت کی نظم و ترتیب ہی ہمیں سکون اور آزادی کے بلند مقامات پر لے جاتی
ہے۔ علم طاقت ہے۔ لیکن حکمت ہی ہمیں آزادی کی نعمت سے مالا مال کرتی ہے۔

آج ہمارا تمدن سطحی اور ہمارا علم خطرناک ہے۔ ہمارے پاس مشینیں تو بہت ہیں' لیکن
مقاصد کے معاملہ میں ہم مفلس ہیں۔ مذہبی ایمان کی حرارت سے جو توازن ہمیں حاصل تھا'
آج معدوم ہے۔ سائنس نے اخلاق کی مافوق الفطرت بنیادیں اکھیڑ دی ہیں۔ اور ساری دنیا
ذاتیت کے انتشار میں الجھی ہوئی ہے کیونکہ ہماری شخصیتیں کٹی پھٹی ہیں۔ ہم پھر اس مسئلہ
سے دوچار ہیں جس نے سقراط کو پریشان کیا تھا۔ ہم کس طرح ایک فطری اخلاق کی طرح
ڈالیں' کیونکہ اخلاق کی مافوق الفطرت بنیادیں اب انسانی کردار کو متاثر نہیں کرتیں۔ فلسفہ
کے بغیر اور اس وحدت نظر کے بغیر جو مقاصد کو جوڑتی ہے اور تمناؤں اور آرزوؤں کی

تہذیب و ترتیب کرتی ہے، ہم اپنی تمدنی وراثت کو کلیت یا انقلابی جنون سے ضائع کر رہے ہیں۔ ہم اپنے امن پسند مقاصد کو تج کر جنگ کی اجتماعی خودکشی میں شریک ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں لاکھوں سیاست داں ہیں لیکن اہل سیاست ایک بھی نہیں۔ ہم زمین پر اس سرعت سے گھومتے ہیں کہ اس سے پہلے کسی قوم کو یہ رفتار نصیب نہیں ہوئی۔ لیکن ہم یہ نہیں جانتے اور یہ نہیں سوچتے کہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟ اور کیا جہاں ہم جا رہے ہیں وہاں ہماری اداس روحوں کو کوئی امن و سکون میسر آ سکے گا؟ ہم طاقت علم کے نشہ میں سرشار ہیں۔ یہ علم ہمیں برباد کر رہا ہے، اور ہمارا علاج "فکر و نظر" کے سوا کچھ نہیں۔

حصہ اول: مقدمہ

باب اول

فلسفے کا سحر

۱۔ ابتدائیہ

آج ہمیں فلسفہ سے محبت کیوں نہیں؟ سائنسوں نے جو اس کی اولاد ہیں' اس کی جائداد کے حصے بخرے کر لئے ہیں اور اسے گھر سے باہر دھکیل دیا ہے۔ یہ ناشکری کی انتہا ہے۔ کسی زمانہ میں عظیم شخصیتیں اس کے لئے جان دینے کو تیار تھیں۔ سقراط نے دشمنوں سے بھاگنے کی بجائے فلسفہ کے لئے جام شہادت پینا منظور کیا۔ افلاطون نے اس کے لئے ایک ریاست قائم کرنے کی خاطر دو مرتبہ اپنی جان خطرہ میں ڈالی۔ مارکس اور بلینس کو تخت و تاج سے زیادہ اس سے محبت تھی۔ اور برونو اس کا وفادار ہونے کے جرم میں آگ میں جلا دیا گیا۔ کسی زمانہ میں کلیسا اور حکومتیں اس سے کانپتی تھیں۔ اور اس کے نام لیواؤں کو اس لئے قید و بند میں ڈال دیتی تھیں کہ ان کی وجہ سے حکومتوں کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہوتا تھا۔ ایتھنز کی حکومت نے پریگورس کو جلا وطن کر دیا۔ اور سکندریہ کی حکومت ہائیپیشیا سے لرزتی تھی۔ ایک مشہور پاپائے روم نے نہایت منکسرالمزاجی سے ارسمس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ بادشاہوں نے والٹیر کو اپنی مملکتوں سے نکال باہر کیا۔ اور جب تمام مہذب دنیا نے اس کے قلم کی طاقت کے سامنے سر جھکا دیا تو وہ حسد سے جل بھن گئے۔ ڈائیونیسیس اور اس کے بیٹے نے افلاطون کو سائیراکیوز کی حکومت بخش دی اور سکندر کی اعانت نے ارسطو کو تاریخ کا قابل ترین انسان بنا دیا۔ ایک عالم بادشاہ نے فرانسس بیکن کو انگلستان کی قیادت عطا کر دی اور اسے اس کے دشمنوں سے بچایا۔ فریڈرک اعظم' جب نیم شب کو اس کے سارے عظیم الشان جرنیل سو جاتے تھے تو وہ فلسفیوں اور شاعروں سے صحبت فکر و سخن قائم کرتا اور ان کی وسیع اور غیرفانی اقلیموں کو رشک کی نظر سے دیکھتا۔

وہ دن فلسفہ کے لئے عظیم الشان دن تھے' جب نہایت دلیری سے اس نے تمام علم کو

اپنی مملکت میں شامل کر لیا اور ہر مرحلہ پر ذہن کی ترقی کے سلسلوں میں پیش پیش رہا۔ انسان اس وقت اس کی عزت کرتے تھے جبکہ راست بازی کی محبت سے زیادہ کوئی چیز قابل احترام نہیں سمجھی جاتی تھی۔ سکندر، دیوجانس کلبی کو صرف اپنے آپ سے کم تر سمجھتا تھا۔ اور دیوجانس کلبی نے اسے ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہونے کا حکم اس لئے دیا تھا کہ اس کا جسم اس کے اور سورج کی روشنی کے درمیان حائل تھا۔ ارباب سیاست، مفکر اور فن کار خوشی سے ایسپشیا کا کلام سنتے تھے۔ اور دس ہزار طلبا دور دور سے پیرس میں ابی لارڈ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے آتے تھے۔ فلسفہ تب ایک بزدل کنواری بڑھیا نہ تھی۔ جو دنیا کے آلام سے خوف کھا کر کال کوٹھڑی میں پڑی رہتی۔ اس کی تابناک آنکھیں دن کی روشنی سے خائف نہ تھیں، وہ خطروں سے الجھتی اور انجانے سمندروں کے دور دراز سفر طے کرتی۔ اس زمانہ میں جبکہ اسے بادشاہوں کے درباروں تک رسائی میسر تھی، کیا وہ خود کو ان حدود میں محصور کر سکتی تھی جن میں وہ آج اسیر ہے؟ کبھی وہ ایک رنگین روشنی تھی جو حساس ترین روحوں کو حرارت اور نور سے لبریز کر دیتی تھی۔ آج وہ محدود علم اور تدریسی نظاموں کی ایک حقیر حاشیہ بردار کی حیثیت رکھتی ہے۔ کبھی وہ عقل کی دنیا کی پر تفاخر ملکہ تھی اور بلند ترین انسان تہ دل سے اس کی خدمت کرتے تھے۔ لیکن آج اپنے حسن و قوت سے عاری وہ مفلسی کی حالت میں رہ گزر پر کھڑی ہے اور کوئی مفلس سے مفلس شخص بھی اسے محترم نہیں جانتا۔

آج ہمیں فلسفہ سے اس لئے محبت نہیں کہ اس میں بے باکی اور جرات رندانہ باقی نہیں رہی۔ سائنسوں کی اچانک یورش نے ایک ایک کر کے اس سے ساری اقلیمیں چھین لی ہیں۔ علم کائنات اب محض علم سیارہ اور علم ارض بن گیا ہے۔ فلسفہ قدرت اب حیاتیات اور علم الطبیعات تک محدود ہے۔ فلسفہ ذہن نے نفسیات کا روپ دھار لیا ہے۔ تمام اہم مسائل اس کے احاطہ قدرت سے باہر ہیں۔ وہ اب مادہ کی نوعیت اور قوت اور نشوونما کے اسرار پر غور نہیں کرتا۔ وہ "ارادہ" جس کی "آزادی" کے بارے میں اس نے سینکڑوں مرتبہ بحث و تمحیص کے اکھاڑے بنائے موجودہ زمانہ میں مشینوں کے بوجھ تلے کچلا گیا ہے۔ سیاست جس کے مسائل کبھی فلسفہ کے مسائل تھے، اب کم ظرف روحوں کی آماجگاہ ہے، وہ اب فلسفہ کی شمع ہدائت کو خاطر میں نہیں لاتی۔ اس کے قبضے میں اب صرف چند ویرانے ہیں۔

مابعد الطبیعات کے یخ بستہ اور سرد مہر مسائل، فلسفہ علم کی طفلانہ پہیلیاں اور

اخلاقیات کی بے جان بحثیں' جن کا انسانوں کی روزمرہ زندگی پر ذرا بھی اثر نہیں۔ لیکن یہ ویرانے بھی اس سے چمن جائیں گے۔ نئی سائنسیں اٹھیں گی اور اپنے ناپ تول کے نئے نئے اوزاروں کے ساتھ ان مملکتوں میں بھی داخل ہو جائیں گی' اور شاید دنیا یہ بھول جائے کہ فلسفہ کا بھی کبھی کوئی وجود تھا' اس نے کبھی دلوں کو گرمایا تھا اور ذہنوں کو روشنی دکھائی تھی۔

ماہرین فلسفہ علم

جس انداز سے فلسفیوں نے پچھلے دو سو سال میں فلسفہ لکھا ہے اس سے وہ بجا طور پر بے حرمتی اور گمنامی کا مستحق بنا ہے۔ بیکن اور سپینوزا کی وفات کے بعد فلسفہ کی کیا حیثیت رہ گئی ہے؟ یہ فلسفہ زیادہ تر فلسفہ علم پر مشتمل ہے۔ اس فلسفہ علم کی نوعیت خارجی دنیا کے وجود کے بارے میں ایک متصوفانہ اور ناقابل فہم دار و گیر کے سوا کچھ بھی نہیں۔ وہ ذہانت جو فلسفیوں کو مملکتیں عطا کرتی تھی اس استدلال میں الجھ کر رہ گئی ہے کہ آیا سیارے' سمندر اور دوسرے انسان اس وقت بھی موجود تھے جب وہ نظر نہیں آتے تھے۔ ڈھائی سو سال سے یہ آنکھ مچولی جاری ہے' جس سے نہ فلسفہ کو کوئی فائدہ پہنچا ہے نہ زندگی کو' ناشر کی جیب البتہ گرم ہوئی ہے۔

اس صورت حال کی کسی قدر ذمہ داری ڈے کارٹ کے اس سادہ اور معصوم بیان پر عاید ہوتی ہے کہ "میں سوچتا ہوں اس لئے میں موجود ہوں۔" ڈے کارٹ کی خواہش تھی کہ وہ اپنے فلسفہ کی ابتدا کم سے کم مفروضات سے کرے۔ اس نے "باقاعدہ شک" کے اسلوب سے تمام تصورات حتیٰ کہ عیاں بالذات حقائق پر شک کی نظر ڈالی اور فقط اس ایک بیان کی اساس پر ایک مربوط فلسفہ کا نظام قائم کیا۔ فکر پر وجود کی اس طرح بنیاد رکھنا ایک نہایت خطرناک اقدام تھا۔ عقل مند لوگ یقیناً یہی نتیجہ نکالیں گے کہ اس اساس پر قائم کیا ہوا وجود محض چند پڑھے لکھے لوگوں کا حق ہے اور ستم ظریف لوگ اس کی بنا پر ایک پوری صنف (عورت) کو نہ صرف روح سے بلکہ حقیقت سے محروم کر دیں گے۔

لیکن اس بیان سے سب سے بڑا نقصان فلسفہ کو پہنچا' کیونکہ فقط ایک آدمی کے سوچنے کی صلاحیت پر دنیا کی حقیقت کی بنیاد رکھنے سے اتنی مشکلات پیدا ہوئیں کہ فلسفیوں کی دس نسلوں نے اپنی ساری قوت فکر انہیں سلجھانے پر صرف کر دی ہے۔ ڈے کارٹ کی "انا" یا "خودی" ایک روحانی اور غیر مادی حقیقت تھی۔ اب ایک مادی وجود دوسرے مادی وجود

سے تعلق کے باعث ہی حرکت کر سکتا ہے' لیکن ایک غیر مادی روح ایک سالماتی جوہر پر کیونکر اثر انداز ہو سکتی ہے؟ اس مشکل سے مادیت' عینیت اور متوازیت کے فلسفے پیدا ہوئے۔ متوازیت کے پیرو یہ کہتے تھے کہ اگر ذہن اور دماغ اس قدر مختلف ہیں کہ ان میں سے ایک دوسرے پہ اثر انداز نہیں ہو سکتا' تو وہ ایک دوسرے کو متاثر کیے بغیر ایک دوسرے کے متوازی ہیں۔ مادہ پرستوں کا بیان تھا کہ چونکہ ذہن یقیناً مادہ پر اثر انداز ہوتا ہے' اس لئے اس کا جوہر بھی مادہ ہو گا۔ عینیت پسند فلسفی یہ استدلال کرتے تھے کہ چونکہ فکر کی حقیقت یقینی طور پر عیاں بالذات ہے' اور تمام موجودات اس حد تک حقیقی ہیں جس حد تک ان کا مشاہدہ ہو سکتا ہے' اس لئے مادہ فقط خیالات اور مشاہدات کا ایک مجموعہ ہے۔

اور اس طرح ایک مزے کی جنگ چھڑ گئی۔ اور اب صرف جنگ باقی رہ گئی ہے۔ اس کی لذت غائب ہو گئی۔ کہیں کہیں فلسفہ علم کا ایک ایسا ماہر بھی نظر آتا ہے جس کے چہرہ پر تبسم کھیلتا ہے۔ مثلاً بریڈلے اور ولیم جیمز۔ کبھی کبھی ڈیوڈ ہیوم کی طرح ایک مفکر علم ایسا بھی پیدا ہوتا ہے' جو جانتا ہے کہ اس کا فلسفہ محض ایک کھیل ہے اور اسے شاطرانہ درایت سے کھیلتا ہے۔ لیکن ان کے علاوہ باقی سب سنجیدگی میں مبتلا ہیں۔ جان لاک سے لے کر روڈولف آوکن تک سب کے چہرے تنے ہوئے ہیں اور ہر نسل کے ساتھ ان کا تناؤ بڑھتا جاتا ہے' ان کی اداسی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے تاکہ اپنے اداس فلسفہ کی آبرو قائم رکھیں۔ بشپ بارکلے نے اعلان کیا کہ وہ چیز وجود نہیں رکھتی جس کا مشاہدہ نہ کیا جائے۔ خواہ یہ مشاہدہ خدا کرے یا انسان۔ اور جہاں تک ہمیں معلوم ہے بشپ کے ہونٹوں پر تبسم کی لہریں کبھی نمودار نہیں ہوئیں۔ حالانکہ آئرلینڈ کے ایک ایسے ذہین فرزند سے یہ مسلسل متانت کسی قدر بعید ہے۔

یہ بات یقیناً درست اور اس قدر واضح ہے کہ اس کا ذکر بے سود ہے' کہ کسی ذہن کے لئے وہی چیزیں حقیقت رکھتی ہیں جن کا وہ مشاہدہ کرتا ہے اور کسی چیز کی کوئی حقیقت نہیں۔ لیکن اس بات میں اور اس بیان میں زمین آسمان کا فرق ہے کہ کوئی چیز وجود نہیں رکھتی جب تک اس کا مشاہدہ نہ کیا جائے۔ بارکلے نے ان دو باتوں کو الجھا دیا تھا' اور یہ الجھاؤ ان فلسفیوں کے لئے لازمی تھا جو ہولباخ۔ مولشاٹ اور بخنر کی بے رنگ مادیت سے سہمے رہتے تھے۔ بارکلے کی یہ کوشش بہت شاندار تھی کہ اس نے ایک ہی چالاک وار سے یہ ثابت کر دیا کہ مادہ کا وجود ہی نہیں ہے اور اس طرح مادیت سے نجات پائی۔ یہ منطق کی شاندار فتح تھی' لیکن فلسفہ کے طالب علموں کے لئے یہ سبق مضمر ہے کہ وہ دونوں آنکھیں

عمل رہا ہے کسی فلسفی نے ظاہر نہیں کیا کہ یہ کوشش کس قدر پر فریب تھی۔ ایف ایچ بریڈلے بھی اس قسم کے غیر مبہم فریب سے پہنچنا چاہتا تھا۔ اناطول فرانس نے کہا ہے کہ جھوٹ اور ادب انسان اور حیوان میں تمیز پیدا کرتا ہے۔ اب غور طلب بات یہ ہے کہ اس قسم کا مبنی فلسفہ کس حد تک ادب کے زمرہ میں آ سکتا ہے؟

اس کا یہ مطلب نہیں کہ فلسفہ علم کے متعلق کوئی مسائل ہی نہیں۔ اللہ جانتا ہے کہ مسائل ہیں اور بے شمار ہیں۔ جیسا کہ شاید ہمارے مشاہدے میں بھی آئے۔ لیکن شاہد و مشہود اور عالم و معلوم کا تعلق، زمان و مکان کی معروضی یا اعتباری حیثیت، یہ تمام مسئلے نفسیات کا موضوع ہیں۔ اور انہیں متواتر مشاہدہ اور تجربہ کی مدد ہی سے حل کیا جا سکتا ہے۔ یہ استحالہ کے مسائل یا کھانے کے ہضم ہونے والے گوشت کے کیمیاوی تجزیہ کی طرح فلسفہ کے مسائل نہیں ہیں۔ اگر یہ مسائل فلسفہ کے مسائل ہیں تو دنیا کے تمام مسائل فلسفیانہ مسائل ہیں۔ یہ ایک المناک حادثہ ہے کہ جدید فلسفیانہ خیالات کی شاندار تمثیل کے ایک اداکار نے تقریباً ہر کردار نبھانے اور ہر فقرہ ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔

عالمان دین

یہ مفروضہ بھی اسی قدر مضر ہے کہ فلسفہ کا کام سائنٹیفک طرز فکر کا تجزیہ کرنا ہے اس مفروضہ میں بھی آرزو چوری چھپے خیال کو جنم دیتی ہے۔ جب مادہ کے وجود کی دلائل سے تردید نہ ہو سکی تو بے چارے پروفیسروں نے سائنس کو ناقابل اعتبار ثابت کرنے کی ٹھان لی۔ ماخ، پیئرسن اور پوان کارے نے اعتراف کیا کہ سائنس کے قوانین قدرت کی عادتوں کے مختصر بیانات ہیں (وہ قدرت جس کا مکمل مشاہدہ کبھی نہیں ہو سکتا) اور یہ قوانین کبھی بھی زیادہ وسیع مشاہدہ کی بنا پر غلط یا نامکمل ثابت کئے جا سکتے ہیں۔ ان عاجزانہ اعترافات میں بعض فلسفیوں نے عقل کو ناقص ثابت کرنے کا شاندار موقع سمجھا۔ کیونکہ سائنس ہمیں کوئی یقینی علم نہیں دے سکتی، بلکہ محض قیاسی علم دے سکتی ہے، اس لئے ہم مذہب کے عجائب خانہ سے وہ تمام طفلانہ عقاید نکال کر نئی نسل کے ہاتھوں یہ کہہ کر بیچ سکتے ہیں کہ یہ محض معمولی طور پر کرم خوردہ ہیں۔ چاروں طرف سے مہذب بزرگ اٹھے اور انہوں نے ریاضی کے تمام متین اصولوں زمان و مکان کے عدد و پیمائش، کیف و کم کے تصورات کا معائنہ کیا اور نہایت عالمانہ طمطراق سے یہ نتیجہ نکالا کہ انسانی ذہن میں غیر معقول عقائد کی بہت گنجائش ہے۔

اس نامناسب چالاکی کے بعد اگر کوئی دیانت دار انسان فلسفہ سے بدگمان ہو جائے تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اس تمام منطق سے کیا فائدہ' اگر اس کا تمام استدلال ہماری پوشیدہ آرزوؤں کی تسلین کا بہانہ ہو۔ بریڈلے نے کہا تھا کہ مابعدالطبیعات' ایک ایسا علم ہے' جس میں ہم اپنے جبلی عقائد کے لئے کمزور دلائل تلاش کرتے ہیں۔ لیکن ان دلائل کو تلاش کرنا بھی ہماری ایک جبلی آرزو ہے کبھی کبھی یہ علم دوسروں کو کسی بات کا یقین دلانے کے لئے کمزور دلائل تلاش کرنے کی کوشش بھی بن جاتا ہے۔ والٹیئر میں یہ اخلاقی جرات تھی کہ اس نے کہا' "میں جانتا ہوں کہ میری خادمہ اور میرا خانساماں اپنے ماحول کے قدیمی عقاید پر قائم ہیں۔ اس سے یہ امکان کسی قدر کم ہو جاتا ہے کہ وہ میرے گھر سے زیورات چرائیں گے یا میرے کھانے میں زہر ملا دیں گے۔" وہٹ مین نے کہا کہ کوئی فلسفیانہ عقیدہ ایک ایسے بنیادی زاویہ نگاہ کے لئے جواز کی حیثیت رکھتا ہے جو کہ ہمارے بچپن میں بن چکا ہوتا ہے۔ دیانت دار نطشے نے لکھا تھا کہ "فلسفی اکثر ایسا ظاہر کرتے ہیں کہ ان کے خیالات ایک بے لاگ۔ پاک اور غیر متعصب منطق کا نتیجہ ہوتے ہیں' حالانکہ دراصل وہ کسی خیال یا نظریہ کی جو کہ ان کی کسی دلی خواہش کا منطقی عکس ہوتا ہے' دلائل کے ذریعہ حمایت کرتے ہیں۔"

یہ ہیں وہ خامیاں جنہوں نے فلسفہ کو داغ دار بنایا ہے۔ حق کی جستجو ہی نے حق کو بے آبرو کیا ہے۔ اس طرح فلسفہ ہنگامی عقیدوں کا غلام بن جاتا ہے اور اس میں وہ عالمانہ اخلاق' حقیقت کے لئے وہ جانفشاں احترام نظریہ کے خلاف واقعات کی طرف وہ توجہ نظر نہیں آتی جو ہمبولٹ اور ڈارون جیسے سائنسدانوں۔ لیونارڈو یا گوئٹے جیسے "ادبی" فلسفیوں کو ممتاز بناتی ہے۔ اہل مدرسہ (جنہیں غلطی سے فلسفی سمجھا جاتا تھا' اور جو دراصل علمائے دینیات تھے) اس طرز فکر کے بانی ہوئے کہ فلسفیانہ خیالات کی جستجو دینی تصورات کی تبلیغ کے معاملہ میں ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کی کتابیں دراصل اس جہاد کا حصہ تھیں جو کہ پاپائے روم نے کفر اور شرک کے خلاف شروع کر رکھا تھا۔ وہ بے باکانہ کہتے تھے کہ فلسفہ دینیات کا غلام ہے۔ اور اگرچہ جدید فلسفہ کے بانیوں یعنی بیکن۔ ڈے کارٹ اور سپینوزا نے فلسفہ کی اس بے آبروئی کے خلاف احتجاج کیا تھا' لیکن آج ان کے پوتوں اور نواسوں نے اس پرانے رواج کے آگے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔

ان چیزوں نے فلسفہ کو گھن لگایا اور اس گھن سے فلسفہ میں وہ دوسری خامیاں پیدا ہوئیں جن کی تعداد ایک موروثی مرض کی طرح بڑھتی جاتی ہے۔ فلسفہ کی گمنامی کی وجہ اس

کی بددیانتی کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے؟ یہ بجا ہے کہ جدید فکر کی گمنامی کی ایک وجہ تو فقدان اور عالمگیر تصورات کی دقت بھی ہے لیکن یہ مشکلیں ایسی نہیں جن کے باعث انسان فلسفہ میں دلچسپی ہی نہ لے۔ شیلے کے خیالات سمجھنا آسان نہیں لیکن سب اس کا احترام کرتے ہیں۔ عورت ایک معمہ ہے، لیکن کون مرد، جس کی رگوں میں زندگی دوڑتی ہے اس معمہ کو سمجھنے کی دائمی کوشش میں مبتلا نہیں رہتا۔ نہیں جدید فلسفہ کی تاریکی کی وجہ اور ہی کچھ ہے۔ جب آدمی رومان کے راستے پر گامزن ہو تو اسے سمجھنا زیادہ مشکل ہے۔ یہ مقابلہ اس وقت کے جب کہ وہ سچ بول رہا ہو۔ ہر حقیقت پر ہزاروں واہمے استوار ہو سکتے ہیں۔ اور کوئی ہنرمند ہی اپنے تخیل کی پرواز کو حقیقت کی طرح مربوط بنا سکتا ہے۔ لیکن اہل تخیل کبھی مفکر بنا نہیں چاہتے۔ ان کے جوہروں کی حاجت سیاست کو زیادہ ہے، اور بددیانتی فلسفہ ادبی افسانہ نگاروں کے حصہ میں آتا ہے۔ جن کے افسانے حقیقت کے ایک لمس سے ہی پارہ پارہ ہو جاتے ہیں۔

درحقیقت دیانت کی کمی نے ہی جدید فکر کو کھوکھلا بنا دیا ہے۔ وہ شخص جسے اپنے نظریہ پر اعتماد نہیں، انسانی زندگی کے اہم مسائل سے گریز کرتا ہے۔ کسی وقت بھی زندگی کی وسیع و عریض تجربہ گاہ اس کے حقیر جھوٹ کو بے نقاب کر سکتی ہے۔ کسی وقت بھی وہ حقیقت کے سامنے برہنہ ہو کر لرزہ براندام ہو سکتا ہے۔ اس لئے وہ اپنے لئے ادق کتابوں اور فلسفیانہ مجلسوں کی پناہ گاہیں بناتا ہے۔ وہ فقط ان پارینہ اوراق کی صحبت میں عافیت محسوس کرتا ہے اور اپنی گھریلو زندگی کے حقائق میں بھی کوئی آسودگی نہیں پاتا۔ وہ اپنے زمان و مکان کے ان مسائل سے دور بھاگتا ہے جو اس کی نسل کے لوگوں کو متاثر کرتے ہیں۔ وہ ان اہم مسائل سے خوف زدہ ہے جو فلسفہ کی جان ہیں۔ وہ باتوں میں ربط پیدا کرنے سے گھبراتا ہے۔ اور اپنے زمانہ کی زرخیز، بدنظمی کو وحدت اور تنظیم میں منسلک کرنے سے جی چراتا ہے۔ وہ ہراساں ہو کر ایک حقیر گوشہ میں چھپ جاتا ہے۔ اوراق الفاظ کی تہوں کے نیچے زندگی سے بے تعلقی ڈھونڈتا ہے۔ وہ مفکر نہیں رہتا۔ فلسفہ علم کا ماہر البتہ بن جاتا ہے۔

یونان کا یہ حال نہیں تھا۔ یونانی فلسفی مہارت کم اور سوجھ بوجھ زیادہ رکھتے تھے۔ پارمنائیڈیس نے بھی علم کے مسائل پر غور کیا تھا۔ لیکن سقراط سے پہلے فلسفیوں کی نگاہیں اس دنیا کے حقائق پر تھیں۔ اور وہ مباحثہ سے نہیں بلکہ مشاہدہ اور تجربہ سے حقیقت کے راز دریافت کرتے تھے۔ ذرا سوچو کہ وہ قہقہے لگانے والا فلسفی ڈیموکریٹس، ان لوگوں کے

لئے ایک خطرناک مصاحب نہ ثابت ہو گا۔ جو خارجی دنیا کے مسائل کو اسی طرح حل کرتے ہیں' جس طرح فیلسوف اس مسئلہ کو سلجھاتے تھے کہ سوئی کے ناکے پر کتنے فرشتے ناچ سکتے ہیں۔ ذرا تھیلس کا تصور کرو جس نے اس الزام کی تردید میں کہ فلسفی بے وقوف ہوتے ہیں تجارت کی منڈی پر قبضہ کر لیا تھا۔ اور ایک سال کے اندر خاصی دولت سمیٹ لی تھی۔ انکساگورس نے جسے یونان کا ذہن کہنا چاہئے' فارقلیس کو ایک کھلنڈرے سیاست دان سے ایک مفکر اور ایک صاحب نظر سیاستدان میں تبدیل کر دیا تھا۔ اس بڈھے سقراط کا تصور کرو جو شمس و نجوم سے بے خوف ہو کر زندہ دلی سے یونان کے نوجوانوں کے اخلاق بگاڑتا تھا اور حکومتوں کی بنیادیں ہلا دیتا تھا۔ وہ آج کل کے بے جان اور بے ہمت فیلسوفوں کو کس نظر سے دیکھتا جو ملکۂ علوم کے دربار میں رکوع ادب بجا لاتے ہیں۔ افلاطون اور اس سے پہلے کے جواں مرد مفکروں کے لئے فلسفہ ہم صحبت کے ابتدائی مراحل کی طرح فلسفہ کا زینہ ہے۔ یہ چند لمحوں کے لئے خوش گوار ہوتا ہے۔ لیکن اس تحقیق کمال سے بہت دور ہے' جو فلسفہ کے شیدائیوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ ہمیں ہمیں اپنے چھوٹے مکالموں میں افلاطون مشاہدہ فکر اور علم کے مسائل سے عشاق کی طرح کھیلتا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اپنے شدید لمحوں میں اس کی نظر وسیع میدانوں کا احاطہ کرتی دکھائی دیتی ہے۔ وہ اپنے لئے مثالی ریاستیں تعمیر کرتا تھا۔ اور انسان کی فطرت اور تقدیر پر غور کرتا تھا۔ ارسطو کے ہاں بھی ہمیں فلسفہ کی بے پناہ وسعت اور شکوہ کی تعظیم نظر آتی ہے۔ اس نے فلسفہ کے تمام محاذات کی سیر کی تھی اور نہایت خوش سلیقگی سے انہیں آراستہ کیا تھا۔ ارسطو کے ہاں ہر مسئلہ کو اپنا صحیح مقام حاصل ہے اور ہر سائنس نے عقل کی بارگاہ میں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ یہ لوگ جانتے تھے کہ فلسفہ کا کام یہ نہیں کہ وہ اپنے آپ کو تجزیہ علم کے تاریک گوشوں میں دفن کر دے۔ اس کا فریضہ تو یہ ہے کہ وہ ہر مملکت علم میں بے باکانہ داخل ہو اور مختلف علوم کے نتائج کو انسانی شخصیت اور انسانی زندگی کی ترتیب و تدوین کے لئے مربوط کرے۔ وہ یہ جانتے تھے کہ فلسفہ کا کام یہ نہیں کہ وہ چند آسمانی معموں کو حل کرے۔ جن کا انسانی امور سے کوئی تعلق نہیں۔ فلسفہ کا اہم ترین مسئلہ اس غیر محدود اور وسیع کائنات میں انسان کے مقام اور اس کے ارتقائی امکانات کی کھوج کرنا ہے۔

سائنس دان

یہ تو رہیں وہ باتیں جو فلسفہ نہیں ہیں اور ان کا شمار فلسفہ میں ہونا بھی نہیں چاہئے۔

دیکھنا یہ ہے کہ فلسفہ کیا ہے۔ اور اسے کیا ہونا چاہیے؟ کیا ہم ملکہ علوم کو اس کی پہلی وسعت اور قوت دوبارہ واپس دلا سکتے ہیں؟ کیا ہم فلسفہ کو دوبارہ وہ مربوط علم تصور دے سکتے ہیں جو زندگی کو بھی مربوط کر سکتا ہے؟ کیا ہم فلسفہ کا کوئی ایسا تصور پیش کر سکتے ہیں جو فلسفہ کے شیدائیوں کو پہلے اپنے آپ پر اور پھر ایک مملکت پر حکومت کرنے کا اہل بنا سکے اور ایسی صفات کا حامل بنا سکے، جو فلسفی حکمرانوں میں ہوتی ہیں۔

مدت گزری میں نے فلسفہ کی تعریف یوں کی تھی کہ وہ کل تجربہ کا مطالعہ ہے یا تجربہ کے ایک جزو کے کل سے تعلق کا۔ اس تعریف سے یہ فوراً ظاہر ہو جاتا ہے کہ ہر مسئلہ فلسفہ کا موضوع بن سکتا ہے، بشرطیکہ اسے کل کے زاویہ نظر اور سارے انسانی تجربے اور انسانی مقاصد کی روشنی میں دیکھا جائے۔ ایک فلسفیانہ ذہن کا طغرائے امتیاز فکر کی چابک دستی نہیں بلکہ نظر کی وسعت اور فکر کی وحدت ہے۔ سپینوزا کے دوامی نقطہ نظر کی بجائے ہم کل کا نقطہ نظر اختیار کریں گے۔ یہ دونوں نقطہ ہائے نظر ایک ہی نتیجہ پر مرکوز ہوتے ہیں۔ جس طرح نگاہیں ایک مرکز پر مل جاتی ہیں۔ مگر جہاں انسان اپنے تجربہ کو ایک منظم وحدت میں منسلک کر سکتا ہے۔ موجودات کو دوامی نقطہ نظر سے دیکھنا' لافانی دیوتاؤں کا ہی کام ہے، جن کا غالباً" وجود نہیں۔

سائنس اور فلسفہ کے تعلق کی مزید وضاحت کی ضرورت نہیں۔ سائنس تو ایک دریچہ ہے، جس میں سے فلسفہ دنیا کو دیکھتا ہے۔ سائنس حواس اور فلسفہ روح ہے۔ فلسفہ کے بغیر سائنس کا علم دیوانے کے احساسات کی طرح منتشر ہے۔ سپنسر نے ٹھیک کہا تھا کہ فلسفہ عمومی علم ہے۔ لیکن اس نے یہ غلط کہا تھا کہ فلسفہ محض علم ہے۔ فلسفہ کے لئے اس وقت پسند اور ارفع نظر کی ضرورت ہے جس سے علم برگزیدہ ہو کر خواہشات کی بد نظمی میں تنظیم اور وحدت پیدا کرتا ہے۔ فلسفہ وہ مختص صفت ہے، جسے حکمت کہا جاتا ہے۔

سائنس کے بغیر فلسفہ بے جان ہے۔ کیونکہ حکمت محنت سے حاصل کئے ہوئے علم، بے غرض اور غیر متعصب اذہان کے دیانت دارانہ مشاہدہ اور تحقیق کے بغیر ہرگز پھل پھول نہیں سکتی۔ سائنس کے بغیر فلسفہ انحطاط پذیر اور بددیانت ہو جاتا ہے۔ لیکن سائنس فلسفہ کے بغیر نہ صرف لاچار ہو جاتی ہے بلکہ تخریبی انداز اختیار کر لیتی ہے۔ سائنس محض بیان ہے، وہ جو کچھ دیکھتی ہے، کہتی ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ حقیقت کا بغور مشاہدہ کرے اور اسے انسانی مقاصد سے قطع نظر جوں کا توں بیان کر دے۔ نائیٹرو گلیسرین اور کلورین دو گیسیں ہیں۔ سائنس کا کام یہ ہے کہ ان کا تجزیہ کرے اور بتائے کہ یہ کن کن اجزا سے

مرکب ہیں اور ان کے خواص کیا ہیں؟ یہ بھرے شہروں کو تباہ کر سکتی ہیں۔ یہ انسانی فنون کے بہترین صنم خانوں کو برباد کر سکتی ہیں۔ یہ ایک پوری تہذیب اور اس کے حسن و حکمت کا نام و نشان مٹا سکتی ہیں۔ سائنس ہمیں بتائے گی کہ یہ تخریبی کام کس طرح جلدی سے ہو سکتے ہیں۔ کہ شہری کو (اگر وہ زندہ رہے تو) اس کا کم سے کم بار اٹھانا پڑے۔ لیکن کیا تہذیبوں کو مٹا دینا چاہئے؟ کون سی سائنس اس سوال کا جواب دے سکتی ہے؟ زندگی جلب منفعت اور جنون ملکیت سے خوشگوار بنتی ہے یا تخلیق و تعمیر سے؟ کیا علم اور منفعت کی جستجو مشاہدہ حسن کی ہنگامی سرمستی سے بہتر ہے؟ کیا ہمیں اپنی اخلاقی زندگی سے تمام ایمانی عقاید کو ختم کر دینا چاہئے؟ کیا ہمیں ذہن کو مادہ کے یا مادہ کو ذہن کے نقطہ نظر سے جانچنا چاہئے؟ کون سی سائنس ان مسائل کو حل کرے گی؟ زندگی کے یہ بنیادی مسائل مربوط تجربہ اور اس حکمت کے بغیر کیونکر حل ہو سکتے ہیں جس کے سامنے علم محض ایک ہیولٰی ہے؟ اور جس کی نگاہ کامل میں تمام علوم کو اپنا صحیح مقام اور اپنی صحیح اہمیت حاصل ہے۔

سائنس اجزا کا بیان ہے۔ فلسفہ کل یا کسی جزو کے کل سے تعلق کی ایسی تعبیر ہے جس سے جزو کا مقام واضح ہو۔ سائنس ذرائع اور وسائل کی بزم ہے۔ فلسفہ مقاصد اور مناصب کی محفل۔ حقائق اور قوانین مقاصد ہی کے ذریعے قدر و اہمیت حاصل کرتے ہیں۔ انسانی آرزوئیں کسی مرکز پہ لائی جائیں اور وہ صحت مند شخصیت کے منظم اجزا بن جائیں، یہ کام بھی فلسفہ کا ہے اور اس کے بلند ترین مقاصد میں سے ایک مقصد ہے۔

فلسفہ کی فطرت اپنی نوعیت کے اعتبار سے سائنس سے کہیں زیادہ مفروضات اور شرائط پر مبنی ہے۔ سائنس کی ابتدا بھی شرطیہ بیانوں سے ہوتی ہے۔ اس کی انتہا اس قابل مشاہدہ علم پر ہونی چاہئے جو انسانی مفاد یا آرزو سے بے نیاز ہو۔ اس کے برعکس فلسفہ کی ابتدا سائنس اور قابل مشاہدہ علم سے ہوتی ہے اور وہ ان بنیادی مسائل کے متعلق جن کے بارے میں کوئی متعین حقائق میسر نہیں، وسیع مشروط بیانات ترتیب دیتا ہے۔ یہ شعور کی تخیلی تکمیل ہے۔ یہ ہمارے سائنٹیفک علم کی خامیوں کو ان مفروضوں سے پورا کرتا ہے جن کا ثبوت تجربہ کے ذریعے مہیا نہیں ہو سکتا۔ اس لحاظ سے ہر شخص فلسفی ہے ایک محتاط، متشکک، لاادری یا نظریہ کردار کا پیرو اس وقت بھی ایک طرح کا فلسفہ بیان کرتا ہے، جب وہ ساری دنیا کے سامنے "احتجاجا" یہ اعلان کرتا ہے کہ فلسفہ لایعنی ہے۔ اگر ایک لاادری اس مکمل غیر جانبدارانہ طریقہ سے زندگی بسر کر سکتا ہے کہ وہ خدا کی حقیقت کے اثبات و تردید سے گریز کرے۔ اگر وہ اپنے خیالات اور اعمال کو غیر جانبدارانہ طریقہ سے ایجاب و انکار

کے درمیان تقسیم کر دے تو وہ شاید فلسفہ پر ایک بے جان اور غیر متحرک نظام اخلاق' ایک فکری بے حسی' ایک کائناتی غنودگی طاری کر دے۔ مگر اس کیفیت کا حاصل کرنا مشکل بھی ہے اور انسانیت سے بعید بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم ایک راہ کو دوسری پر ترجیح دیتے ہیں۔ ہم اپنے انداز زندگی سے ایجاب و انکار کرتے ہیں۔ ہم اس طرح عمل کرتے ہیں کہ گویا ہم نے اس تذبذب میں سے ایک راہ اختیار کر لی ہے' جسے ہم فلسفہ کہتے ہیں' ہم نیوٹن کی طرح مشروط بیان پیش کرتے ہیں۔ حقیقت کی کشش ہمیں فلسفہ کی طرف لے جاتی ہے۔

کیا ہم یہ مان لیں کہ تاریخ فلسفہ' ایک فلسفہ کی دوسرے فلسفہ سے تردید کا نام ہے۔ اور یہ کہ فلسفی برادر کشی کے جنون میں مبتلا ہیں' اور جب تک وہ حقیقت کی قلمرو سے ہم حریف کو ختم نہ کر دیں' انہیں چین کی نیند نہیں آتی۔ وہ انسان جو زندگی کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا ہے' کیسے اس بات کے لئے وقت نکالے کہ ان عالمانہ تنازعوں کو حل کرسکے یا اس جنگ کو ختم کرے۔ کیا یہ فلسفے ایک دوسرے کو ختم نہیں کر دیتے؟ اس سلسلے میں عمر خیام کے تجربہ پر ایک نظر ڈال لیجئے :۔

یک چند بکودکی باستاد شدیم
یک چندز استادی خود شاد شدیم
پایان سخن شنو کہ مارا چہ رسید
از خاک در آمدیم بباد شدیم

بظاہر یہ فلسفہ کی تضحیک ہے۔ لیکن شاید عمر خیام نے یہ سب کچھ محض تفریحاً" کہا ہو۔ شاید وہ اس دروازہ سے باہر نہ نکلا ہو' جس سے وہ داخل ہوا تھا۔ اور شاید وہ مسجد کے دروازہ پر اپنے جوتوں کے ساتھ اپنی عقل بھی چھوڑ آیا تھا۔ کوئی شخص بھی عظیم مفکروں کی صحبت سے اپنے ذہن کو تربیت دیئے اور ہزاروں اہم مسائل پر اپنے خیالات وسیع کئے بغیر نہیں اٹھا۔ لیکن آخر وہ کیا چیز تھی جس نے عمر خیام کے بچپن کے مذہب کو حسن اور دخت رز کی عبادت میں تبدیل کر دیا تھا؟ عمر خیام کی شاعری کو فلسفہ کے علاوہ کون سی چیز عظمت دیتی ہے؟

سائنس کی تاریخ میں ہمیں ایسے عظیم انقلاب نظر آتے ہیں کہ ان کے سامنے ساری تبدیلیاں اس کی بنیادی یگانگت اور ہم آہنگی میں گم ہو جاتی ہیں۔ آج وہ سدیمی مفروضہ کون سے دور افتادہ سیارہ میں اڑ گیا ہے؟ کیا موجودہ علم الافلاک اسے خاطر میں لاتا ہے؟ کہاں

ہیں آج نیوٹن کے قوانین جب کہ آئن سٹائن اور منکوسکی اور دیگر برگزیدہ حضرات نے اپنی ناقابل فہم اضافیت سے ساری کائنات کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا ہے۔ جدید طبیعات کی بد نظمی میں مادہ کا ٹھوس پن اور بقائے توانائی کہاں رخصت ہو گئی؟ بے چارہ اقلیدس جو کہ درسی کتابوں کا سب سے بڑا مصنف تھا' آج کہاں ہے؟ جبکہ ریاضی کے ماہروں نے نئے نئے اختراعات سے ایسی لامحدود کائناتیں تخلیق کر لی ہیں کہ ان میں سے ایک دوسرے کا حصہ بن سکتی ہے اور جب وہ یہ ثابت کر رہے ہیں کہ سیاست کی طرح طبیعات میں بھی خط مستقیم دو نقطوں کے درمیان طویل ترین فاصلہ ہے؟ آج علم الارث کہاں ہے جبکہ ورثہ کی جگہ بچپن کی تربیت نے لے لی ہے؟ آج مینڈل کہاں ہے جبکہ ماہرین علم الارض اکائی خصوصیات کو نہیں مانتے؟ وہ شریف الطبع تخریب نواز ڈارون کہاں ہے جبکہ ارتقا کی بے وجہ تبدیلیوں کو اچانک نئی خصوصیات پیدا ہونے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور کیا یہ نئی خصوصیت "دوغلوں" کے ناجائز بچے ہیں؟ یا کیا ہمیں ان کی توجیہ کے لئے اس نظریہ کی طرف لوٹنا پڑے گا کہ ایک نسل تربیت سے حاصل کردہ صفات دوسری نسل کی وراثت میں دیتی ہے۔ کیا ہم پھر ایک صدی پیچھے لوٹیں اور لیمارک کے زراف کی گردن میں باہیں ڈال دیں۔ پروفیسر ونڈٹ کی وسیع و عریض تجربہ گاہ اور سٹینلے ہال کے سوالات کی فہرستوں کو آج ہم کیا کریں' جبکہ کوئی نظریہ کردار کا پیرو اپنے پیش رووں کے خیالات کو فضائے آسمان میں بکھیرے بغیر جدید نفسیات کا ایک صفحہ بھی نہیں لکھ سکتا؟ تاریخ کی وہ نئی سائنس کہاں ہے جبکہ ہر ماہر مصریات نسلوں اور تاریخوں کا اپنا علیحدہ زینہ بناتا ہے۔ جو کہ ایک دوسرے سے چند ہزار سال دور ہوتا ہے۔ آج ہر اچھا ماہر انسانیات ٹائیلر ---- ویسٹر مارک اور سپنسر کا مذاق اڑاتا ہے۔ اور آج فریزر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ قدیم مذاہب کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا۔ ہماری سائنس ہمیں کہاں لئے جا رہی ہے؟ کیا اس نے اچانک اپنی دائمی حقانیت کھو دی ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ قدرت کے قوانین بھی انسان کے مشروط بیان ہوں؟ کیا اب سائنس میں کوئی استحکام اور یقین نہیں رہا؟

شاید اگر ہم روح اور ذہن کا امن تلاش کریں تو ہمیں وہ سائنس میں نہیں فلسفہ میں ملے گا۔ فلسفیوں کے اختلاف' خیالات کے بنیادی اختلاف کی بجائے ان کے زمانوں کے انداز بیان کے اختلاف کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فلسفیوں کے اکثر اختلاف سائنس کے اپنے تلون کی وجہ سے ہیں۔ کیونکہ سائنس کچھ عرصہ کے لئے ایک مفروضہ کو سینہ سے لگاتی ہے' پھر اس کا جی بھر جاتا ہے اور بیزار ہو کر کسی اور نئے نظریہ کی

طرف رخ کرتی ہے۔ جب کاموں کے اندر ہی کو اس کی اصلی حیثیت میں دیکھا جائے تو ہمیں انسانی زندگی کے اہم مسائل کے بارے میں اس میں ایک عظیم دلچسپی اور ہمہ گیرت نظر آتی ہے۔ ... اندازہ ... ہوتا ہے کہ کچھ ... سے فلسفہ میں کوئی اضافہ نہیں کرتا بلکہ اس فلسفہ کا اطلاق آج کل کے حالات پر کرتا ہے۔ یا کوئی ... حیاتیات، ماہر طبیعات یا ماہر ریاضی کی قدیم یونانی سائنس دانوں کے متعلق یہ کہہ سکتا ہے آج کی سائنس پر قدیم ارسطو کی سائنس کا اطلاق ... لیکن ... فلسفہ اس وقت بھی عمیق اور نظر افروز ہے کہ آج کے دانشور آج کی سائنس کو عقلیت اور ... کی نظر سے دیکھے گا۔

سائنسوں کی ملکہ

اس بحث و تمحیص کے بعد ہم اب شاید یہ محسوس کریں کہ فلسفہ ابھی تک ملکہ علوم ہے۔ آج بھی لوگ اسے ملکہ علوم سمجھنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ فلسفہ اپنے آپ کو قدیم شان و شکوہ میں ملبوس کرتا ہے اور تمام علوم کو اپنے دائرہ شفقت میں لے لیتا ہے۔ تمام عالم اس کا موضوع ہے اور ساری کائنات اس کا خاص مضمون۔ اور جس طرح ایک بادشاہ یا ملکہ اپنی مملکت کے مختلف حصوں کو مختلف گورنروں کے سپرد کرتی ہے اور وہ گورنر اپنے ماتحت کارندوں کے ذریعے امور مملکت اور ان کی تفصیل طے کرتے ہیں اور پھر گورنر اور حاکم اعلیٰ مل کر ان معلومات کو منظم کرتے اور نئے منصوبوں کی تدوین کرتے ہیں اسی طرح فلسفہ بھی اپنی مملکت کو بہت سے صوبوں میں تقسیم کرتا ہے اور اس وقت تک ہم ہزاروں محل ہیں۔

اس مملکت کا پہلا صوبہ جسے فلسفہ کا دروازہ کہنا چاہئے منطق کے غیر شاعرانہ نام سے موسوم ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ فلسفہ اپنے حسن کو اجنبی نگاہوں سے پوشیدہ رکھتا ہے اور اپنے تمام چاہنے والوں کو اس آزمائش میں سے گزارنا چاہتا ہے تاکہ وہ اس کی محفل سے سرشار ہونے کے مستحق بن جائیں کیونکہ فلسفہ کی لذتیں محبت کے کمال کی مانند ہیں جہاں تک ادنیٰ روح کو باریابی حاصل نہیں۔ ہم حقیقت کو دیکھ کر یوں پوچھتے ہیں کہ ہم نے ان آزمائشوں اور امتحانوں پر غور نہ کیا ہو جن کے ذریعے ہمیں اس کے اصلی وجود کا ثبوت مل سکتا ہے۔ ہم پالٹ کے لرزہ انگیز سوال کا جواب یوں دے سکتے ہیں کہ ... اس کے جواب کے لئے اپنی بے بال اور ضعیف عقل اپ عمیق اور تاریک ...

اپنے حواس کے بے نظم فیصلہ کی مدد لیں، ہم کس طرح اپنے حواس اور اپنے خیالات کو تعصبات اور قدیم اصنام کی پرستش سے آزاد کریں، تاکہ عقل کے چراغ روشن رہیں اور ہم ہر ہنگامی حقیقت کو اپنے ہاں ایک متعین مقام دے کر اس کا خیر مقدم کریں۔ ہم کس طرح کھلاڑیوں کی طرح حکمت کی طلب اور جستجو کے لئے اپنی تربیت کریں؟

اور پھر اس مملکت کے مرکز سے کہیں دور آزمائش کا ایک اور مقام ہے، جہاں فلسفہ علم کا اژدہا رہتا ہے۔ اگر ہمارے قدم منطق کی دشوار راہوں پر لڑکھڑائے تھے تو اس مقام کی تاریکی میں ہماری آنکھیں بے نور ہو جائیں گی، ہم بہت سی دلدلوں میں پھنسیں گے اور شاید ہم اژدہے کے منہ کے بہت قریب جا پہنچیں اور اس کے پر اجلال کلام سے اس قدر مسحور ہو جائیں کہ ہمیشہ کے لئے اس کے خلاؤں میں محبوس ہو کر "فیلسوف" بن جائیں۔ لیکن ہمیں اس آزمائش میں سے بہرحال گزرنا ہے۔ اور علم و مشاہدے کی دنیا کی حقیقت کے معمہ کو کسی جائز طریقہ سے حل کرنا ہے۔ اس طرح شاید ہم ملکہ عظمیٰ کی بارگاہ میں رسائی حاصل کر سکیں۔

مابعد الطبیعات ایک عظیم الشان مگر تاریک صوبہ ہے۔ یہ ہماری اپنی روشنی سے روشن ہوتا ہے اور اس میں ہماری روح کے لئے بیش بہا خزانے موجود ہیں۔ یہاں کائنات کی فطرت مستور ہے اور ہمیں اپنے رموز سے پریشان کرتی ہے۔ یہاں فلسفہ کا وہ اعلیٰ نغمہ سنائی دیتا ہے جو اس نے فیثاغورث کو سنایا تھا۔ کیونکہ اس کے ذریعے فطرت شعور حاصل کرتی ہے اور اپنے مقاصد پر تنقید و تبصرہ سے مطالب و معانی پاتی ہے۔ یہاں ہم مادے اور زندگی، دماغ اور ذہن مادیت اور روحانیت میکا نکیت اور مقصدیت، جبریت اور حریت کے مسائل پر سر دھنتے ہیں۔ انسان کیا ہے؟ کیا وہ تاروں، پرزوں اور الجھے ہوئے پہیوں کی بنی ہوئی کوئی چیز ہے۔ جسے آسمان اور زمین کی قوتیں حرکت میں لاتی ہیں؟ یا وہ اپنی حقیر اور مضحکہ خیز حیثیت میں بھی ایک تخلیقی دیوتا ہے؟ ایک اور صوبہ "تاریخ" کے نام سے مشہور ہے، جہاں لاکھوں، کروڑوں عوام اور چند برگزیدہ ہستیاں دور دراز ممالک اور بعید زمانوں سے اپنی داستانیں لاتے ہیں، تاکہ ہم ان میں ربط پیدا کر کے ان سے سبق سیکھیں۔ ماضی کا کیا مطلب ہے؟ کیا ترقی و تنزل کے بھی قوانین ہیں، جن کی رو سے ہم تہذیبوں، نسلوں اور قوموں کے نشیب و فراز کو سمجھ سکیں۔ یہاں ہم موشکو اور بکل کو انسانوں کے نشوونما پر جغرافیائی حالات کے اثر کے متعلق تقریریں کرتے سنیں گے۔ یہاں کونڈور سے جواب جاں بلب ہے، موت کے کرب کو ترقی اور انسانی کمال کے لامحدود امکانات کے تصور

سے بہلاتا نظر آئے گا۔ یہاں ہیگل اپنی جدلیاتی بساط بچھاتا اور کارلائل اپنی عظیم الشان شخصیتوں کا ذکر کرتا دکھائی دے گا۔ یہاں نسل پرست لوگ اپنی نسل کی پاکیزگی اور برتری کے گیت گاتے اور وحشیوں کے ظہور کا رونا روتے سنائی دیں گے۔ یہاں مارکس اپنے اقتصادی نظریہ تاریخ کے ثبوت میں اعداد و شمار اور دلائل کے طوفان اٹھائے گا' اور یہاں غالباً" ہمیں ایک دو صاحب ذوق ایسے بھی ملیں گے جو ان دیوانوں کو یہ بتائیں گے کہ ان کی توجیہات حقیقت کے فقط چند پہلو ہیں' حقیقت نہیں۔ اور فطرت اور تاریخ میں اس سے کہیں زیادہ تنوع موجود ہے' جس کا ذکر ان کے فلسفوں نے کیا ہے۔ اور دور کے ایک گوشے میں ہمیں نیطشے' دائمی تواتر کے گیت گاتا سنائی دے گا۔ اور سپنگلر کی پرجوش آواز میں مغربی دنیا کے زوال کی پیش گوئی سنائی دے گی۔

اور اگر ہم ایک اور صوبہ کا رخ کریں تو ایسی گفتگوئیں سنیں گے جن کا موضوع سیاست ہے۔ چند لمحوں کے لئے ہمیں خوف لاحق ہو گا کہ امریکہ دریافت ہو چکا ہے' کیونکہ یہ لوگ بغیر احترام کے جمہوریت اور بغیر خوف کے فردیت پر بحث و تمحیص کرتے ہیں۔ یہ اشتراکیت کی خامیوں کو جانتے ہوئے بھی اس سے محبت کرتے ہیں۔ یہ اشرافیت کو عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ حالانکہ ادنیٰ نسل کے لوگوں سے اس کی ناانصافی سے انہیں گھن آتی ہے' اور کبھی کبھی وہ نوجوانوں کی والہانہ عقیدت سے اس "جنت الارض" کا ذکر کرتے ہیں' جس میں عقلمند حکومت کرتے ہیں اور جس کا ہر شہر متمول اور حسین ہے۔

ان نغموں کی جھنکار کے ساتھ جو اس لفظ نے ہمارے کانوں کو سنائی ہے' ہم مملکت کے قلب میں پہنچ گئے ہیں۔ یہاں حقیقی فلسفہ ہمارے سامنے ہے' یہاں وہ اپنے عشاق کے سامنے حسن' ثبات اور خیر کا مجسمہ بن کر آتا ہے۔ کیونکہ فلسفہ خفیہ طور پر فن کا حاسد ہے اور اس میں حسن کے لئے جو تخلیقی خون ہے اس سے جلتا ہے۔ سائنس نہیں' فن اس کا بڑا حریف ہے' کیونکہ بہترین انسان فن کے ساتھ بھی ایسی ہی وفا کرتے ہیں۔ حکمت خوش سلیقگی سے شاید یہ تسلیم کرلے کہ حسن کی عبادت تلاش حق سے بہتر ہے' کیونکہ حق اس قدر مشکل الحصول ہے کہ شاید ہم اس کے دامن کو کبھی نہ چھو پائیں۔ لیکن حسن فانی ہے' اس لئے وہ ہماری پرستش کا خیر مقدم کرتا ہے اور ہمیں اس کا صلہ دیتا ہے۔ فلسفہ حسن کا مطالعہ کرتا ہے' لیکن فن فلسفہ کو محترم جانتا ہے' اور اسے ازسرنو تخلیق کرتا ہے۔ فن محبت کے شدید لمحات' تعمیر کے صنم خانوں کے تناسب شکوہ' سنگ تراشی کی حس افروز شوکت' رنگوں کی آگ' الفاظ کی موسیقی اور خوش آہنگ آوازوں کے اژدحام میں اس کا جلوہ

دیکھتا ہے۔ لیکن افسوس! فلسفہ صرف حسن کے مسائل سے واقف ہے۔ حسن کیونکر پیدا ہوتا ہے اور اس کا مطلب کیا ہے' اور کیا حسن ہیئت میں موجود ہے' یا ہمارے دلوں کی طلب میں؟ یہ صوبہ جمالیات کا ہے' جسے علماء نے صدیوں تک بے کیف رکھا ہے۔ لیکن پھر بھی وہ حیرت اور لذت کے نور سے معمور ہے۔

مملکت کے مرکز میں اخلاقیات کا صوبہ ہے۔ یہ صوبہ بھی درسی تصورات کی وجہ سے کسی قدر خشک ہو گیا ہے۔ لیکن بعض پہلوؤں سے فلسفہ کا زرخیز ترین خطہ بھی ہے۔ کیونکہ زندگی کا فن' فن کی زندگی سے کہیں بہتر ہے۔ اور اخلاقیات' زندگی کے فن کی داستان ہے۔ یہاں فلسفہ اپنے متنوع علم کو حکمت حیات کا اعلیٰ مقام بخشتا ہے اور اپنے سب قلعوں سے انسانیت کی ہدایت کے لئے علم جمع کرتا ہے۔ بہترین زندگی کیا ہے؟ نیکی کا کیا فائدہ ہے؟ اور طاقت کب چنگیزی بنتی ہے؟ کیا اخلاق کا کمال سقراط کی حکمت' نیٹشے کی بے باکی' یا مسیح کی نرم روی میں ملتا ہے؟ کیا ہم زینو اور سپینوزا کی طرح بیراگی یا ابی کیورس اور رینان کی طرح لذت پسند نہیں؟ کیا زندگی کا مقصد لذت اندوزی ہے؟ کیا محبت صرف قانون کی حدود ہی میں جائز ہے؟ عدل کیا ہے اور وہ ہماری صنعتی تہذیب کے متعلق کیا کہتا ہے؟ یہ اہم ترین سوال ہیں' جن میں تہذیبوں کی تقدیر مضمر ہے۔ یہ وہ مسائل ہیں جو ہر ریاست اور ہر فرد کے لئے اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ وہ مسائل ہیں جن کے سامنے سائنس اپنے حساب کتاب اور قوانین' اپنی رقیق اور ٹھوس چیزوں اور گیسوں کے ساتھ بے کار اور سرد مہر معلوم ہوتی ہے۔ ایک ایسا شعبہ علم جو زندگی کا دوست نہیں بلکہ غیر شعوری طور پر موت سے سازش کر رہا ہے۔

لیکن موت بھی فلسفہ کا موضوع ہے اور جب تمام مناظرے ختم ہو جائیں تو فکر خوف زدہ ہو کر اس دشمن عظیم کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور فلسفہ مذہب کی قلمرو میں داخل ہوتا ہے۔ دینیات' مافوق الفطرت ہستیوں اور ان کے انسان سے تعلقات کا علم ہے۔ ان ہستیوں کے بارے میں فلسفہ خاموش ہے۔ لیکن فلسفہ انسان کی کم علمی کو ملحوظ رکھتے ہوئے انسان کے ساری زندگی اور کائنات سے اس کے تعلق' اس کی ابتدا اور انتہا کا ذکر کرتا ہے۔ فلسفہ کو انسان کی بقا سے وہی شغف ہے جو اسے دوسرے اہم مسائل سے ہے۔ شاید ہمیں فلسفہ کی تعریف یوں کرنا چاہئے کہ یہ زندگی اور موت کا سوال ہے۔ اور پھر وہ خدا سے بھی دلچسپی رکھتا ہے۔ دینیات کے خدا سے نہیں جو شاید کائنات سے باہر کہیں وجود رکھتا ہے' بلکہ فلسفیوں کے خدا سے۔ جو دنیا کا قانون اور ہیئت' قوت اور عزم ہے۔ اگر کوئی ذہن کائنات

کی راہنمائی کر رہا ہے تو فلسفہ اسے جان کر اور سمجھ کر' اس کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہتا ہے۔ اگر کوئی ایسا ذہن موجود نہیں تو فلسفہ اس بات کو بھی جاننا چاہتا ہے اور اگر یہ حقیقت ہے تو اسے بے خطر تسلیم کرنا چاہتا ہے۔ اگر ستارے محض دھند کے بے ربط انبوہ ہیں۔ اگر زندگی محض ایک حادثہ ہے جو اجتماعی طور پر مستقل مگر انفرادی طور پر فانی ہے۔ اگر انسان محض ایک کیمیاوی مرکب ہے جس کی تقدیر اور انتہا' انتشار اور فنا ہے۔ اگر فن کی تخلیقی سرمستی' عالم کی لطیف حکمت اور صوفیوں کی بے لوث شہادت' حیاتیاتی دنیا کے محض چند تابندہ واقعات ہیں' اور ہر سوال کا جواب' اور ہر روح کا انجام موت ہے تو فلسفہ اس حقیقت سے بھی دوچار ہو گا' اور اس تنگ دائرہ میں بھی انسان کی عظمت اور اہمیت کی جگہ نکالے گا۔ اب ہم اپنے سفر کا آغاز کریں۔

حصہ دوم: منطق اور فلسفہ علوم

باب دوم

حقیقت کیا ہے؟

حواس اور عقل

پاک طینت اور منکسرالمزاج نیلشے نے سخت تندی سے کہا ہے "پورے نئے عہد نامے' میں صرف ایک قابل احترام شخصیت نظر آتی ہے' رومی وائسرائے پائیلٹ۔ ایک رومی کا نجیب بیٹا' جس کے سامنے حقیقت' کے لفظ کو بری طرح مجروح کیا گیا تھا۔ اس نے نئے عہد نامہ کو فقط ایک سوال سے جس کے علاوہ اس کتاب میں کوئی اور قابل قدر قول نہیں متمول کر دیا تھا۔ اور وہ سوال تھا "حقیقت کیا ہے؟" اناطول فرانس اسے دنیا کا اہم ترین سوال سمجھتا تھا۔ اس لئے کہ آخر وہ اور کون سا ایسا سوال ہے جو اس سوال پر حق نہیں؟

منطق' فلسفہ کی ضیافت میں ایک نہایت معمولی ابتدائی طعام ہے۔ اس سے جہاں ایک بھوک کی تسکین ہوتی ہے' اس سے ہزاروں بھوکیں مر بھی جاتی ہیں۔ ہم منطق کو شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں' کیونکہ ہم یہ جانتے ہیں کہ ہمارا استدلال اکثر وہ آرزوئیں ہوتی ہیں' جنہیں ہم عقل کا جامہ پہنا دیتے ہیں۔ ہم اپنے زعم میں غیرجانبدار خیالات کی عمارتیں تعمیر کرتے ہیں' حالانکہ ہم ان واقعات اور اصولوں کا انتخاب کر رہے ہوتے ہیں' جو ہماری کسی نجی یا قومی آرزو کے مطابق ہوں۔ ہم منطق کو مشتبہ جانتے ہیں' کیونکہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ زندگی تمام دلائل و براہین سے زیادہ وسیع' بھرپور اور گہری ہے۔ منطق ازلی حقائق سے مرکب اور منجمد ہے۔ لیکن زندگی متحرک اور انقلاب آفریں ہے اور تمام قوانین سے بغاوت کرتی ہے۔ان چیزوں کی تعداد جسے عقل نے پہلے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور بعد میں مان لی تھیں' خاصی ہے۔ شائد ہم نے اپنی جوانی میں صحیح استدلال کے تمام اصول یاد کر لئے تھے' لیکن بعد میں یہی دیکھا کہ حقیقت کی پہچان اور زندگی کی حکمت اس محکم شعبہ علم کے اندر نہیں سما سکتی۔ ہماری خوشی شاید اسی میں ہے کہ ہم منطق کو اپنے جائزہ

کے آخری حصہ تک ملتوی کر دیں' کیونکہ اس سے فلسفہ خشک اور بے جان ہو جاتا ہے۔ اور پہلے ان مسائل سے دوچار ہو لیں جو کم بنیادی سہی' لیکن ہماری زندگی کے لئے نہایت اہم ہیں۔ لیکن ہم ایسا نہیں کر سکتے' کیونکہ ہم حق کی تلاش میں یہ جانے بغیر روانہ نہیں ہو سکتے کہ آخر ہمیں تلاش کس چیز کی ہے۔ اور ہم اس چیز تک کس راہ سے پہنچ سکتے ہیں۔ اور پھر یہ کہ اگر ہم اس تک پہنچ بھی جائیں تو یہ کس طرح پہچانیں گے۔ یہ وہی چیز ہے جس کی ہمیں تلاش تھی ------ سفر کی کوئی اور ترتیب یقیناً غیر منطقی ہو گی۔

ابتدا میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ منطق کے مسئلہ کو ان گمنام خوش فکروں نے جنہیں سوفسطائی کہتے ہیں' خوب اچھی طرح سمجھ کر حل کرنے کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ علم (یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جان لاک نے دو ہزار برس بعد اس حقیقت کا انکشاف کیا تھا) صرف حواس کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے حق کی کسوٹی یا یوں کہئے کہ پائیلٹ کے سوال کا جواب "احساس" ہے۔ حقیقت وہ ہے جو ہم چکھتے' چھوتے' سنتے' سونگھتے اور دیکھتے ہیں۔ اس سوال کا اس سے زیادہ آسان جواب اور کیا ہو گا؟ لیکن افلاطون اس جواب سے مطمئن نہیں تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اگر یہ حقیقت ہے تو حقیقت کا سرے سے وجود ہی نہیں' کیونکہ ہر شخص کے حواس مختلف طریقوں سے کام کرتے ہیں۔ پھر بندر اور فلسفی دونوں حق کی کسوٹی ہیں۔ اس کا فیصلہ کون کرے گا کہ کس کا "حق" زیادہ سچا ہے۔ افلاطون کو یہ یقین تھا کہ عقل حق کی کسوٹی ہے۔ عقل کا حواس سے وہی تعلق ہے' جو سیاست دانوں کا عوام سے' اور وحدت اور مرکزیت کا ایک بے ربط انبوہ سے ہوتا ہے۔

ارسطو کو اس سے اتفاق تھا اور اس نے پہلی مرتبہ استدلال کے قوانین وضع کر کے علم منطق کی بنیاد رکھی۔ کوئی خیال صحیح نہیں ہو سکتا' اگر وہ استدلال کے ان قوانین کی پوری پابندی نہ کرے۔ مثلاً انسان' ایک باشعور حیوان ہے (ابھی تک یہ مثال منطقیوں کی کتابوں میں ملتی ہے) سقراط ایک انسان ہے' اس لئے سقراط ایک باشعور حیوان ہے۔ ؟ ہونے کہا بالکل نہیں۔ ہر قیاس "انحصار مقدمہ بر نتیجہ ہے۔" یعنی ہم جس بات کو ثابت کرنا چاہتے ہیں' اسے پہلے ہی سے فرض کر لیتے ہیں۔ ہمارا کبریٰ اس وقت تک صحیح نہیں ہو سکتا' جب تک ہم یہ فرض نہ کر لیں کہ نتیجہ صحیح ہے۔ مثلاً انسان کو باشعور ثابت کرنے کے لئے یہ فرض کر لینا ہرگز صحیح نہیں کہ (جس میں سقراط بھی شامل ہے) باشعور حیوان ہے۔ شاید وہ محض حیلہ جو حیوان ہے' اس لئے عقل ہمیشہ غیر متعین ہے' اسی کیورس کہتا تھا "بجا ہے۔" ہمیں پھر سوفسطائیوں سے رجوع کرنا چاہئے۔ فقط اپنے "حواس" پر اعتماد

رکھنا چاہئے۔ لیکن متشکلین کہتے تھے' یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ہمارے حواس کو سورج شلجم کی طرح چھوٹا معلوم ہوتا ہے اور ستارے' آسمان کے جسم پر پھوڑے معلوم ہوتے ہیں۔ کیا ہم اپنے حواس پر اعتماد کر سکتے ہیں؟ پرہو نے کہا' کوئی بات بھی یقینی نہیں ہے۔ اور جب وہ مر گیا تو اس کے شاگردوں نے جو اس سے بہت عقیدت رکھتے تھے' اس کی موت پر افسوس نہیں کیا' کیونکہ انہیں یقین نہیں تھا کہ وہ مر گیا ہے۔

اس طرح فلسفہ کی جولانگاہ میں حواس اور عقل کا باہمی کھیل ہوتا رہا' حتیٰ کہ یونان اور روما کا تمدن مٹ گیا اور یورپ مسیحیت اور کلیسا کے قبضے میں آگیا۔ اور اس وقت چونکہ لوگ کبریائی احکام میں یقین نہیں رکھتے تھے۔ اس بات پر یقین رکھنا جسے حواس جھٹلائیں۔ مقدس فریضہ سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے لوگ سوفسطائیوں اور اسی کیورس کو بھول گئے۔ اور اگرچہ اہل مدرسہ حق کی تعریف یوں کرتے تھے کہ جب خیال اور اشیاء مطابق ہوں تو خیال صحیح ہوتا ہے۔ وہ افلاطون اور ارسطو کی پیروی میں عقل کی برتری کا اعلان کرتے رہتے تھے۔ لیکن سب سے بہتر استدلال' استخراجی استدلال تھا' جس کے ذریعے ہم ایک متعین طرز فکر کو یقینی مان کر دنیا کا ایک منظم تصور استنباط کر سکتے تھے۔ خیال مشاہدہ سے عظیم تر حقیقت ہے' کیونکہ یہ مشاہدہ سے حاصل کی ہوئی معلومات کی ابتدا اور انتہا ہے۔ لیکن اعیان یا جماعتی تصورات غیر فانی ہیں۔ جو مشہودات سے پہلے اور آخر موجود ہیں۔ اور انہیں کی وجہ سے مشہودات ایک خاص ہیئت اختیار کرتی ہیں۔ انسانیت جیتے جاگتے انسانوں سے زیادہ حقیقت رکھتی ہے۔ اور حسن گلاب کے پھولوں سے زیادہ حقیقی ہے۔ حتیٰ کہ ڈے کارٹ جو ابھی تک اس تصور کا اسیر تھا جس سے اس نے انسانوں کو آزاد کر دیا تھا' ہر فلسفی سے مطالبہ کرتا تھا کہ حواس کی شہادت کو مسترد کر دو اور سوائے "واضح خیال" کے کسی چیز پر پورا یقین نہ رکھو۔

عہد جدید حواس کی بحالی کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ سائنس میں گیلیلیو نے اور فلسفہ میں بیکن نے حواس کو ان کی پرانی حیثیت واپس دلائی۔ ماہر فلکیات نے حواس پر آلات مشاہدہ کا اضافہ کیا۔ فلسفی نے عقل اور مشاہدہ کا امتزاج پیدا کیا اور مقدس ترین نتائج کو استقرائی اصولوں پر پرکھا۔ اگر کسی کو منطق پڑھنا ہے' تو وہ بیکن کی "نوودم او گنیم" پڑھے۔ بیکن کے نزدیک منطق' شمشیر زنی کے مقابلہ کی طرح دلچسپ ہے۔ استدلال ایک معرکہ تسخیر ہے اور فلسفہ سراغ رسانی کا ایک افسانہ جس میں حقیقت ایک مجرم کی حیثیت رکھتی ہے۔ کتنی چونٹیلی باتیں ہیں اور کتنی حکمت ہے اس کتاب میں کتاب کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

"انسان جو قدرت کا نمائندہ اور مفسر ہے' صرف اسی قدر کرتا اور جانتا ہے' جس قدر اس کا مشاہدہ قدرت اسے اجازت دیتا ہے۔ وہ اس سے زیادہ نہ کچھ جانتا ہے اور نہ جاننے کا اہل ہے۔" کیا اس سے پہلے کسی نے تصوف' جہالت اور بلند بانگ علمی دعووں کے خلاف اتنی مکمل جنگ کا اعلان کیا تھا؟ یہ وہ بانگ درا تھی' جس نے بالذوق لوگوں کو یک جا کیا اور تجرید علم کے نقارے پر چوٹ لگائی۔

اور پھر انگلستان اور یورپ کے دوسرے ممالک کے درمیان مباحثہ چھڑ گیا۔ لائبنز' کانٹ اور ہیگل نے حواس پر شکوک کی بھرمار کر کے انہیں معمہ بنا دیا۔ اور عقل کے اس دعویٰ کی پشت پناہی کی کہ وہی حواس کی شہادت کو پرکھ سکتی ہے۔ ہابز' لاک اور مل نے اس عقل کو بنظر تحقیر دیکھا جو حواس کی کائنات سے باہر ہمیں حقیقت تلاش کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ کانٹ نے کہا: "لیکن ریاضی حیاتی تجربہ سے بے نیاز ہے۔ ۵ x ۵ ہمیشہ ۲۵ ہوں گے۔ چاہے حواس کچھ ہی کہیں' مل نے جواب دیا نہیں۔ ہم ۲ x ۲ کو اس لئے ۴ سمجھتے ہیں کہ ہمارے تجربہ میں اور اس تجربہ میں جو ہمیں وراثتاً" ملا ہے۔ ۴ ہمیشہ ۲ x ۲ کا نتیجہ رہا ہے۔ لاک نے کہا: علم حواس سے پیدا ہوتا ہے اور ریاضی کی بلند ترین پرواز کی صحت بھی اس وقت تک غیر یقینی ہے' جب تک کہ تجربہ اس پر مہر قبولیت ثبت نہ کرے۔

کسی مباحثہ کا اتنا عجیب انجام کبھی نہیں ہوا۔ وہ فلسفہ جو علم کو فوق التجربہ سمجھتا تھا' یورپ میں ختم ہو گیا اور انگلستان نے اسے اپنا لیا۔ اور وہ فلسفہ جو تجربہ کو اہم سمجھتا تھا' انگلستان میں ختم ہو کر امریکہ میں زندہ ہو گیا۔ کئی صدیوں سے انگلستان کا رجحان "عمل" کی طرف رہا تھا۔ اور اس کی منطق کے عملی نتائج انگلستان پر تجارت پیشہ جماعت کی حکمرانی کا عکس تھے۔ لیکن اب جب کہ تجارت پیشہ جماعت نے زمیندار طبقہ کو مسخر کر لیا ہے' انگریز مفکر یکایک ناقابل فہم باتیں کرنے لگے ہیں۔ انہوں نے کانٹ اور ہیگل کو جرمنی سے درآمد کیا اور حواس کو بے معنی قرار دے دیا اور استخراجی استدلال سے ایسے قوانین اخذ کئے جو نہ صرف منطق کے لئے بلکہ کل کائنات کے لئے صحیح تھے۔ بریڈلے نے تجربہ کو "مطلق" کا نام دیا اور پھر اس کو فضا میں تحلیل کر دیا۔ بوسنکے نے تمام منطق کو نفسیات استدلال بنا دیا۔ اور پھر استنباط کی یوں تعریف کی' استنباط ایک عین کے اندر اختلافات کی حقیقت کی طرف در پردہ اشارہ ہے۔ اور یہ اشارہ ان اختلافات میں اس عین کی وضاحت کے ذریعے ہوتا ہے' جو براہ راست حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ برٹرنڈ رسل نے منطق کو استدلال کی سائنس سے تمام تصورات مجرد کی سائنس بنا دیا۔ پروفیسر وائٹ ہیڈ کے

ساتھ اس نے استخراجی متعینوں سے ریاضی کی ایک عمارت تعمیر کی جو تجربہ سے قطعی بے نیاز ہے۔ اور صحت کی تعریف یوں کی:-

الفاظ کا وہ مجموعہ صحیح ہے جو ایک واقعہ کے ساتھ ایک خاص تعلق رکھتا ہو۔ کس واقعہ کے ساتھ کیا تعلق؟ میرا خیال ہے کہ بنیادی تعلق یہ ہے "وہ الفاظ کا مجموعہ صحیح ہے۔ اگر وہ شخص جو وہ زبان کہتا ہے، وہ لفظ اس وقت استعمال کرے جب وہ اپنے آپ کو اس ماحول میں پائے جس میں وہ تمام عناصر پائے جائیں جو ان الفاظ کا مطلب ہیں اور یہ عناصر اس میں اتنا شدید ردعمل پیدا کریں کہ وہ ان الفاظ کو استعمال کرے جن کا مطلب یہ عناصر ہیں۔"

افسوس! کیا برطانوی لوگ اپنی زبان سیکھتے ہی جاتے ہیں؟ اور کیا اہل مدرسہ کا ایک نیا دور شروع ہو رہا ہے، جس میں ان خیالات کی تحقیق و تدقیق ہوتی تھی جن کا نہ تجربہ سے کوئی تعلق تھا نہ زندگی کو کوئی فائدہ؟ اکثر جدید فلسفہ اس کوشش پر مشتمل ہے کہ جو کچھ سب لوگ جانتے ہیں اسے ایسے علم میں ڈھالا جائے جسے کوئی نہ سمجھ سکے۔

ولیم جیمز، امریکہ کی عملیت پسند فضا کے زیر اثر تصورات محض سے بیزار تھا۔ وہ یہ کہتا تھا کہ فلسفہ کے لئے ادق یا ناقابل فہم ہونا ضروری نہیں، اور حقیقت کا مطلب اتنے صاف اور سیدھے انداز میں بیان ہو سکتا ہے کہ اسے ایک تاجر بھی سمجھ سکے۔ حقیقت افادہ ہے۔ کسی خیال کی صحت کو اس کا منطقہ یا عیاں بالذات اصولوں سے استنباط کے ذریعے پرکھنے کی بجائے جیمز نے صحت کا معیار عمل کو بنایا اور ہر خیال کے عملی نتائج دیکھنے کی دعوت دی۔ اور اس طرح خیال کا رخ پھر محسوسات کی طرف پھیر دیا۔ جون ڈیوئی کے نزدیک خیال پیٹ اور ناخنوں کی طرح محض ایک آلہ کار ہے اور اس کا معیار صحت یہی ہے کہ وہ اپنا وظیفہ پوری طرح ادا کرتا ہے کہ نہیں۔ خیال کا وظیفہ زندگی کو سمجھنا اور اس پر قابو پانا ہے۔ یہ تھی انگلستان کی استقرائی روایت جسے دوبارہ غلبہ میسر آیا ہے۔ افادیت، ایک پرانے طرز فکر کا نیا نام ہے۔ یہ محض بیکن کے نظریہ کی تکمیل ہے، جس نے کہا تھا کہ وہ اصول جو عمل میں سب سے زیادہ کارآمد ہے وہی خیال کے نقطہ نظر سے سب سے زیادہ صحیح ہے۔ بنتھم کا بھی یہی فلسفہ تھا کہ افادہ صحت کی کسوٹی ہے۔

افادیت میں کئی خامیاں ہیں، کیونکہ اس کے نرم مزاج بانی نے عام آدمی کو یہ فرض کرنے کی اجازت دے دی تھی کہ ان کے تمام بے بنیاد عقائد صحیح ہیں اگر وہ انہیں اس دنیا کی جابرانہ بے نیازی سے فرار کرنے میں مدد دیں۔ لیکن ذاتی یا ہنگامی افادہ کسی عقیدہ کو

صحیح نہیں بنا دیتا۔ فقط مستقل اور عالمگیر افادہ سے کوئی عقیدہ صحیح بنتا ہے۔ اور چونکہ یہ ایک شرط ہے جو کبھی مکمل طور پر پوری نہیں ہوتی' صحت' فقط امکان صحت بن جاتی ہے۔ جب افادیت کو ماننے والے فلسفی کسی خیال کے بارے میں یہ کہتے تھے کہ یہ کبھی صحیح تھا' کیونکہ یہ کبھی مفید تھا تو ان کی بات لایعنی تھی' اس لئے کہ اس کی حیثیت ایک مفید غلطی کی تھی۔ اور ہم کبھی اس بات کا یقین کرنے کے قابل نہیں ہو سکیں گے۔ کہ ہمارے محبوب عقائد ہی کہیں بقول نطشے "غلطی کی مفید ترین قسم" نہ ہوں۔ اس دنیا کی تخلیق عقل کی بنیاد پر نہیں ہوئی۔

اس طرح ہمیں پھر سوفسطائیوں کی طرف لوٹنا پڑتا ہے اور ہم اسی فیصلے پر پہنچتے ہیں' جو ان کا تھا۔ حواس ہی صحت خیال کی کسوٹی ہیں۔ لیکن حس نہیں تمام حواس۔ ایک حس شاید ہمیں فریب دے دے' جس طرح روشنی ہمیں رنگوں کے بارے میں فریب دیتی ہے۔ فاصلہ قامت کے بارے میں۔ اور کوئی دوسری حس ہی ہماری اس ایک حس کی غلطی کی تصحیح کر سکتی ہے۔ حقیقت مربوط احساس ہے۔ لیکن احساس میں ہمیں وہ تمام آلے اور اوزار شامل کرنے پڑیں گے' جن سے ہم حواس کو تیز اور وسیع کرتے ہیں' بیٹ پا' دوربین' خوردبین' حساس پلیٹ' ایکس رے' ہماری آنکھوں کو حساس تر بنانے کے آلے ہیں۔ ٹیلی فون' سٹیتھسکوپ اور ریڈیو' ہماری دنیائے سماعت کو وسیع تر بناتے ہیں۔ اور پھر احساس : داخلی حس کو بھی شامل ہونا چاہئے۔ ہماری زندگی اور ذہن کا اندرونی "احساس" دوسرے حواس کی شہادت کی طرح فوری اور قابل اعتماد ہے۔ آخر باوجود خود فریبی میں مہارت کے ہم کسی چیز سے اتنی اچھی طرح واقف نہیں ہیں' جتنے اپنے آپ سے۔

یہ صحیح ہے کہ حواس ہمیں کوئی یقینی چیز نہیں بتا سکتے۔ ہیوم ٹھیک کہتا تھا۔ حواس ہمیں کوئی ماورائی قسم کی علیت کی شہادت نہیں دیتے۔ بلکہ فقط واقعات کی ترتیب کی۔ ہم کبھی یقینی طور پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ چونکہ واقعہ ب الف کے بعد ظہور پذیر ہو گا۔ احساس مستقبل کے ایک لمحہ کا بھی ہمیں یقینی علم نہیں دے سکتا۔ ہم محض اس امکان سے خطرے میں کود سکتے ہیں کہ جو ترتیب واقعات پہلے تھی آئندہ بھی وہی ہو گی۔ اور ہمیں ضرورت بھی اسی کی ہے۔ فقط ایک منطقی کو اس سے زیادہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ دنیا اتنی بوقلموں اور انقلاب آفرین ہے کہ ہمارے کلیے ہمیشہ خطرناک طور پر نامکمل رہتے ہیں۔ کوئی کلیہ ہمیں مطلق حقیقت نہیں بتاتا' فقط اضافی حقیقتیں بتاتا ہے اور ہمیں اضافی حقائق پر اکتفا کر لینا چاہئے۔

ہمارے علاوہ بھی دنیا میں لوگ ہیں اور ان کے حواس اور ان کی شہادت ہمیشہ ہمارے حواس کی شہادت کے مطابق نہیں ہو گی۔ جب پیرانڈیلو کے تمثیل میں سینوراایگی کہتی ہے کہ وہ تب یقین کرے گی جب وہ اپنی آنکھوں سے دیکھے گی اور اپنی انگلیوں سے چھوئے گی تو لینڈیزی اسے بتاتا ہے "تمہیں کچھ اس تجربہ کا بھی احترام کرنا چاہئے جو دوسرے لوگوں نے دیکھ اور چھو کر حاصل کیا ہے اور جو ممکن ہے اس تجربہ کے بالکل برعکس ہو جو تم دیکھتی اور محسوس کرتی ہو۔" جہاں معاملہ ایک فرد کا نہیں بلکہ ایک سے زیادہ کا ہے' حقیقت اجتماعی طور پر مربوط احساس ہے' جہاں ایک سے زیادہ لمحات کا تعلق ہے۔ حقیقت مستقل طور پر مربوط احساس کا نام ہے حقیقت رنگ رنگ کے شیشوں سے بنا ہوا گنبد ہے۔ اور ہر شخص اپنے حقیر گوشہ سے ان رنگوں کا ایک مختلف امتزاج دیکھتا ہے۔ شاید حقیقت ہماری خود فریبیوں کا مشترکہ سرمایہ ہو۔ اور یقین وہ غلطی ہو جسے تمام لوگ صحیح سمجھتے ہوں۔ لیکن ہمیں اسی تعریف پر راضی ہو جانا چاہئے۔

لیکن آخر اس کاروباری منطق میں جو ایک عامی کے تعصبات کی تصدیق کرتی ہے' عقل کا مقام کیا ہو گا؟ اس کا وظیفہ یہ ہے کہ احساسات کو خیالات میں' اور خیالات کو علم اور علم کو حکمت' مقاصد کو شخصیت' افراد کو سماج اور سماج کو امن میں مربوط کرے' تسخیر حقیقت میں عمل کا کام ثانوی مگر اہم ہے۔ یہ بہت سے احساسات کے انتشار اور تناقض میں ربط پیدا کر کے ہم آہنگ علم کی بنیاد رکھتی ہے۔ وہ علم جس کی تصدیق یا تردید آئندہ احساسات کر سکیں' اس کی شہادت' حواس کی شہادت سے کہیں کم یقینی ہے۔ کیونکہ مشہود کو عبور کرنے میں ہم استخراج سے کام لیتے ہیں۔ اور ہر استخراجی قدم ہمیں حواس کی شہادت سے دور لے جاتا ہے' اور حقیقت کے امکان کو کم کر دیتا ہے۔ لیکن زندگی میں یہ جوا بھی کھیلنا پڑتا ہے۔ ہمیں متناقض احساسات اور جانبدار نظریوں کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ اگر ہمیں یہ منظور ہے کہ ہم اپنی فہم و فراست اور تسخیر فطرت کو وسیع اور فراخ کریں اور جس طرح کوہلر کے بندر اسی وقت بہتر استدلال کرتے تھے جب وہ پورے طور پر حالات کا جائزہ لے لیتے تھے اسی طرح ہمارے لئے بھی مدلل حقیقت۔ فلسفہ اور حکمت' اخلاق اور حسن کی طرح مبسوط زاویہ نظر ہے' جس میں جز و کل میں سما گیا ہو۔ حواس کے ذریعے ہمارے قدم زمین پر جمے رہتے ہیں۔ عقل اور استدلال کے ذریعے ہم اپنی نگاہ حواس سے پرے ڈالتے ہیں اور نئے حقائق کا تصور باندھتے ہیں' جن کی حواس شاید کسی دن تصدیق کریں۔ احساس "صحت کی کسوٹی ہے"' لیکن عقل صحت کو دریافت کرتی

رموزِ علم

تو یہ ہے ہمارا منظر۔ لیکن اس منظر پر ہم ہر طرف سے خطروں میں گھرے ہوئے ہیں۔ کیونکہ ہیئت میں یقین رکھنے والے" احساس کی صحت کی تردید کرتے ہیں اور منطقی عقل کے قابل اعتماد ہونے پر شک کرتے ہیں۔ ہم ان سے کس طرح دوچار ہوں گے

عقل ہی سے نیکی اور بدی کی تمیز ہوتی ہے اور استدلال ہی سے شیریں اور تلخ ہیں۔ لیکن در حقیقت صرف ذرات موجود ہیں اور خلا۔" اس طرح تیئیس سو برس گزرے مادیت پرست ڈیموکریٹس نے فلسفہ علم کی بنیاد رکھی۔ اور ہیئت کی طرح ڈالی۔ اس اقتباس سے یہ واضح ہے کہ اس مفکر اعظم کے ذہن میں تمام محسوسات کی داخلیت کا تصور تھا رنگ۔ صوت۔ وزن۔ ہیئت۔ آواز۔ ذائقہ۔ شکر اور درد یہ سب صفات چیزوں میں موجود نہیں۔ بلکہ یہ سب کی سب محسوس کرنے والے میں موجود ہیں۔ ہابز نے بیس صدیوں کے بعد کہا" کہ تمام وہ صفات جن کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں" مادہ کی مختلف حرکات ہیں جو مختلف طریقوں سے ہمارے حواس کو متاثر کرتی ہیں۔ آواز ہوا کی حرکت ہے۔ روشنی ایتھر کی حرکت ہے" یا آنکھوں پر جواہر فرد کی بمباری ہے۔ اور رنگ روشنی کی لہروں کی شرح اور حجم سے اور پردہ بینی کے متاثر حصہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ معروضی حقیقت نہ گرم ہے نہ سرد" نہ بدصورت ہے نہ خوبصورت۔ نہ تاریک ہے نہ بے رنگ اور نہ خاموش۔ اگر دنیا میں آنکھیں یا حساس جسم نہ ہوتا تو روشنی کیونکر ہوتی؟ اگر دنیا میں کان نہ ہوتے تو آوازیں کیونکر ہوتیں۔ حسین ترین قوس قزح ہماری نظروں میں ہے نہ کہ آسمان میں! اب دیکھیں کہ بعض فلسفی کیا کہتے ہیں؟ بعض فلسفی یہ مانتے ہیں کہ ہم سوائے خیالات کے اور کچھ نہیں جانتے۔

یہ خارجی دنیا" جسے ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری ذات سے الگ رہ کر قائم ہے" رنگوں کی دنیا ہے" لیکن رنگ داخلی ہیں۔ وہ ہم میں ہیں" ان چیزوں میں نہیں جنہیں ہم دیکھتے ہیں۔ کچھ لوگ چند رنگوں کو نہیں دیکھ سکتے۔ مثلاً قدرت میں انہیں سرخ رنگ نظر نہیں آتا۔ اگر ہم سب ان کی طرح ہوتے تو کیا گلاب کبھی سرخ ہوتا۔ رنگ صبح سے دوپہر" دوپہر سے شام اور شام سے مصنوعی روشنی کے وقت تک بدلتے رہتے ہیں۔ ان میں کون سا رنگ اصلی ہے؟ کیا کپڑے کا اصلی رنگ وہ ہے جو ہم دن میں اسے خریدتے ہوئے دیکھتے ہیں" یا وہ جب ہم اسے روشنی میں پہن کر چلتے پھرتے ہیں۔ دوسرے حیوانوں کی آنکھیں ہماری آنکھوں سے بالکل مختلف ساخت رکھتی ہیں۔ اور جگنو وہ اور رنگوں اور عکسوں کی شناخت

دیتی ہیں، کون سی شکل یا رنگ حقیقی ہے۔ ہماری آنکھیں قوس قزح کے بڑے حصہ کو نہیں دیکھ سکتیں۔ بہتر آنکھیں رکھنے والے حیوان دنیا کے رنگ اور شکلیں ہم سے بہتر طریقہ پر دیکھ سکتے ہیں۔ ہم میں سے کون انسان یا حیوان، حقیقی دنیا کو دیکھتا ہے؟ اور یہ میز جسے ہم گول سمجھتے ہیں، اگر ہم اسے غیر متعصب نظر سے دیکھیں تو شاید یہ بیضوی ہو۔ کیا تمام شکلیں اور رنگ شاہد کے مشاہدہ پر مبنی ہوتے ہیں؟

اسی طرح شامہ اور ذائقہ پر غور کرو۔ ہر شخص کی پسند اپنی اپنی ہوتی ہے۔ ہزاروں آدمیوں کو مچھلی کا اچار پسند ہے۔ لاکھوں اسے پسند کرنے کا صرف دعویٰ کرتے ہیں۔ مفلس چینی سڑی ہوئی مچھلی کے ذائقہ کو خوشگوار سمجھتے ہیں اور دولت مند فرنگی سڑے ہوئے پنیر کے ذائقہ کو اچھا کہتے ہیں۔ اسی طرح گرم اور سرد کے تضاد کو لو۔ ایک ہاتھ گرم پانی میں ڈالو دوسرا سرد پانی میں۔ اور پھر دونوں ہاتھوں کو نیم گرم پانی میں ڈالو۔ نیم گرم پانی ایک ہاتھ کو سرد اور دوسرے کو گرم لگے گا۔ حقیقت میں یہ کیا ہے؟ اسی طرح لذت اور الم پر غور کرو۔ جب زبان سے دماغ تک کی نسیں کاٹ دی جائیں یا زکام سے متاثر ہوں تو غذا میں کوئی چاشنی باقی نہیں رہتی۔ کیا ذائقہ غذا میں، ذائقے میں یا دماغ میں ہے؟ ہمارے دانت میں درد ہے۔ ہم اس عصب کو جو دانت کو دماغ سے جوڑتی ہے بے حس کر دیں تو درد مٹ جائے گا۔ کیا یہ درد دانت میں تھا یا دماغ میں؟ یہی حال حسن اور قبح کا ہے، یہ عورت حسین ہے۔ لیکن کیا یہ اپنے بھائی، اپنی رقیب کے لئے بھی اسی طرح حسین ہے جس طرح تمہارے لئے؟ کیا اس کا حسن اس میں ہے یا ہماری آرزو میں؟ معروضی دنیا سے وہ تمام صفات لے لو، جو تم اپنے وجود اور اپنے مشاہدہ سے منسوب کرتے ہو تو باقی کیا رہ جاتا ہے، ذرات، خلاء، مادہ، مکان اور زمان۔

لیکن یہ مادہ سوائے احساسات کے ہے جو خیالات کی شکل میں تمہارے ذہن میں یک جا ہو جاتے ہیں اور کیا ہے؟ مکان پیچھے۔ "آگے۔" "ساتھ۔" "اوپر۔" "یہاں۔" "وہاں۔" "نزدیک۔" "دور۔" "بڑا۔" "چھوٹا" کے علاوہ کیا ہے؟ اور یہ سب رشتے سوائے مشاہدہ کرنے والے کے رویہ کے اور کیا ہیں؟ کیا اشیاء بذات خود آگے ہیں یا پیچھے، یہاں ہیں یا وہاں، بڑی ہیں اور چھوٹی نہیں، یا وہ ہماری نسبت سے ایسی ہیں۔ ایک چیز آنکھوں کو کچھ اور نظر آتی ہے اور خوردبین سے کچھ اور، اور دوربین سے کچھ اور موسیو برجرٹ کے کتے نے کہا "میرا آقا جب میرے نزدیک آتا ہے تو بڑا ہو جاتا ہے اور جب دور جاتا ہے تو چھوٹا ہو جاتا ہے۔ میں ہی فقط وہ ہستی ہوں جو جہاں جاتا ہوں یکساں رہتا ہوں۔" ایک سنگترے کا

اصلی حجم کیا ہے؟ کیا وہ جو مکھی اس کے گرد گھوم کر محسوس کرتی ہے' یا وہ جو مجھے اسے ہاتھ میں لے کر محسوس ہوتا ہے۔ یا پھر وہ جو دور سے کوئی آدمی اسے دیکھتا ہے۔ تم پیمانہ کا حوالہ دے کر پناہ نہیں لے سکتے کہ سنگترے کا حجم وہ ہے جو پیمانہ ہمیں بتاتا ہے۔ پیمانہ کا ہر انچ سنگترے کی طرح ہے وہ تمہیں بڑا لگتا ہے اور مکھی کو چھوٹا۔ اور مریخ کے کسی باشندہ کو تمہارے اندازے سے کہیں چھوٹا۔ درحقیقت انسان ہی تمام چیزوں کا پیمانہ ہے اور اس کے مشاہدہ کی دنیا بیشتر اس کی تخلیق ہے۔

آئن سٹائن نے کہا کہ نظریہ اضافیت کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ زمان و مکان سے مادی معروضیت کا آخری شمہ بھی چھن گیا ہے۔ زمان سوائے ہمارے "پہلے" اور "بعد" کے احساس کے اور کیا ہے اور کیا اذہان کے وجود کے بغیر بھی "پہلے" اور "بعد" کا احساس باقی رہ جاتا ہے؟ شاید وقت کا احساس پروانے کے ذہن میں زیادہ شدید ہو' بہ نسبت ہمارے ذہن کے' کیونکہ ہماری زندگی اس سے کہیں زیادہ ست ہے۔ کون سا وقت زیادہ حقیقی ہے۔ والٹیئر کے ایک افسانہ میں زحل کے ایک باشندہ نے یہ شکوہ کیا تھا کہ اس کے سیارہ پر زندگی کی میعاد فقط پندرہ ہزار برس ہے' اور اس مختصر سے عرصے میں کون کیا سیکھ سکتا ہے؟ وہ سال جس میں ہمارے تجربات زیادہ ہوں اس سال سے زیادہ لمبا معلوم ہوتا ہے جس میں ہمارے لئے کوئی قابل یادگار واقعہ رونما نہ ہوا ہو۔ دانت نکلواتے ہوئے وقت دوچند ہو جاتا ہے۔ فلمیریون اس آدمی کا ذکر کرتا ہے جو زمین سے روشنی کی رفتار سے زیادہ دور ہو رہا تھا۔ اس نے انقلاب فرانس کے تمام واقعات معکوس سلسلہ وقت میں دیکھے۔ یعنی جو واقعات بعد میں ہوئے تھے انہیں پہلے دیکھا۔ اور جو پہلے ہوئے تھے انہیں بعد میں۔ مکان زمان کو بدل دیتا ہے جیسے سمندری سفر میں ہم اکثر دیکھتے ہیں۔ یا ہم نے موسیو پاسی پارتو کے "اسی دن میں دنیا کے سفر" میں دیکھا کہ زمان مکان کو بدل دیتا ہے۔ وہ سیارہ جسے ہم شمالی آسمان پر دیکھتے ہیں' اب وہاں موجود نہیں ہے۔ وہ روشنی دینے کے فوراً بعد جسے ہم اب دیکھ رہے ہیں' اپنی جگہ سے ہل گیا تھا۔ زمان و مکان کا سلسلہ مقام اور فاصلہ کا ایک الجھا ہوا مرکب ہے۔ یہ ایک طرز مشاہدہ ہے' کوئی خارجی چیز نہیں۔ انسانی ذہن ایک زندان ہے۔ وہ کبھی یہ نہیں جان سکتا کہ ہمارے مشاہدہ کا کتنا حصہ مشہود میں ہے اور کتنا شاہد میں۔ یہ ہیں وہ محسوسات جن کا دعویٰ ہے کہ وہ ہمیں حقیقت کا پتہ دیتی ہیں۔

لیکن نہیں۔ محسوسات ہمیں حقیقت کی خبر نہیں دے سکتیں۔ ہم صرف اپنے خیالات کو جانتے ہیں۔ اور ہم ان کی صحت کا اندازہ اس خارجی دنیا کے ذریعے نہیں کر سکتے جو

ہماری محسوسات نے تخلیق کی ہیں۔ ہم یہ کیونکر جان سکتے ہیں کہ کوئی چیز دراصل کیا ہے، جبکہ وہ ان حواس کے طرز مشاہدہ میں رس بس کے ہم تک پہنچتی ہے جن کے ذریعے ہم اسے جانتے ہیں۔ یہ خارجی دنیا جسے ہم خیال کی صحت کا ضامن سمجھتے ہیں، خود تخلیق خیال ہے۔ یہ وہ خیال ہیں جنہیں ہم احساسات کے انتشار میں ربط پیدا کر کے بناتے ہیں۔ ہم دیکھنے، سننے، چکھنے اور چھونے کے تاثرات کو ملا کر کوئی چیز بناتے ہیں۔ ہم مشاہدہ کرنے میں کوئی چیز تخلیق کرتے ہیں۔ ہمارے ذہن، ہمارے خیالات کی دنیا یقیناً وجود رکھتی ہے، باقی ہماری فرضی باتیں ہیں۔

کیا یہ سچ ہے؟ شاید فلسفہ عینی موجودات سے شغف نہیں رکھتا اور فن کی طرح فلسفہ علم کے بارے میں بھی ہم فقط یہی کہہ سکتے ہیں کہ ذوق کے معاملہ میں بحث کی کوئی گنجائش نہیں۔ وہ شخص جو خیالات کی وضاحت چاہتا ہو خارجی دنیا کی یہ عینی تردید اسے قائل نہیں کر سکتی۔ یہ استدلال منطقی قلابازی، وحشیوں کے سحر اور زمانہ وسطیٰ کے اسرار کی یادگار ہے۔ تجربہ ہی ہر چیز نہیں۔ کیونکہ اس کے علاوہ تجربہ کا ماخذ بھی ہے اور اسی ماخذ کو ہم مادہ کہتے ہیں۔ مادہ کے بارے میں ہم جون سٹوارٹ مل کے اس قول سے زیادہ کچھ نہیں جانتے کہ وہ محسوسات کا مستقل امکان ہے۔

عینی فلسفہ کے فریب کا راز یہ ہے کہ وہ مطلب' کو وجود' کے ساتھ الجھا دیتا ہے۔ وہ چیزیں جن کا کوئی شاہد مشاہدہ نہیں کرتا، ان کا کوئی مطلب نہیں، لیکن شاید ان کا وجود ہو۔ بریڈلے نے کہا تھا کہ کسی چیز کے حقیقی ہونے کے لئے یہ لازمی ہے کہ اس کا مشاہدہ کیا جائے۔ لیکن کیا وہ دور کے سیارے دوربین کی ایجاد سے پہلے وجود نہیں رکھتے تھے۔ اور کیا ہم یہ یقیناً کہہ سکتے ہیں کہ کوئی ایسا سیارہ موجود نہیں جو ہمیں موجودہ آلوں سے بھی نظر نہ آتا ہو؟ بے شک وہ ایسے نہیں تھے اور نہ ہیں۔ جیسا ہم ان کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ یہ روشنی کا نقطہ جسے ہم شعریٰ کہتے ہیں، شاید تاریک مادہ کا ایک ہیولیٰ ہو، جو اس تیز رفتاری سے ذرات پیدا کرتا ہو کہ وہ راستہ میں روشن ہو جاتے ہوں، لیکن ان ذرات کا سرچشمہ خارجی دنیا ہے۔ دوربین اس کی تخلیق نہیں کرتی۔ کسی مہندس نے یہ پیش گوئی کی کہ اگر ہم اپنی دوربین آسمان کے ایک خاص گوشہ کی طرف موڑ لیں تو ہمیں وہاں ایک نیا سیارہ دکھائی دے گا۔ دوربینوں نے دیکھا اور ایک نیا سیارہ دریافت کیا۔ کیا اس طرح ہم نے نیپتون کو تخلیق کیا تھا؟

ہم یہ مانتے ہیں کہ ان سیاروں کا وجود جن کا ابھی ہم مشاہدہ نہیں کر سکتے محض ایک

استنباط ہے اور کوئی استنباط یقینی نہیں ہوتا۔ لیکن ایک استنباط جس کی کئی ہزار سالوں سے تجربات مشاہدہ سے تصدیق ہوئی ہو' نہایت معقول استنباط ہے۔ جو انسانی زندگی کے لئے اس فلسفہ کے لئے جو گوشہ گیری اختیار کرنے کی بجائے زندگی کو متاثر کرنا چاہتا ہو' کافی ہے۔ جب ہم اپنے کمرے سے باہر نکلتے ہیں' اور اس میں کوئی زندگی کے آثار باقی نہیں رہتے تو کیا اس کمرے کا وجود باقی نہیں رہتا؟ غالباً رہتا ہے' کیونکہ جب ہم لوٹتے ہیں تو وہ کمرہ وہیں موجود ہوتا ہے۔ یہ معلوم کر کے ہمیں تسکین ہوتی ہے کہ مس بے سنگیے۔ جو ناول اور فلسفیانہ رسالے لکھ کر اپنا دل بہلاتی ہیں' یہ مانتی ہیں کہ جب وہ اپنے کمرے میں داخل ہوتی ہیں تو اسے تخلیق نہیں کرتیں۔ فلسفہ مذہب عورتوں کو خوب فریب دیتا ہے لیکن مردوں نے بھی فلسفہ علم سے دھوکا کھایا ہے۔

"اعتباری" اور "معروضی" ان لفظوں کا مطلب کیا ہے؟ شاید عینی فلسفہ کا کھیل ان الفاظ کی تعریف نہ کرنے سے ہی کامیاب ہو سکتا ہے۔ ہم عینی فلسفی کی بات مان کر دنیائے اعیان (جسے وہ صحیح سمجھتا ہے) اور اس دنیا میں تمیز کریں' جو ہمارے لئے حقیقت رکھتی ہیں' لیکن اس کے لئے نہیں۔ اعتباری دنیا سراسر خیالات اور اعیان پر مشتمل ہو گی اور باقی سب کچھ معروضی ہو گا۔ لیکن یہاں ہمیں ایک مشکل کا سامنا کرنا پڑے گا' کیونکہ اس معروضی دنیا میں مشاہدہ کرنے والے کا جسم بھی شامل ہے' جس میں اس کی آنکھیں' زبان' ناک' کان اور انگلیوں کے سرے بھی شامل ہوں گے۔ اس کے حواس بھی اس کی ٹانگوں کی طرح معروضی دنیا کا ایک حصہ ہیں اور اس کی ٹانگیں بھی یقیناً اس دنیا کا حصہ ہیں جیسے کہ وہ زمین' جس پر وہ کھڑا ہوتا ہے۔ ایک دفعہ ہم یہ مان لیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ احساسات معروضی حالات سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس بات کی ہم یوں وضاحت کریں گے :۔

رنگ کیونکر پیدا ہوتے ہیں؟ رنگوں کے احساس کے تین اسباب ہیں : اول ہمارے احساس کے خارجی سبب کی مادی اور کیمیاوی ترکیب (ہم اس خارجی سبب کے وجود کے لئے دلائل پہلے دے آئے ہیں) دوم۔ روشنی کی مقدار اور قسم' جس میں اس کے ماخذ کی کیمیاوی ترکیب اور لہروں کی شرح اور حجم بھی شامل ہے۔ سوم۔ دیکھنے والے کی آنکھیں۔ اعصاب بینائی اور دماغ کے مراکز بینائی' ان میں سے کوئی چیز بھی "خارجی" نہیں اور غالباً ان آلات کے ذریعے جو دوسری سائنسوں کے آلات سے زیادہ نازک نہیں ہوں گے' ہم اپنا پردہ چشم' اعصاب بینائی اور دماغ کے مراکز بینائی دیکھ سکتے ہیں۔ یہ سب حالات خارجی دنیا کے حصے ہیں' شعور یا خیال کے حصے نہیں ہیں۔

روشنی کے ان تین اسباب سے معروضی حالات کی ترکیب ہوتی ہے، جن میں جسم، عصبہ اور حس شامل ہیں۔ ان میں سے کسی سبب کی تبدیلی سے رنگ کا احساس تبدیل ہو جاتا ہے۔ ہم کیمیاوی ترکیب سے کسی چیز کا رنگ سرخ کر سکتے ہیں۔ ہم مصنوعی روشنی سے نیلے کپڑوں کا رنگ سیاہ کر سکتے ہیں اور ہم آنکھوں کی پتلی دبا کے سرخ چھوٹے ستارے دیکھ سکتے ہیں۔ مختلف رنگ نتیجہ ہیں مختلف معروضی حالات کا۔ یہ کسی چیز کی مستقل صفت نہیں ہیں اور نہ یہ مشاہدہ کرنے والے کی تخلیق ہیں۔ یہی فلسفی صحیح کہتا ہے کہ کوئی درخت سبز نہیں ہوتا جب تک کوئی اسے دیکھنے والا نہ ہو، لیکن وہ یہ غلط فرض کرتا ہے کہ مشاہدہ سے درخت کا سبزہ تخلیق ہوتا ہے۔ اگر مشاہدہ سے سبز رنگ پیدا ہوتا ہو تو مشاہدہ کرنے والے کو درخت، بادل، گلاب اور سنہری بال سب کچھ سبز نظر آ سکتا ہے۔ واقعی حقیقت یہ ہے کہ جہاں متضاد تصورات کے درمیان صحت کا فیصلہ کرنا ہو، حقیقت ان تصورات کو وحدت کے رشتہ میں منسلک کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔

رنگوں کے علاوہ یہ بات ریت اور آواز کے بارے میں بھی صحیح ہے۔ آواز بھی معروضی حالات سے پیدا ہوتی ہے۔ خارجی سبب، ہوائی موجیں اور عصب سامعہ، کی حالت اس نیم گرم پانی کی ہے جو ایک ہاتھ کو گرم اور دوسرے ہاتھ کو سرد محسوس ہوتا ہے حرارت حساس اعصاب اور مادی حالات کا مرکب ہے۔ اور چونکہ ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ سے زیادہ گرم ہے، ہر ہاتھ کے تئیں احساسات مختلف ہوں گے۔ لیکن حالات پانی اور ہاتھ دونوں معروضی ہیں، مشاہدہ کرنے والا انہیں تخلیق نہیں کرتا۔ حقیقی رنگ، حقیقی ریت، حقیقی حرارت اور حقیقی آواز کیا ہے؟ کوئی شخص وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ ہر انسان کے حواس حالت کی نوعیت بنانے میں شرکت کرتے ہیں اور ہر شخص کے حواس مختلف شہادت دیتے ہیں۔ زندگی کے مقاصد کے لئے یہ کافی ہے کہ ہم ان مشاہدات کو "حقیقی" سمجھیں، جن کے متعلق مختلف لوگ ایک سی شہادت دیں۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ عناصر جن کے بارے میں مختلف لوگ متضاد شہادت دیں، معروضی عناصر ہیں، جو مختلف شخصیتوں کی ساخت سے مشتق ہیں۔ حقیقت اجتماعی طور پر مربوط احساس ہے۔

ہم نے زمان اور مکان کے مسائل کو آخر تک کے لئے اس لئے ملتوی کر رکھا ہے کہ ان مسائل کے سلسلے میں اس قدر شدید اختلاف ہے کہ وائٹ ہیڈ اور آئن سٹائن جیسے سائنس دان کانٹ کے آگے ہتھیار ڈال چکے ہیں۔ مکان بحیثیت فاصلہ کی پیمائش کے، کس حد تک اتفاقی حیثیت رکھتا ہے، کیونکہ فاصلہ اور مقام کی قسمیں دونوں ہم سے اتفاقی تعلق

رکھتے ہیں۔ لیکن مکان چونکہ حرکت کی تمام ممکن سمتوں کا مجموعہ ہے' ہمارے وجود سے بے نیاز ہے۔ یہاں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ولیم جیمز نے عینیت کی کافی کامیاب تردید کر دی تھی' جب اس نے نہایت بے اعتنائی سے کہا کہ ہم نسبتوں کا بھی اسی طرح براہ راست مشاہدہ کرتے ہیں جس طرح کسی اور چیز کا۔ اور اگر یہ تردید کافی نہ ہوتی تو کوہلر کے وہ تجربات جو چمپانزی بندروں پر کئے اس تردید کے لئے کافی ہوتے۔ ہم ترکیب عدم مساوات' حرکت اور سکون کا مشاہدہ کرتے ہیں اور جب ہم ایک ساکن پس منظر کے مخالف ایک کیڑے کی حرکت دیکھتے ہیں تو ہم براہ راست زمان و مکان کا مشاہدہ کر رہے ہوتے ہیں۔

وقت حرکت کی اولاد ہے۔ اگر حرکت نہ ہو تو کائنات میں کوئی تبدیلی رونما نہ ہو۔ اگر کوئی تبدیلی نہ ہو تو وقت باقی نہ رہے۔ وقت جو پہلے اور بعد کا احساس ہے' ایک بہاؤ کا احساس ہے' اور "اضافی" حیثیت رکھتا ہے اور صرف اذہان ہی دنیا کو وقت بخش سکتے ہیں۔ لیکن وقت یعنی تبدل یا انقلاب معروضی حیثیت رکھتا ہے اور اگر تمام اذہان ختم ہو جائیں تب بھی یہ جاری رہے گا۔ درخت تب بھی پھوٹے' پھلے پھولے اور مرجھائے گا جبکہ کوئی شخص اس کا مشاہدہ کرنے والا نہیں ہو گا۔ اگر کوئی مشاہدہ کرنے والا شخص بھی باقی نہ رہے تو سمندر کا مد و جزر بدستور قائم رہے گا اور زمینوں کے بڑے بڑے خطے سمندر کی تہہ میں پگھل جائیں گے۔ سمندر بائرن کی سخنوری سے پہلے بھی موجزن تھا اور اس کے آخری شعر کے بعد بھی رواں دواں ہے۔ یہ زمان و مکان کی کائنات ایک بین حقیقت ہے' جو ایک صاحب فہم و فراست کے لئے اسی قدر صحت رکھتی ہے جس قدر کہ کوئی الہیاتی نظریہ۔ اس دنیا کا وجود ہمارے وجود کا سبب' اس کی پابندی اور اس کا سرچشمہ ہے۔ ہمارے ذہن اس دنیا کو وجود عطا نہیں کرتے بلکہ معنی اور اہمیت دیتے ہیں۔ دنیا کی چیزوں کا کوئی مفہوم نہیں' جب تک کہ ہم ان میں مفہوم پیدا نہ کریں۔ شاید اسی لئے یہ دنیا "ناقابل فہم" ہو گئی ہے۔

ہم یہ امید کرتے ہیں کہ فلسفہ کی تحریک میں فلسفہ علم کا وحشت ناک خواب ختم ہو گیا ہے۔ اور زندگی اور موت کے مسائل کا ذکر پھر سنا جائے گا۔ عینیت نے اگرچہ مشاہدہ کی دنیا میں حواس کی اہمیت مسلم کر کے علم کی خدمت سرانجام دی تھی' تاہم اس فلسفہ میں ایک خاص طرح کی معصومیت تھی۔ اگر یہ فلسفی اپنی زندگی کی ترتیب اپنے نظریوں کے مطابق دیتے' اگر وہ اس مفروضہ پر عمل کرتے کہ یہ خارجی دنیا "غیر حقیقی" ہے' تو ہم ان کا اسی طرح احترام کرتے جس طرح ہم صوفیوں کا احترام کرتے ہیں جو زندگی کو اپنی پارسا خود

ذہنوں کے سانچے میں ڈھالتے تھے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ دنیا کے یہ زعماء دنیوی جاہ و جلال کی ہوس ایک حقیقت پسند کی طرح کرتے ہیں۔ جیسا کہ مادام ڈی سٹیل نے کہا تھا کہ گلٹے نے بھی اپنے انکسار کے لمحات میں یہ بات مان لی ہو گی کہ اس نے اپنی بیوی کو اس کا مشاہدہ کر کے تخلیق نہیں کیا تھا۔

جرمنی سے جو کہ پریوں کی کہانیوں کی سرزمین ہے' اس سب سے عظیم کہانی کی ابتدا ہوئی کہ ذہن نے دنیا کی تخلیق کی ہے۔ اور رومانی تحریک نے اس افسانہ کی طرح ڈالی۔ رومانی تحریک' والٹیئر کے عہد کی مادیت' حقیقت پرستی اور تشکک کے خلاف جذبات اور تخیل کی بغاوت تھی۔ یہ ایک احتجاج تھا۔ اس تحقیر انسانی کے خلاف جو کوپرنیکس کے انکشافات سے ہوئی تھی' ڈارون کے نظریہ کے سامنے یہ تحقیر مدہم سے مدہم ہوتی جا رہی ہے اور غالباً بہت جلدی بالکل سرد پڑ جائے گی۔ فرانس کے فلسفہ میں نیٹیت کچھ کم ہی ہے۔ کیونکہ وہاں لوگ منافقت کے بغیر بے باکانہ آرزو کر سکتے ہیں۔ اور وہ یہ نہیں سوچتے کہ غیر فانی بننے کے لئے یہ لازمی ہے۔ کہ دنیا ختم کر دی جائے' کیونکہ دنیا ہمارے وجود سے پہلے بھی قائم تھی۔ اور ہماری موت کے بعد بھی قائم رہے گی۔ جب قدرت یہ سنتی ہے کہ انسان ہی ہر چیز کا پیمانہ ہے تو ہماری خود فریبی پر ہنستی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ انسان اس کے افسانے میں محض ایک فقرہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ فلسفہ کل کی روشنی میں جزو کو دیکھنے کی کوشش کا نام ہے۔ ہمیں اپنی حقیر حیثیت پر قانع رہنا چاہیے۔

عقل اور جبلت

ہم نے اب تک اس حملہ کی مدافعت کی ہے جو کہ عینی فلسفہ نے حواس پر کیا تھا۔ اب اس سے پہلے کہ ہم منطق کو خیرباد کہیں اور زندگی کے مسائل سے الجھیں ہمیں عقل پر تصوف کے حملہ کو روکنا ہے۔ ہیوم نے کہا تھا کہ جب عقل' آدمی کی مخالفت کرتی ہے تو آدمی بھی ضرور عقل کی مخالفت کرنے لگتا ہے۔ اگر عقل آرزو کی تسکین کے لئے منطقی جواز نہ تلاش کر سکے تو آرزو کا عقل کے تسلط کے خلاف بغاوت کرنا قرین قیاس ہے۔ ہماری زندگی میں جو ان امیدوں پر قائم ہے جو عقل سے ہزاروں کوس آگے ہیں' اس بات کا امکان ہو سکتا تھا کہ ہم ایک ایسی ماورائے عقل منطق ایجاد کریں' جو ہمارے خوابوں کے جواز کا تانا بانا بنے گی۔

اور جس طرح ڈیموکریٹس نے عینیت کی طرح ڈالی تھی۔ اسی طرح ایلیا کے متشکک

فلسفی زینو نے تصوف کی راہ صاف کی۔ سقراط سے ایک صدی پہلے زینو نے اپنی "الجھنوں" سے عقل کا ایسا مذاق اڑایا کہ وہ سراسر بے عقلی نظر آنے لگی۔ ایکیلیز۔ کچھوے کے پیچھے بھاگتا ہے' لیکن چونکہ کچھوا اس سے آگے ہے' اس لئے وہ کبھی کچھوے کو نہیں پکڑ سکتا کیونکہ جونہی ایکیلیز اپنے مقام سے اس مقام پر پہنچتا ہے جہاں سے کچھوا چلا تھا' کچھوا تھوڑا سا اور آگے بڑھ جاتا ہے' اور جتنی دیر میں ایکیلیز یہ فاصلہ طے کرتا ہے کچھوا اور آگے بڑھ جاتا ہے اور اسی طرح یہ دوڑ لامتناہی رہتی ہے' حتیٰ کہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ عقل سب کچھ ثابت کر سکتی ہے' جس کا مطلب ہے کہ کچھ نہیں ثابت کر سکتی۔ اسی طرح ایک چلتا ہوا تیر حرکت نہیں کرتا' کیونکہ جب تک کوئی چیز ایک جگہ پر ہے وہ ساکن ہے۔ اڑتا ہوا تیر ایک لمحہ میں ایک ہی جگہ پر ہے' اس لئے وہ اس لمحہ ساکن ہے اور اس لئے وہ اپنی پرواز کے ہر لمحہ میں ساکن ہے۔ اناطول فرانس اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ "استدلال سے ہر چیز ثابت ہو سکتی ہے۔ ایلیا کے زینو نے یہ ثابت کیا ہے کہ اڑتا ہوا تیر ساکن ہے۔ ہم ایسی بات بھی ثابت کر سکتے ہیں جو اس خیال کی ضد ہو لیکن سچ تو یہ ہے کہ ضد کو ثابت کرنا زیادہ مشکل ہے۔"

یونانی اور رومی اپنی لذت پرستی کے لمحات میں بھی رواقی تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ عقل اور آرزو میں تناقض ہے۔ تو انہوں نے خندہ پیشانی سے اپنی مجبوریوں کو قبول کر لیا۔ وہ عقل کی پیروی تو کرتے تھے لیکن اس کے بلند بانگ دعوؤں کو زیر لب تبسم کے ساتھ سنتے تھے۔ لیکن مشرق سے تصوف کی وہ طاقتیں امڈیں' جنہوں نے ہمیشہ انسانی امید سے نئی زندگی حاصل کی تھی' اور یونان میں سرایت کر گئیں۔ اور اس ناتواں اور کمزور حیات عقل پر مسلط ہو گئیں' جو کبھی یونان میں پھلی پھولی تھی۔ کبریائی الہام و وحی نے آکر مظلوموں کی ڈھارس بندھائی اور جب یونان تباہ اور ہر یونانی مفلس ہو گیا' تو عقل مر گئی اور ایمان نے (جو کہ کبھی نہیں مرتا) یونان کے عہد زریں کو ختم کر دیا۔ منطق کیا کیا ثابت کرتی ہے؟ اب یہ بات اہم نہیں رہی۔ خدا نے عجیب و غریب باتیں کہی تھیں۔ اور جتنی زیادہ وہ ناممکن معلوم ہوتی تھیں' ان پر ایمان لانا اتنا ہی زیادہ قابل قدر فعل تھا۔ "ناممکن بات پر یقین لاؤ۔" یہ لاکھوں غلاموں کا نظریہ زندگی بن چکا تھا۔ پندرہ صدیوں تک حقیقت کی تعریف عقل اور حواس کے ذریعے نہیں ہوتی تھی' بلکہ الہامی کتاب کے مطالعہ اور اسقفوں کی تفسیروں کے توسط سے کی جاتی تھی۔

یہ کلیسا کی زبردست غلطی تھی کہ اس نے اہل مدرسہ کو یہ اجازت دے دی کہ وہ

الہام اور وحی کو عقل کے ذریعے ثابت کریں- اس نے یہ کیسے جان لیا کہ یہ کھیل بغیر کسی قسم کی دشواری کے جاری رہے گا- اور کوئی غیر متوقع حادثہ بہترین دماغوں کو عقل پسندی کی طرف راغب نہیں کر دے گا- چنانچہ یہی ہوا- ڈے کارٹ کو عقل سے محبت ہو گئی- سپینوزا نے اس کے لئے فاقے کئے- برونو اس کی خاطر جلا دیا گیا- اور لوگ اپنی نئی محبوبہ کو اس کی مظلومی کی وجہ سے اور بھی احترام کی نظر سے دیکھنے لگے- عقل کی پرستش خود ایک مذہب اور ایک ایمان بن گئی- روشنی کے زمانہ نے اس پر اپنا یہ مستحسن ایمان قائم کیا کہ انسان میں پھلنے پھولنے اور پھیلنے کے لاتعداد اور لامتناہی امکانات موجود ہیں- اور انقلاب فرانس نے عقل کی حسین دیوی کی پرستش کے لئے کئی صنم کدے تعمیر کیے- کوئی ایسی رحمت نہیں تھی جو عقل انسانیت پر نچھاور نہ کر سکتی-

روسو اس صاف شفاف فضا میں ناخوش تھا- اس نے بہت دکھ اٹھائے تھے اس لئے اسے ایمان کی ضرورت تھی- جب عقل نے اس کی تضحیک کی تو وہ اسے ایک مرض سمجھنے لگا- اس نے کہا کہ میں یہ اعلان کرنے کی جرات کرتا ہوں کہ غور و خوض کرنے کی حالت ایک غیر فطری حالت ہے اور فکر کرنے والا حیوان ایک ذلیل حیوان ہے' یونان اور مشرق کے تعلقات کا کھیل پھر کھیلا گیا- زندگی سے تھکے ہوئے انقلاب' دہشت اور شوکت سے سہمے ہوئے انسان ایمان کی طرف پلٹے اور واپسی پر انہوں نے جبلت اور جذبات کی مدد طلب کی- ڈی موسے نے کہا' ہمیں اب بے عقل بن جانا چاہئے- متشکک ہیوم نے علیت' استقرا اور سائنس کو محض مفروضے اور امکان میں تحلیل کر کے دشمن کو غیر شعوری طور پر کمک پہنچائی- کانٹ نے جو ان سب سے زیادہ زیرک مفکر تھا' زینو کے فلسفہ کو دہرایا اور یورپ والوں سے کہا کہ خدا "حریت" عزم اور بقا کے بارے میں جو چاہو یقین کرو' کیونکہ عقل ایک ناقص آلہ ہے' جو اس قابل نہیں کہ اس کی بارگاہ میں مافوق الفطرت قلمروئیں اور ارضی جنتیں قربان کر دی جائیں- شوپنہار نے یہ حقیقت بے نقاب کی کہ عقل- عزم کی غلام ہے- اور فرائیڈ نے ہزاروں مثالیں دے کر عقل کی ثانویت ثابت کی اور یہ دکھایا کہ عقل- محض جسمانی خواہشات کا لباس ہے- نیٹشے نے جبلت کی یہ تعریف کی کہ وہ تمام ذہانتوں سے زیادہ ذہین ہے- برگساں نے عقل کی یہ کہہ کر مذمت کی کہ یہ فطری طور پر مادہ پرست ہے اور اس سینما کی مانند ہے جو اپنے جامد ٹکڑوں میں کھو کر زندگی کے تسلسل اور قلب و نظر کی واردات سے بے خبر ہے- امیلی سے لے کر تخلیقی ارتقا تک یہ تمام زمانہ یعنی روسو- کانٹ- شوپنہار- نیٹشے- برگساں اور ولیم جیمز کا زمانہ عہد خرد کے خلاف رومانی

بغاوت کا زمانہ تھا۔ آج لوٹسے کے خلاف کنفیوشس۔ زینو کے خلاف سقراط اور روسو کے خلاف والٹیئر کی جنگ از سر نو لڑی جانی چاہئے۔

جبلت کیا ہے؟ اگر ہم نفسیات کے تازہ ترین رجحانات کی پیروی کریں تو جبلت کو ایک لایعنی تصور سمجھ کر ٹھکرا دیں گے۔ لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہ ماہرین نفسیات جو جبلت کو ایک ہاتھ سے دھکیلتے اور دوسرے ہاتھ سے ناآموختہ عمل کا نام دے کر سینے سے لگا لیتے ہیں تو ہم پرانی شراب کو کیوں نہ پرانے پیمانے میں بھرا رہنے دیں اور کیوں نہ اپنے چلنے، دوڑنے، کھانے، کھیلنے، لڑنے اور فرار کرنے جنس مخالف سے عشق اور اپنے بچوں سے محبت کرنے کے موروثی میلانات کو جبلت ہی کے نام سے پکاریں۔

"جبلت" ایک مفید تصور ہے۔ جو ہمارے کردار کے ان پہلوؤں کی توجیہہ کرتا ہے، جنہیں ہماری نسل نے فوری ضرورتوں کے بغیر تامل کے پورا کرنے کے لئے پیدا کیا ہے لیکن یہ رجحانات صرف قدیم اور ایک ہی قسم کے حالات پر قابو پانے کے لئے کافی ہیں۔ یہ رجحانات حیوانی اور شکاری زندگی کے پس منظر میں ہویدا ہوئے ہیں اور اگرچہ یہ رجحانات اس وقت ہماری خدمت کرتے ہیں، جب کہ فکر کرنے کا وقت نہیں ہوتا ہمارے لئے وہ قدیمی حالات کو سازگار بناتے ہیں، نہ کہ آج کے حالات کو۔ بچہ سانپ سے ڈر کر بھاگتا ہے، لیکن ایک بھری ہوئی بندوق سے کھیلتا ہے۔ ایک آدمی ایک گہرا مفکر ہو سکتا ہے، لیکن ایک بے مغز گڑیا کو اپنا شریک حیات بنا سکتا ہے۔ مثلاً سقراط نے زینتھیپ سے شادی کی اور گوئٹے نے کرسٹیان سے۔ ہم جبلی طور پر ملیریا اور زرد بخار سے نہیں لیکن بجلی کی کڑک اور تاریکی سے ڈرتے ہیں۔ ہم ان لوگوں پر ترس نہیں کھاتے جو جوہر قابل رکھتے ہیں اور انہیں اس جوہر کے نشوونما کا موقع نہیں ملتا، لیکن ایک مجروح کے رستے ہوئے زخم کو دیکھ کر ہمیں رحم آ جاتا ہے۔ ہم کسی عظیم ناانصافی سے اس قدر متاثر نہیں ہوتے جس قدر کہ تھوڑے سے بہتے ہوئے خون سے، ہم اس ویٹر کے حقارت آمیز رویے کو جسے ٹپ نہ کیا گیا ہو زیادہ محسوس کرتے ہیں۔ لیکن اپنی سستی جہالت اور حماقت کا احساس تمہیں کم ہوتا ہے۔ جبلت غالباً وحشیوں کی شکاری زندگی کے لئے کافی ہو گی۔ لیکن زراعتی زندگی کے لئے کافی نہیں اور جب ہم فطرت کی طرف لوٹنے کی آرزو کرتے ہیں تو ہماری خواہش یہی ہوتی ہے کہ ہم شکاری زندگی کی طرف مراجعت کر جائیں۔ لیکن جب سے تہذیب کی ابتدا ہوئی ہے، جبلت زندگی کے تقاضے پورا کرنے سے قاصر رہی ہے اور اس لئے ہمیں عقل کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

عقل کی ابتدا کس طرح ہوئی؟ شاید جب قطب سے برف کے تودے پگھل کر آئے تو ہوا منجمد ہو گئی۔ زراعت تباہ اور حیوانوں کی لاتعداد اقسام ختم ہو گئیں۔ اور چند حیوانوں نے بھاگ کر خط استوا کے علاقہ میں اس انتظار میں پناہ لی کہ شمال کا غیظ تھم جائے۔ غالباً اس تاریک زمانہ میں جب کہ سردی کے طوفان نے قدیم اور معینہ انداز زندگی کو ختم کر دیا اور جب موروثی طرز کردار نئے ماحول سے سازگار ہونے میں ناکام رہا تو وہ حیوان جن کا جبلی نظام کمل اور لچک سے محروم تھا ختم ہو گئے' کیونکہ وہ بدلے ہوئے ماحول کے پیش نظر اپنے اندر کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکتے تھے۔ اور انسان نے جس کی ساخت میں لچک تھی' آگ جلانے' کھانا پکانے اور کپڑا پہننے کا فن سیکھا اور اس طرح اس طوفان کا مقابلہ کیا۔ اور جنگل اور میدان کے تمام حیوانوں پر تسلط قائم کر لیا۔

ان حالات میں سے عقل پیدا ہوئی اور جیسا کہ گر یہم والس نے کہا ہے کہ عقل بھی ایک خاص حد تک جبلی حیثیت رکھتی ہے۔ ایک نئے ماحول میں ہم جبلی طور پر زیادہ محتاط ہو جاتے ہیں۔ نئے حالات کا ہر عنصر ہم میں سے ایک علیحدہ رجحان کو تحریک دیتا ہے اور اس طرح ہمارا عمل ایک کمل مرکب بن جاتا ہے جو حالات کے کسی قدر کمل مشاہدہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اضطراری عمل ایک خاص عمل ہے' جو ایک خاص تحریک کی بنا پر پیدا ہوتا ہے' جیسے کسی زخم کو چھیڑنے سے ہمیں درد کا احساس ہوتا ہے۔ جبلت ہمارا ایک عمومی عمل ہے جو حالات کے کسی خاص عنصر کی تحریک سے پیدا ہوتا ہے مثلاً جب ہم کسی حسین چہرے کی آرزو کرتے ہیں۔ عقل حالات کے کمل جائزہ پر مبنی ایک کمل عمل ہے۔ اس لئے وہ محبت کو مٹا دیتی ہے۔ اور ممکن ہے ہماری نسل کو ختم کر دے۔ جس طرح احساسات آرزو کے مطابق خیالات کے سانچے میں ڈھلتے ہیں' اس طرح جبلت اور عادت ہزاروں آزمائشوں اور غلطیوں کے بعد معقولیت کا رنگ اختیار کرتی ہے۔ جبلت اور عقل میں "قسم" کا نہیں بلکہ مقدار کا فرق ہے۔ وہ ایک دوسرے کے عناصر بہم پہنچاتے ہیں۔ تدبیر مختلف محرکات کی باہمی کشمکش سے پیدا ہوتا ہے۔ تمیز اور فہم حالات کے عناصر کا تجزیہ کرتا ہے' تاکہ ہم اپنے عمل کو کمل بنا سکیں۔ عقل احساسات کا تجزیہ ہے اور عمل کی ترکیب۔

اس کی کمزوری اس تاخیر سے پیدا ہوتی ہے' جس کی یہ تخلیق ہے۔ بہت سے ہونہار فلسفی ایک ہی مسئلہ کا تجزیہ کرتے کرتے تباہ ہو گئے۔ گریفویلز نے کہا کہ اگر ہم کسی مسئلہ پر بہت دیر تک غور کریں تو ہم کچھ بھی نہ کر پائیں گے۔ اس لئے فرانس کے کسی اشتراکی برگساں کے فلسفہ وجدان کو بہت پسند کرتے تھے۔ برگساں نے خود پر پابندیاں عاید کیں۔ اور

یہ تجویز کیا کہ نتائج اور اعمال کے بعد ہمیں لمحات فرصت میں استدلال کرنا چاہئے۔ مزید برآں عقل جب احساسات کا ساتھ چھوڑتی ہے تو وہ شہادت اور ثبوت سے زیادہ خیال کی باریکی کو اہمیت دینے لگتی ہے۔ اس طرح وہ مرقوم تاریخ بن جاتی ہے' جو محض ایک آرزو کی وکیل ہوتی ہے' جیسے کہ آج ایک بچہ بھی یہ کہتا ہے کہ عقل ہماری آرزوؤں کے جواز ڈھونڈنے کا وسیلہ ہے۔ اکثر اوقات ہم کوئی کام اس لئے نہیں کرتے کہ ہمارے پاس اس کام کے واسطے دلائل موجود ہیں' بلکہ ہم دلائل اس لئے تلاش کرتے ہیں کہ ہم کوئی کام کرنا چاہتے ہیں۔ اپنی آرزوؤں اور خواہشوں پر کوئی فلسفہ تعمیر کرنا آسان ترین بات ہے۔ ہمیں احتیاط کرنی چاہئے کہ ہم اشتراکی محض اس لئے نہ بنیں کہ ہم مفلس نہیں یا رجعت پسند' اس لئے کہ ہم اس نظام میں کامیاب ہیں۔ جو فلسفہ ہمیں سب سے زیادہ مسرت بہم پہنچاتا ہے' ہمیں اس کی صحت پر سب سے زیادہ شک کرنا چاہئے۔ جیسا کہ برٹرینڈ رسل نے خوب کہا ہے کہ "ہمیں عزم للیقین کی ضرورت نہیں۔ بلکہ دریافت کرنے کی خواہش کی ضرورت ہے۔ جو کہ عزم للیقین کی ضد ہے۔"

اور پھر عقل ہمیں تشکک سطحیت اور بے مقصد زندگی کی طرف بھی لے جا سکتی ہے۔ ہر دلیل اپنا تضاد خود پیدا کرتی ہے۔ اسی حمیت کے ساتھ جس طرح کہ دوسرا قانون حرکت کام کرتا ہے۔ اناطول فرانس نے بروسون سے کہا "یہ بات صحیح ہے لیکن اس کا الٹا بھی صحیح ہے" اور وہ صوفی بارز کا ایک قول دہراتا ہے کہ دلیل اور لفظوں کی شعبدہ بازی میں یہ فرق ہے کہ موخرالذکر کا ترجمہ نہیں کیا جا سکتا۔

ہاں۔ عقل ایک نامکمل آلہ ہے۔ علم طلب یا انسانی آنکھ کی طرح ہم اس کی فطری کوتاہیوں کے باوجود اس سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرتے ہیں۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ کچھ کام عقل سے زیادہ۔ جبلت سے بہتر ہو سکتے ہیں۔ شاید حکمت اسی میں مضمر ہو کہ کلوپیٹرا کے حضور میں انٹنی کی طرح آرزو کی آگ جلائی جائے نہ کہ سیزر کی طرح سوچا جائے۔ محبت کرنا اور ناکام رہنا شاید اچھا سوچنے سے بہتر حالت ہو۔ یہ کیوں بہتر ہے؟ اور کیا یہ اس لئے ہے کہ جبلت قابل اعتماد ہے۔ یا کسی صوفیانہ وجدان نے ہمیں یہ حکمت سکھائی ہے۔ نہیں تجربہ نے یعنی احساسات نے ہم پر یہ واضح کیا ہے کہ سرمستی کا ایک لمحہ استدلال کے ایک برس سے بہتر ہے۔

ہم استدلال اس لئے نہیں کرتے کہ ہم استدلال کرنا چاہتے ہیں بلکہ اس لئے کہ ہمیں ایسا کرنا پڑتا ہے۔ ہمارا زمانہ اتنا متحرک ہے کہ اس میں جبلی آرزوؤں کے بل پر جینا محال

ہے۔ اب بھی شاید زندگی کے قدیم راستوں میں جبلت کام آتی ہو۔ مثلاً ماستا۔ زراعت اور گھریلو زندگی میں۔ لیکن یہاں بھی عقل کا دخل ہے۔ کیونکہ ضبط تولید ماستا پر پابندیاں عاید کرتی ہے۔ اور عورت کو گھر سے نکل کر صنعتی دنیا میں شرکت کرنا پڑتی ہے اور ہر کھیتی اب دلالوں' دور دراز کی منڈیوں اور چالاک سرمایہ داروں کے ساتھ منسلک ہے۔ ہم شہروں کے لئے جبلی اعمال ہر روز خطرناک تر ہوتے جا رہے ہیں' کیونکہ ہر جبلت کی اپنی انانیت ہے اور وہ ہر حالت میں تسکین چاہتی ہے۔ چاہے' اس سے پوری شخصیت کا حشر کچھ ہی ہو۔ ہر جبلت ہمارا ایک حصہ ہے' جو تخت و تاج کا دعویدار ہے۔ ان حصوں کو مربوط کرنے سے ہی ہم نظم' مرکزیت' عقل اور صحت دماغ حاصل کر سکتے ہیں۔

ذرا جنسی آرزو پر غور کرو۔ یہ ہمیں جنسی تعلقات اور شاید کئی ایک افراد سے جنسی تعلقات پر مائل کرتی ہے۔ اس کی نظر اس کی شدت کی وجہ سے تنگ ہے اور یہ نتائج پر غور نہیں کرتی۔ ہم جبلت کے زور سے شادی رچاتے ہیں' لیکن عقل کے زور سے طلاق دیتے ہیں۔ جبلت کسی لڑکی کو اس سپاہی کی آغوش میں ڈال دے گی' جس سے اس کا پہلے کچھ سابقہ ہو۔ شوہر کو زانی اور ہر بیوی کو فقط ماں بنا دے گی' جو ہمیشہ بار دار نظر آتی ہے۔ یہ دنیا کی آبادی کو اس تیزی سے فراواں کر دے گی' جس طرح عقل اور ایجاد اشیا کو فراواں کرتی ہے اور آدمی کی آخری حالت اس کی پہلی حالت کی طرح زبوں ہو گی۔ جبلت کے زور پر بھوکا آدمی خوب کھاتا ہے اور مر جاتا ہے۔ جبلت کے زور پر چلنا سیکھنے والا بچہ زینے یا چھت کے کنارے پر پہنچ جاتا ہے۔ جبلت کے زور پر ہم چڑیا گھر میں شیر کی گھن گرج سن کر بے جا خوف کھاتے ہیں۔

جبلت کے زور پر ایک بزدل سپاہی جنگ میں ایک خوفناک حیوان کی طرح اپنے ہاتھوں کو خون سے آلودہ کر لیتا ہے' نفرت اور مایوسی سے اندھا ہو جاتا ہے اور ایک ذلیل موت کے لئے تقدیر کو اکساتا ہے اور ایک تربیت یافتہ اور اہل تدبر جرنیل فوج کے پیچھے حفاظت میں کھڑا رہتا ہے۔ اپنی فتح کی داستان لکھتا ہے اور جنگ سے لوٹ کر کل وجد کا مختار بن جاتا ہے۔

اس لئے ہم راہبوں کو ان کے وجدان اور تسلی بخش ایمان اور جنگل کے باشندوں کو ان کی زیرک جبلتوں کے رحم و کرم پر چھوڑتے ہیں۔ کنفیوشس نے کہا کہ انسان۔ حیوان سے صرف تھوڑا سا مختلف ہے اور اکثر انسان اس تھوڑے سے فرق کو ضائع کر دیتے ہیں۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے' ہم احساسات اور عقل کے حامی ہیں اور اس فکر کو زندگی کا

احمقان بنانے اور زندگی میں فکر کا اضافہ کرنے پر مطمئن ہیں۔ ہم غالباً بہت سی غلطیوں کا ارتکاب کریں اور اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ ہم آخر میں اطمینان قلب حاصل کریں فکر کی لذت و لذت ہے، جو عاشق کی سرمستی و سرور کی طرح الم سے بھری پڑی ہے ہم بہت سے سقیموں اور خود فریبیوں کو فکر کی ترقی کے ساتھ ختم کر دیں گے۔ لیکن عقل کے بغیر زندگی بے کار ہے۔ قید خانے میں سقراط بن کے رہنا اس سے بہتر ہے کہ ہم تخت پر کیلیان بن کر رہیں۔ آیئے ہم مل کر فکر کریں۔

حصہ سوم مابعد الطبیعات

باب سوم

مادہ ' زندگی اور ذہن

۱۔ لا ادری مقدمہ

دنیا کی فطرت کیا ہے؟ اس کا مادہ اور ہیئت کیا ہے؟ اس کی ساخت اور عناصر ' اس کے قوانین کیا ہیں؟ مادہ اپنی داخلی فطرت میں اور اپنے وجود کی اصلیت کے لحاظ سے کیا ہے؟ ذہن کیا ہے؟ کیا وہ مادہ سے ہمیشہ کے لئے مستثنیٰ اور اس پر حاوی ہے ' یا وہ مادہ سے فتح اور اس کا غلام ہے؟ کیا وہ خارجی دنیا جس کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں اور وہ داخلی دنیا جسے ہم شعور میں محسوس کرتے ہیں ' "جبریت" کے قانون کے مطابق ہیں ' یا مادہ اور ذہن میں حادثہ اور حریت عزم کا بھی کوئی عنصر موجود ہے؟ یہ وہ سوال ہیں جو بہت کم لوگ پوچھتے ہیں ' لیکن ہر شخص ان کا جواب دیتا ہے۔ یہ سوال ہمارے فلسفوں کے آخری سرچشمے ہیں جن پر ایک مربوط سلسلہ خیال میں ہر چیز کا انحصار ہے اور ان سوالوں کے جواب کا علم ساری دنیا کی وراثت حاصل کرنے سے بہتر سمجھتے ہیں۔

ہمیں ابتدا ہی میں لابدی ناکامی پر قانع ہو جانا چاہئے۔ نہ صرف اس لئے کہ اس قصر فلسفہ کی تسخیر کے لئے ریاضی ' علم الافلاک ' علم الطبیعات ' علم الکیمیا ' میکانکیات ' حیاتیات اور نفسیات سے مکمل واقفیت ضروری ہے ' بلکہ اس لئے کہ یہ بات عقل کے حق میں نہیں جاتی کہ جز و کل کو سمجھ لے۔ وہ مکمل زاویہ نظر جس کی ہم فلسفہ میں جستجو کرتے ہیں ' خیال کے تمام پھندوں اور غیر متعلق راہوں سے بچ کر نکلے گا۔ ذرا سی کسر نفسی اور تھوڑی سی دیانت ہمیں اس بات کا یقین دلانے کے لئے کافی ہے کہ زندگی اور کائنات کا تنوع اور بو قلمونی ' ہمارے محدود اذہان کے احاطہ سے باہر ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ہمہ دان دیوتا ہمارے محبوب نظریوں کا تمسخر اڑاتے ہوں ' اور یہ بہت ممکن ہے کہ ہم میں صرف ایک ہی قابل تحریفات ہو اور وہ یہ کہ ہم اپنی جہالت اور ناتوانی کی تھاہ پا گئے ہوں۔ جتنا زیادہ ہم سیکھتے ہیں ' اتنا ہی ہمیں اپنی کم علمی کا احساس ہوتا ہے۔ ہر ترقی کا قدم ہمیں نئے مسائل اور نئے

شکوک میں الجھاتا ہے۔ سالمہ میں سے ذرہ' ذرہ میں سے برقیہ اور برقیہ میں سے مقادیر برقیات پیدا ہوئی ہیں اور مقادیر برقیات ہمارے اسالیب فکر اور ہمارے قوانین کی زد سے باہر ہے۔ تعلیم مسلمہ قوانین کی شکست اور فن فکر میں ترقی کا نام ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے آلے مادہ سے وابستہ ہیں اور ہمارے حواس ہمارے ذہن سے۔ اس کے معنی ہیں ہمیں جو کہ سطح دریا پر محض نقوش کی حیثیت رکھتے ہیں' سمندر کی گہرائیوں کا علم حاصل کرنا چاہئے۔

اس لئے ہم ان مسائل پر اس پادری کی طرح فکر کریں گے جو ممبر پر پہلی مرتبہ دعائے عشائے ربانی پڑھنے چڑھتا ہے۔ ہم ان مسائل کو پوری طرح حل کر لینے کی بجائے زیادہ سے زیادہ یہی کر سکیں گے کہ ایک دوسرے پر اپنی پوشیدہ آرزوئیں آشکار کر دیں۔ اگر مذہب نے عقیدہ پر حد درجہ اصرار کر کے ہمیں برہم کیا ہے تو ہم احتجاجاً بے باک مادیت کی تبلیغ کریں گے' جس طرح کہ شیلے نے جو کہ خدا اور بقائے روح پر ایمان رکھتا تھا اپنے آپ کو فقط اس لئے "دہریہ" کہا تھا کہ رجعت پسند کلیسا کی آسودگی کو متزلزل کر دے۔ اگر ہم "نرم دل" ہیں تو ہم ایمان کا ساتھ نہ چھوڑیں گے' اور ایک میکانکی اور لاخدا کائنات کو برداشت نہیں کر سکیں گے۔ شاید عمر کے تقاضے کی وجہ سے ہم زیادہ متین ہوتے جا رہے ہیں۔ اور جوانی کی بغاوتیں اب ہمیں غیر ضروری اور انتہا پسند معلوم ہوتی ہیں۔ انہیں قدیم خیالات میں سے حقیقت کی تابانی ہم تک پہنچ رہی ہے جو کبھی غدارانہ اور بے بنیاد معلوم ہوتے تھے۔ اور ہم سائنس اور تاریخ سے ہر اس خبر کا خیر مقدم کرتے ہیں' جو ہمارے پرانے عقاید کی تابانی کو بحال کر دے۔ ہماری طبیعات اور کیمیا' ہماری فلکیات اور حیاتیات' یہ تمام میدان ہیں' جن میں ہم اپنے مفروضوں کی تصدیق اور اپنی امیدوں کی تسکین تلاش کریں گے۔

۲۔ مادیت

جس طرح مادیت وہ فلسفہ ہے جسے صرف وہ ذہن قبول کرتا ہے جس نے مافوق الفطرت اعتقادات کو بالائے طاق رکھ دیا ہو' اس طرح وہ دنیا کا پہلا تصور ہے جو اس قوم میں نمودار ہوتا ہے جس کا سرکاری فلسفہ مذہب ختم ہونے پہ آ جائے۔ سقراط سے پہلے کے مفکر جنہیں بیکن اور نیٹشے سقراط اور افلاطون سے بھی بہتر سمجھتے تھے' سب کے سب مادیت پرست تھے۔ تھیلس' انکسیمانڈر اور ایگو مینیز نے کائنات کی اس طرح توجیہہ کی کہ وہ پانی' آگ

یا ہوا سے پیدا ہوئی ہے۔ اور لیوی پس اور ڈیموکریٹس نے مادہ کو ذرات میں تحلیل کیا، جو جدید طبیعات اور کیمیا کے زیر اثر پارہ پارہ ہو گئے ہیں۔ لیکن اس زمانہ کے آزاد خیال مفکر اس فلسفہ سے مطمئن تھے۔

کئی نسلوں سے یہ مادہ فلسفہ زینو کے تشکک اور انکساگورس کی دوئی کے خلاف قائم رہا۔ لیکن سقراط خارجی دنیا سے پیچھے کی طرف لوٹا۔ اور اس نے وہ "خودی" دریافت کی، جو مادہ سے بہت مختلف تھی۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ اس "خودی" سے موت ناآشنا ہے۔ افلاطون کے نزدیک مادہ "عدم" کے برابر تھا اور وہ ذہن کو باقی سب چیزوں سے زیادہ احترام کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اس نے "خارجی دنیا" کو مشاہدۂ ذہن اور ساخت اور ہیئت کو "اعیان" کے زیر اثر سمجھا۔ اسے یہ محسوس ہوتا تھا کہ یہ ساری دنیا ایک "تخلیقی روح" کی سوچی ہوئی مکمل کائنات کی معمولی سی نقل ہے۔ ماہر حیاتیات، ارسطو نے اس دنیا کو ایک بدلتی ہوئی اور جستجو میں سرگرم دنیا سمجھا اور اسے "خلا اور ذرات" میں تحلیل کیا۔ اس کے نزدیک اس کی اصلیت روح ہے۔ ہر مادہ میں کچھ فعالیت موجود ہے، جو اس وقت تک مطمئن نہیں ہوتی جب تک اپنی تکمیل نہ کرے۔ ہر عین ایک اعلیٰ عین کے لئے مادہ کی حیثیت رکھتا ہے اور حقیقت نشوونما کے اصول سے معمور ہے۔ مادیت پورے طور پر اس قوت کو بیان نہیں کر سکتی۔ ایک سو برس تک ڈیموکریٹس کو لوگوں نے فراموش کئے رکھا۔

اپی کیورس کی شخصیت ڈیموکریٹس کی شخصیت کے بالکل برعکس تھی۔ وہ پلانک، بولر اور کیوری کا پیش رو تھا۔ جنہوں نے "ذرہ" میں حریت اور لاجبریت کا اصول کار فرما دیکھا۔ اور اسے فنا اور تخریب کی علامت پایا۔ ہر چیز آزاد ہے اور ہر چیز فانی ہے۔ لیوکریٹس جو کہ زندگی سے بیزار تھا، لابدی موت کا ہر پیغام سن کر خوش ہوا۔ اسے یہ بات حسین معلوم ہوئی، اگرچہ یہ الم ناک بھی تھی کہ شاعر بھی ذرات سے بنے ہوئے ہیں اور یہ کہ ہر ذی حیات اور ہر ذرہ برباد ہو جائے گا اور ہمیشہ کے لئے اندوہ سے نجات حاصل کر لے گا۔

پھر مسیحیت آئی اور پندرہ سو برس تک فلسفہ کی نظر میں مادہ کی حیثیت بالکل اجنبی کی سی رہی۔ چند ابتدائی مدرسوں کے نزدیک روح ایک عمدہ قسم کی گیس تھا اور خدا کو اس سے بھی زیادہ عمدہ گیس سمجھا گیا تھا۔ ہیگل نے خدا کی تعریف یوں کی کہ وہ ایک گیسوں کا بنا ہوا ذی حیات ہے۔ لیکن مادہ کی حیثیت اکثر و بیشتر فلسفہ کے شیطان کی تھی، جو روح کے لئے ایک قید خانہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ مادہ نے اسکواسٹس کے فلسفہ میں اعلیٰ مقام حاصل کیا۔ مادہ کو صلاحیت کے اعتبار سے "زمان" جتنا قدیم سمجھا گیا، اور وہ

"انفرادیت کا اصول" بن گیا۔ اپنے اعیان اور حدود کے ذریعہ "وحدت" "کثرت" میں تبدیل ہو گئی اور روح کا سمندر الگ الگ ندیوں میں تقسیم ہو گیا اور انہیں لافانی روحوں کا نام دیا گیا۔

بہرحال ڈے کارٹ کے عہد میں مادہ کی حقیقت تسلیم کر لی گئی۔ یہ بجا ہے کہ اس فرانسیسی مفکر نے اسے واحد حقیقت نہیں مانا۔ اور ابتدا میں اس نے "خودی" اور "فکر" کے فلسفہ کے ساتھ "عینیت" کے کواڑ کھول دیئے جو آگے چل کر مادہ کی زیرک دشمن بن گئی۔ لیکن اس نے خارجی دنیا کو ایک مشین سمجھا۔ اس کے لئے سربلند حیوان بھی محض کلیں تھیں۔ سوائے انسان کی روح کے ہر چیز طبیعات کے اصولوں کی پابند تھی۔ حتیٰ کہ ہاضمہ، تنفس، اخراج اور تولید میکانکی اصولوں کے مطابق کام کرتے ہوئے تصور کئے جاتے تھے۔ ڈے کارٹ کے اس سخت فلسفہ کی بدولت مادیت کو ازسرنو جوانی حاصل ہوئی۔

جدید فلسفہ دو بڑی تحریکوں کا مجموعہ ہے، جیسا کہ ہیگل نے کہا ہے دو متضاد تصورات سے مرکب ہے۔ پہلا فلسفہ خارجی دنیا سے شروع ہوتا ہے۔ مادہ طبیعات میکنکس اور علم ریاضی۔ یہ فلسفہ ایک مافوق الفطرت تعبیر کائنات کے خلاف احتجاج کی نمائندگی کرتا ہے، جیسے کہ وہ فرد جو فریبوں سے آزاد ہو گیا ہو۔ وہ کائنات کے مشاہدہ سے حقیقت کے قانون وضع کرتا ہے اور پھر ذہن کو ان معروضی قوانین کے مطابق سمجھتا ہے۔ لازمی طور پر اس کے نتائج میں مادیت، میکانکیت، جبریت اور وہ کردار پرستی جو اس بات پر فخر کرتی ہے کہ وہ مادہ سے شعور تک نہیں پہنچ سکتی، اس کے پیرو ہیں۔ گیلیو، ڈے کارٹ۔ ہابز، نیوٹن، ڈڈرو، ہولباخ۔ لامیٹری، ہیگل، سپنسر، رسل اور واٹسن۔ اس کی مخالف تحریک شعور سے شروع ہوتی ہے۔ اور شعور سے مادہ تک پہنچنا اس کے لئے محال ہے۔ اس کا آغاز داخلی دنیا میں یقین سے ہوتا ہے۔ ذہن نفسیات۔ فلسفہ علم اور فلسفہ اخلاق، یہ فلسفہ ایک مادہ نظریہ حیات کے خلاف احتجاج کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ تمام چیزوں کو حسیات اور خیالات سمجھتا ہے۔ اور مادہ کو ذہن کی کیفیات میں تحلیل کر دیتا ہے۔ اس کے لازمی نتائج ہیں روحانیت، عینیت، قومیت اور حریت عزم، اور اس کے ہیرو ہیں ڈے کارٹ، لا بنز، بارکلے، کانٹ، کلٹے، ہیگل، شوپنہار، نیٹشے، برگساں اور ولیم جیمز۔ اس طرح متضاد فلسفے آپس میں نر اور مادہ کی طرح برسرپیکار ہیں۔ یہ فلسفے مفید اسی وقت ہوں گے جب وہ آپس میں مل جائیں۔

پہلی تحریک سترھویں اور اٹھارویں صدی کے فلسفیانہ خیالات پر حاوی رہی سپنوزا اس نشوونما سے علیحدہ رہا اور اپنے گوشہ میں اس مسئلہ کو سلجھاتا رہا۔ اس نے دنیا کو وحدت

الوجود کا حل عطا کیا۔ مادہ اور ذہن ایک مرکب حقیقت کے داخلی اور خارجی پہلو ہیں۔ اور تمام چیزیں کسی نہ کسی حد تک زندگی میں شریک ہیں۔ یورپ کو اس بات پر اعتبار نہیں آیا۔ اس کے برعکس ہابز نے تمام حقیقت کو مادہ میں تحلیل کر دیا اور ہر اس لفظ یا محاورے کو لایعنی قرار دیا جو مادی حالات کا بیان نہیں۔ گیسنڈی نے نہایت شرافت سے ڈے کارٹ کے "دوئی" کے فلسفہ پر اعتراضات کئے اور یہ کہا کہ فلسفہ نے ابھی تک ڈیموکریٹس کے فلسفہ سے آگے ترقی نہیں کی۔ نیوٹن نے جہاں خلوص نیت سے دینداری کا اعلان کیا اور خروج کی عجیب و غریب تفسیریں لکھیں، وہاں خارجی دنیا کو نہایت سادہ اور مترتب "قوانین حرکت" میں تحلیل کیا۔ جب یہ قوانین فرانس میں پہنچے تو وہاں کے منطق پسند لوگوں کو اس نتیجہ پر پہنچنا ہی پڑا کہ یہ قوانین، سیب کے گرنے سے لے کر، ایک دوشیزہ کی نماز تک پر حاوی ہیں۔ لامیتری نے نہایت بے باکی سے اپنی کتاب "آدمی مشین ہے" لکھی۔ اور یہ بتایا کہ کس طرح مختلف جسمانی حالتیں مثلاً جوش و خروش یا مرض، ذہن پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اور اس طرح ان کی جسمانی ترکیب واضح ہوتی ہے۔ ہولباخ نے آدمی اور مادہ دونوں کو منطقیانہ سخت گیری کے ساتھ اپنے "نظام کائنات" میں ڈھالا۔ اور ہیلوٹیس نے اخلاق اور خوبی کو مادی قوانین میں تحلیل کر دیا۔ ڈڈرو کو یقین نہیں تھا کہ فلسفہ علم "شعور" کو سمجھ سکتا ہے۔ وہ سپینوزا کی پیروی میں یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ مادہ اور ذہن ایک ہی بطن سے پیدا ہوئے ہیں۔ لیکن اس نے اپنے آپ کو اس وقت تک "مادہ پرست" کہنے کا تہیہ کر لیا تھا جب تک دنیا میں ہر بادشاہ اور ہر پادری کی گردن نہیں دبا دی جاتی۔

"مادیت" اور "اشتراکیت" ایک ہی سرچشمہ سے پھوٹتے ہیں۔ یہ ظلم و ستم کے خلاف بغاوت پسند جوانوں کے احتجاج کی دو صورتیں ہیں۔ علم بغاوت ایسا ہے جسے ادھیڑ عمر میں لوگ لپیٹ کر رکھ دیتے ہیں۔ جب فکر پر پختگی اور انکسار کی رہنمائی میں زندگی کی غیر شعوری پیچیدگیاں واضح ہونے لگتی ہیں۔

۳۔ ذہنیت

دوسری تحریک کا پیغمبر بشپ بارکلے تھا۔ بارکلے نے کہا کہ آخر تم مادہ کو احساس اور مشاہدہ کے ذریعہ ہی جانتے ہو۔ اس کی حقیقت مشاہدہ میں مضمر ہے۔ اگر کوئی ذہن اس کا مشاہدہ نہ کرتا تو اس کا وجود ہی نہ ہوتا۔ اور کانٹ نے اس میں اضافہ کیا کہ حسیات کے اندر کوئی فطری ترتیب یا نظم نہیں۔ "مشاہدہ کی وحدت فوق المادہ" اس میں ترتیب پیدا کر

Scanned with CamScanner

کے مربوط خیالات کو جنم دیتی ہے۔ حسیات میں ذہن ہی نظم و ترتیب پیدا کرتا ہے۔ اور جس چیز کا مشاہدہ کیا جاتا ہے وہ کسی حد تک ذہن ہی کی تخلیق ہوتی ہے۔ ترتیب پیدا کرنے والا ذہن مادہ کی منفعل تخلیق کس طرح ہو سکتا ہے' جب کہ جس شکل میں اس کا مشاہدہ کیا جاتا ہے وہ اسے خود پیدا کرتا ہو۔ اور ان میں سب سے زیادہ زیرک فلسفی آرتھر شوپنہار نے کہا کہ تم ٹھیک کہتے ہو۔ وہ حقیقت جس کا ہم براہ راست مشاہدہ کر سکتے ہیں' ہماری "خودی" ہے۔ یہ بات مضحکہ خیز ہے کہ ہم اس "خودی" کو ایک ایسے مادہ میں تحلیل کر دیں' جسے ہم صرف ایک "خیال" کی حیثیت سے اور اپنے غیر مکمل حواس کے توسط سے جانتے ہیں۔ شاید اگر ہم "مادہ" کو "اندر" اور "باہر" سے اسی طرح جان سکتے' جس طرح ہم اپنے آپ کو جانتے ہیں' تو ہم مادہ کی اصلیت میں ایک قوت عزم دیکھتے' جو ہمارے جسموں سے زیادہ ذہنوں کے قریب ہے۔ ان حالات کے پیش نظر منطقیانہ نقطہ نظر سے مادیت کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ بخنر۔ مو شوٹ اور فائر باخ سادہ لوح فلسفی ہیں۔ وہ بے رنگ مادیت جو انیسویں صدی کے وسط میں اس جاہلانہ خود فریبی میں پیش کی گئی ہے' کہ یہ ایک نیا فلسفہ ہے' احمقانہ انداز سے "عزم حیات" کی تردید کرتی ہے اور سب سے پہلے حقائق زندگی کی طبیعاتی اور کیمیاوی قوتوں سے تشریح کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اور پھر ان کو مادہ کے میکانکی اثرات گردانتی ہے۔ لیکن میں یہ کبھی نہیں مان سکتا کہ سادہ ترین کیمیاوی مرکبات کی بھی میکانکی تشریح ہو سکتی ہے' چہ جائیکہ روشنی' حدت' اور بجلی کی خصوصیت کی۔ ان کی تشریح قوت ہی کے تصور سے ہو سکتی ہے۔

نیٹشے کو مادہ کے متعلق یہ نظریہ اور "عزم ملقوت" کا تصور وراثتاً ملا جو کہ شوپنہار کے "عزم" کا سرقہ تھا۔ کوئی دیندار بھی مادیت کے اس قدر خلاف نہ ہو گا جتنا کہ یہ اسقفوں اور دینیات کا تمسخر اڑانے والا فلسفی تھا۔ "میکا نکیت اور مادہ سے مطلق پرہیز۔" یہ تھا اس کا پروگرام۔ کیونکہ یہ دونوں ادنیٰ مراتب کے لئے اظہار کے طریقے ہیں۔ اور ایک حقیر ترین شکل ہے جو عزم ملقوت اختیار کرتی ہے۔ ایک اچھے جرمن کی طرح وہ عینی فلسفہ کو پوری طرح نگل جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مادہ فریب نظر ہے۔ یہ ایک ایسا واہمہ ہے جسے ہم نے حسیات کی تشریح کے لئے تراشا ہے۔ جہاں تک کہ مادی ذراتیت کا تعلق ہے' یہ ایک ایسا فلسفہ ہے جس کی تردید مکمل اور جامع ہے۔ اور عملی دنیا میں کوئی بھی ایسا شخص نہیں جو اسے کچھ اہمیت دے۔ وہ شوپنہار کی طرح اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ یہ مفروضہ پیش کیا جا سکتا ہے کہ تمام میکانکی عمل جہاں تک اس میں کوئی قوت کام کرتی ہے صرف عزم

کی طاقت یا عزم کا اثر ہے۔ ایک ذرہ محض "عزم للقوت" کی ایک حقیر مقدار ہے۔ وہ اثر حیرت انگیز ہے جو "عینیت" نے ان باغیوں پر کیا جو مادیت کی طرف اس لئے مائل تھے کہ وہ مذہبی عقائد کے خلاف ایک ہتھیار کے طور پر استعمال ہو سکتا تھا۔ ہربرٹ اسپنسر نے کہا کہ اگر ہمیں ان دو راہوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے کو کہا جائے کہ ذہنی واقعات کو مادی واقعات کے ذریعہ سمجھو' یا مادی واقعات کو ذہنی واقعات کے ذریعہ تو اول الذکر زیادہ قابل قبول ہو گی۔ اور وہ مایوسی کا دلچسپ مضمر برٹرنڈرسل لکھتا ہے :۔

"یہ عقیدہ کہ فقط مادہ ہی حقیقت ہے' ان متشککانہ دلائل کے بعد جائز نہیں ہو سکتا جو احساس کی طبعی توجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ تاریخی نقطہ نظر سے ہم "مادیت" کو عقائد کا ایک ایسا نظام سمجھتے ہیں' جو روایتی عقاید کی تردید کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ اس طرح ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جوں جوں قدیم عقائد منتشر ہوتے ہیں' مادیت تشکیکیت میں تبدیل ہوتی جاتی ہے۔ آج کل "مادیت" کے سرکردہ ہوا خواہ یا تو "امریکہ کے چند سائنس داند ہیں یا روس کے چند سیاست دان۔ کیونکہ ان دو ملکوں میں روایتی فلسفہ مذہب ابھی تک برسر اقتدار ہے۔"

۲۔ مادہ کیا ہے؟

فلسفہ علم کے ان شکوک سے قطع نظر جن کے متعلق ہم کافی غور و فکر کر چکے ہیں اور اس بات کو مسلم جانتے ہوئے بھی کہ خارجی دنیا جو ہمیں ہمیشہ اپنے وجود کے قطعی ثبوت بہم پہنچاتی رہتی ہے' معروضی طور پر حقیقی ہے۔ آیئے ہم آگے بڑھیں اور اس کی ساخت پر غور کریں۔

ہمارا پہلا انکشاف یہ ہے کہ انیسویں صدی کی طبیعات کا قدیم اور بے جان مادہ ختم ہو چکا ہے۔ ٹینڈل اور ہکسلے کا مادہ ناقابل تحلیل تھا۔ اس کی مثال پکوک پیپرز والے اس موٹے لڑکے کی تھی' کہ اسے جہاں کہیں رکھا جاتا آرام کرتا اور سو جاتا۔ وہ اپنے حجم اور وزن کے رعب داب کے ساتھ اسے تحریک میں لانے کی ہر کوشش کا مقابلہ کرتا یا جب حرکت میں آنے پر مائل ہوتا تو اپنا رخ بدلنے کی ہر کوشش کی مدافعت پر آمادہ کرتا۔ برگساں نے نہایت آسانی سے یہ ثابت کر دیا کہ اتنا بے جان مادہ کبھی حرکت کی توجیہہ نہیں کر سکتا' چہ جائیکہ وہ زندگی اور ذہن کی تخلیق کر سکے۔ لیکن جب برگساں نے یہ فلسفہ پیش کیا' ماہرین طبیعات مادہ کے اس تصور کو ترک کر رہے تھے اور اس میں ایک قوت دریافت

کر چکے تھے۔ مثلاً برق جس کی توجیہہ مادہ اور ذرات کے ذریعہ ہو سکتی تھی۔ وہ کون سی ناقابل بیان قوت تھی جس کا جب مادہ میں اضافہ ہو تو اس کی طاقت کو زیادہ کر دیتی تھی۔ مگر اس کے وزن اور اس کی ابعاد کو جوں کا توں چھوڑ دیتی تھی؟ ایک برقی رو ایک سلکی یا ایک لاسلکی ہوا میں کس طرح گزرتی تھی؟ کیا وہ ایک ایسی چیز تھی جو تار کے ذرات میں سے گزرتی تھی اور چند ذرات دوسرے ذرات سے چھوٹے ہوتے ہیں اور ان برقی لہروں میں جو روشنی کی طرح ہلکی تھیں۔ وہ کون سی چیز تھی جو حرکت کرتی تھی؟ ذرات' اثیر یا کچھ بھی نہیں؟ اور جب ایکس رے میں ایک برقی شعلہ ایسی موجیں بکھیرتا ہوا خلا میں سے گزرتا تھا جو نلکی کی دیواروں میں سما جاتی تھیں' یا کیمیاوی طور پر حساس کی ہوئی دھات کو بدل دیتی تھیں۔ وہ کون سی چیز تھی جو خلا اور دیواروں میں سے گزرتی تھی؟ اور جب مادہ ریڈیم کی طرح مکمل طور پر فعال ہو گیا اور ذرات (جنہیں کاٹا نہیں جا سکتا) لاانتہائی طور پر قابل تقسیم نظر آئے تو ہر ذرہ برقی لہروں کا ایک نظام بن گیا' جو ایک دوسری برقی لہر کے گرد گھومتا تھا۔ مادہ نے کس طرح اپنا حجم' وزن' طول' عرض' دبازت اور ٹھوس پن کھو دیا اور تقریباً وہ تمام صفات بھی ترک کر دیں جن کی بناء پر اس نے کبھی ہر حقیقت پسند ذہن کا احترام حاصل کر لیا تھا۔ ٹھوس پن ایک واہمہ تھا؟ کیا یہ ممکن ہے کہ مادہ زندہ ہو؟

مادہ میں اس "قوت" کے آثار پہلے ہی موجود تھے۔ ارتباط' اشتراک اور تنافر کے واقعات اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے تھے۔ اب یہ بات ممکن نظر آئی کہ یہ حقائق اور ان کے ساتھ برق اور مقناطیس ذراتی طاقت کی صورتیں تھیں' جو ایک ذرہ میں برقی لہروں کی بے تاب حرکت کی وجہ سے پیدا ہوئی تھیں۔ لیکن برقیہ کیا ہے؟ کیا یہ مادہ کا ایک حصہ ہے جو قوت کا اظہار کرتا ہے؟ یا کیا یہ قوت کا پیمانہ ہے جو کسی مادی چیز سے بالکل بے تعلق ہے؟ موخر الذکر راہ ناقابل فہم ہے۔ لے بون کہتا ہے کہ ایک اعلیٰ ذہن کے لئے یہ یقین ممکن ہو گا کہ وہ مادہ کے بغیر قوت کا تصور کر سکے۔ لیکن اس تصور تک ہم نہیں پہنچ سکتے۔ ہم چیزوں کو تبھی سمجھ سکتے ہیں جب انہیں اپنے روزمرہ خیالات کے سانچے میں ڈھال لیں۔ چونکہ ہم قوت کی اصلیت سے واقف نہیں۔ ہم مجبور ہیں کہ اسے مادہ کی ہیئت دیں' تاکہ اس کے متعلق غور و فکر کر سکیں۔ جیسا کہ برگساں نے کہا کہ ہماری ساخت ہی مادیت پسند ہے۔ ہم مادے اور کلوں کو استعمال کرنے کے عادی ہیں اور جب تک ہم ان سے کنارہ کش ہو کر اپنے اندر نہ دیکھیں ہم ہر چیز کو مادی مشین سمجھیں گے۔ پھر بھی اوسٹوالڈ مادہ کو محض قوت کی ایک صورت سمجھتا ہے۔ رتھرفورڈ ذرہ کو سلبی اور ایجابی برق

کے عناصر کہتا ہے۔ لوج یہ سمجھتا ہے کہ برقیہ میں برقی لہر کے علاوہ کوئی مادی مرکز نہیں ہوتا اور لے بون صرف یہ کہتا ہے کہ مادہ قوت کی ایک قسم ہے۔ جے' بی' ایس ہالڈین کہتا ہے کہ موجودہ زمانہ کے چند قابل ترین اشخاص مادہ کو محض برقی حرکت کی ایک خاص قسم سمجھتے ہیں۔ ایڈ کیٹن کہتا ہے کہ مادہ ایجابی اور سلبی پہلوؤں سے مرکب ہے۔ ایک تختہ دراصل خالی جگہ ہے' جس میں چند برقی لہریں بکھری ہوئی ہیں۔ وائٹ ہیڈ کا خیال ہے کہ کمیت کے تصور کو بحیثیت ایک مستقل صفت کے جو اہم مقام حاصل تھا وہ اب اسے کھو رہا ہے۔ کیت اب قوت کی اس مقدار کا نام ہے۔ جسے ہم اس کے چند قوی اثرات کے تعلق سے دیکھتے ہیں۔

کیا ماہرین طبیعات کے اس اعلان سے زیادہ کوئی چیز ناقابل فہم ہو سکتی ہے کہ مادہ بحیثیت ایک مکانی مادہ کے وجود نہیں رکھتا؟ ہمیں بتایا گیا ہے کہ برقیوں میں مادہ کی کوئی صفت موجود نہیں۔ وہ نہ ٹھوس ہیں نہ رقیق اور نہ گیس کے بنے ہوئے؟ زمان میں کیت ہے نہ ہیئت۔ اور ریڈیائی بجلی میں ان کے تجزیہ سے جدید سائنس کے اس عزیز ترین عقیدہ کو مشتبہ نظر سے دیکھا جانے لگا کہ مادہ ناقابل تحلیل ہے۔ دیکھیں ایک ماہر طبیعات کا اس کے متعلق کیا خیال ہے :۔

ذرات کے عناصر جو الگ الگ ہو جاتے ہیں برباد ہو کے رہتے ہیں۔ وہ مادے کی ہر صفت کو کھو دیتے ہیں' جن میں سب سے بنیادی صفت وزن کی ہوتی ہے۔ پیمانہ اس کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ کوئی چیز انہیں مادہ کی حالت پر دوبارہ نہیں لا سکتی۔ وہ "اثیر" کی وسعتوں میں کھو گئے ہیں۔ حدت' بجلی' روشنی وغیرہ' مادے کے وہ آخری مراحل ہیں' جن کے بعد وہ اثیر میں غائب ہو جاتا ہے وہ مادہ جو تقسیم ہو جاتا ہے۔ مختلف مراحل عبور کرنے کے بعد بتدریج اپنی مادی صفات کھو دیتا ہے' حتیٰ کہ وہ اس غیر قابل ادراک اثیر میں غائب ہو جاتا ہے' جس سے وہ پیدا ہوا تھا۔

اثیر؟ لیکن یہ اثیر کیا ہے؟ کوئی نہیں جانتا۔ اس کے متعلق لارڈ سالسبری نے کہا کہ اثیر محض لہروں کے زیرو بم کا بیان ہے۔ یہ ایک افسانہ ہے جس کے پردے میں جدید سائنس کی جہالت چھپ جاتی ہے۔ یہ اسی طرح ناقابل فہم ہے' جس طرح کہ بھوت اور روح۔ آئن سٹائن نے قوت ثقل کی نئی تعبیر کر کے اثیر کو معزول کر دیا تھا' لیکن حال ہی میں اس نے اسے محدود طاقت کے ساتھ بحال کر دیا ہے' جب کبھی کوئی ماہر طبیعات کسی الجھن میں مبتلا ہوتا ہے تو وہ جواب دیتا ہے "اثیر۔" پروفیسر ایڈنگٹن کہتا ہے کہ اثیر مادہ کی

کوئی قسم نہیں۔ وہ غیر مادی ہے۔ یعنی وہ غیر مادی چیز جو چند حیرت انگیز تبدیلیوں سے اپنے آپ کو مادہ میں تبدیل کر لیتی ہے۔ وہ چیز جو بغیر ابعاد یا وزن کے ہے اور چند اجزا کو بد مکان میں مادہ کی صورت اختیار کرتی ہے۔ کیا یہ فلسفہ مذہب کی بحالی ہے یا نئی مسیحی سائنس ہے یا یہ روحانی تحقیق کی ایک شکل ہے؟ جس وقت کہ نفسیات ہر تدبیر سے یہی کوشش رہی ہے کہ شعور سے نجات حاصل کرے اور ذہن کو مادہ میں تحلیل کر دے، طبیعات افسوس کے ساتھ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ مادہ کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ نیوٹن نے کہا تھا، طبیعات مجھے مابعد الطبیعات سے بچانا۔" لیکن افسوس کے اب یہ ممکن نہیں۔

برٹرینڈرسل کہتا ہے کہ طبیعات اس منزل پر پہنچ رہی ہے جب وہ مکمل ہو جائے گی۔ شواہد اس کے بالکل برعکس ہیں۔ ہنری پوان کارے کے قول کے مطابق جدید طبیعات انتشار کی حالت میں ہے۔ وہ اپنی بنیاد از سرنو استوار کر رہی ہے اور یہ نہیں جانتی کہ وہ کہاں ہے۔ پچھلے بیس سالوں میں طبیعات کے مادے اور حرکت کے بارے میں تصورات بالکل بدل گئے ہیں۔ مادام کیوری، رتھرفورڈ سوڈی، آئن شٹائن اور منکوسکی کی تحقیقات نے نیوٹن کی طبیعات کے کلاسیکی خیالات کا بالکل خاتمہ کر دیا ہے۔ لیپلس کو نیوٹن پر رشک تھا کہ اس نے دنیا کا ایک نظام دریافت کر لیا ہے اور اسے اس بات کا دکھ تھا کہ دنیا کبھی کی اوپر تلے ہو چکی، ثقل اب "کشش" کی ایک صورت نہیں رہی۔ اور نظریہ اضافیت نے حرکت کے قانون ہر طرف سے بدل ڈالے ہیں۔ کبھی فلسفہ "سایوں" اور "خیالات" سے شغف رکھتا تھا۔ اور سائنس حقیقت اور واقعیت سے دلچسپی رکھتی تھی۔ اب طبیعات نظریوں کا ایک انبوہ ہے۔ اور سائنس کی دنیا میں "ذرات" کا تصور ختم ہو چکا ہے۔ فلسفہ کو بالائے طاق رکھا جاتا۔ (کچھ لوگ یہ پیش گوئی کرتے ہیں کہ وہ پچاس سال کے اندر مر جائے گا) تو سائنس ہمارے مسائل حل کرتی، اب جبکہ ایک عام آدمی سائنس اور سائنس دانوں پر پورا یقین رکھنے لگا ہے ہمیں یہ نہایت انکسار بتایا گیا ہے کہ سائینٹفک تحقیق ہمیں چیزوں کی اصلیت کا علم نہیں دے سکتی۔ اس کی بجائے ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ ایک گھڑی اس رفتار کے مطابق تیز چلتی ہے، جس کے ساتھ اسے مکان میں سفر کرنا پڑے۔ اور یہ کہ ایک پیمانہ جب زمین کی حرکت کے رخ پر زاویہ قائمہ بناتا ہے تو وہ لمبا ہو جاتا ہے۔ ہمیں ان ناقابل فہم فارمولوں کے سامنے جن کی جگہ قدیم طبیعات کی صفائی اور وضاحت نے لے لی ہے، انکسار سے کام لینا چاہئے۔ شاید یہ فارمولے صحیح ہوں۔ بہرحال انسان اس سائنس کی صحت پر شک کرتا ہے، جو روز بروز مشکل تر ہوتی جا رہی ہے، اور ہر نیا دن

گزشتہ دن کی تردید کرتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ پہلے ہمارے سامنے "ذرات" پیش کرتا ہے اور اس کے بعد برقیات اور پھر مقادیر برقیات اور بالآخر مادی دنیا کی ایک مقدس تصویر جو برقی لہروں سے "اعجاز" بنی ہے اور جس کا کوئی مادہ مرکز نہیں ہے۔ صرف سپنگلر ہی میں یہ کہنے کی جرات ہے کہ "ذرات کا ہر تصور ایک افسانہ ہے اور تجربہ نہیں ہے۔"

ہمیں جہاں کہیں بھی دینیات نظر آئے اس سے دامن بچا کے رکھنا چاہئے' خواہ وہ مکمل سائنسوں ہی سے کیوں نہ تعلق رکھتی ہو۔ شاید باوجود ہماری غیر مستقل ہمہ دانی کے مادہ کا وجود قطعی ہو۔ ہم چاہے سائنس کی نئی دینیات سے شغف رکھیں' لیکن روزمرہ زندگی میں ہم "قوت" کو "مادہ" سے متعلق دیکھتے ہیں۔ وہ چیز جو مکانی اور مرئی ہے۔ وہ چیز جو کہ "ہم" نہیں ہے اور احساسات کا سبب ہے۔

مادہ کیا ہے؟ ہمیں بے باکانہ طور پر یہ اعتراف کر لینا چاہئے کہ ہم ابھی تک نہیں جانتے۔ لیکن ایک بات یقینی ہے کہ یہ نیا مادہ انیسویں صدی کی سائنس کا قدیم مادہ نہیں ہے۔ نیا مادہ لامتناہی قوتوں کی ایک صورت ہے۔ یہ مادہ ارتباط' تنافر' کیمیاوی اور نفوذی اعمال۔ حدت برق چھلکتے نور اور برقیوں کے بے تاب رقص سے زندہ ہے۔ حرکت' قوت اور طاقت ہر جگہ ہے۔ ہم اب کسی چیز کو بے جان نہیں کہہ سکتے۔ فولاد کا ایک ٹکڑہ جو بظاہر بہت جامد ہے دراصل اندرونی اور بیرونی قوتوں (مثلاً حدت دباؤ) وغیرہ کا توازن ہے۔ جب ہم کسی دھات کے ٹکڑے کے قریب اپنا ہاتھ رکھتے ہیں تو اس کے سالمات کی حرکت میں تبدیلی آ جاتی ہے۔ لیوکریٹس کی وہ پرانی تشبیہ اب زیادہ معنی خیز معلوم ہوتی ہے:۔

جب کثیر فوجیں جنگ کا کھیل کھیلتی ہوئی میدانوں میں اترتی ہیں تو ان کی چمک دمک آسمانوں تک پہنچتی ہے اور تمام روئے زمین تانبے کی طرح درخشاں نظر آتا ہے اور زمین سے انسانی انبوہوں کے قدموں کی آوازیں اٹھتی ہیں اور کوہسار اس شور و غوغا سے ہراساں ہو کر اس کی گونج کو ستاروں تک پہنچا دیتے ہیں۔ لیکن اونچے پہاڑ پر پھر بھی کوئی نہ کوئی جگہ ایسی ہو گی جہاں سے یہ چلتے پھرتے آدمی ساکن اور میدانوں میں محض ایک روشنی کا نقطہ معلوم ہوتے ہیں۔"

ہم "مادہ" کا جتنا مطالعہ کرتے ہیں اس کی حیثیت ہماری نظروں میں اتنی ہی کم بنیادی معلوم ہو رہی ہے۔ اور ہم اسے قوت کی خارجی شکل سمجھ رہے ہیں۔ ہمارا جسم زندگی اور ذہن کی خارجی ہیئت ہے۔ ایڈنگٹن کہتا ہے جہاں تک "حرکت" کا تعلق ہے طبیعات نے اس کی اہمیت پہچان لی ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ یہی سب سے بنیادی چیز ہے۔

ایک ہندو ماہر طبیعات سر جگدیش چندربوس نے دھاتوں میں "تھکن" کی کیفیت کو ثابت کر دکھایا کہ دھاتوں میں کچھ عرصہ کے بعد کچھ چیزوں کا ردعمل عام حالت سے بدل جاتا ہے۔ اور اس نے یہ ثابت کیا ہے کہ دھاتیں محرکات، مسکنات اور زہروں سے متاثر ہوتی ہیں۔ یہ تجربات انہی نتائج کے ساتھ تین براعظموں میں دہرائے گئے ہیں۔ "مادہ کی زندگی" یہ الفاظ بیس برس پہلے بے معنی تھے۔ لیکن آج یہ روزمرہ میں شامل ہو گئے ہیں۔ اب ہم ماہرین طبیعات اور کیمیا کو حیاتیاتی تصورات سے دوچار ہوتے دیکھتے ہیں۔ حیاتیاتی تصورات کا ساری کائنات پر تسلط آج اتنا بعید از امکان نہیں جتنا کہ چند برس پہلے تھا۔ اب ہم مادہ کے ارتقا کا چرچا بھی سنتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ذرہ پیدا ہوتا ہے۔ پھلتا پھولتا ہے، اپنی طاقت کھو دیتا ہے اور مر جاتا ہے۔

قوت کی جدید طبیعات ہمیں مادیت اور روحانیت کے مسئلہ کی از سرنو تشکیل کی دعوت دیتی ہے۔ خارجی دنیا کا کون سا پہلو زیادہ حقیقی ہے۔ مکانی جسے بیس برس گزرے طبیعات نے مادہ کا نام دیا تھا یا وہ حرکت افروز پہلو جسے ہم "قوت" کہتے ہیں؟ اس کا جواب "قوت" ہی ہو سکتا ہے۔ یہی "قوت" "نامعلوم" "ذات" اور "مطلق" ہے۔ کیا یہی قوت بذات خود مکانی چیز ہے؟ ہم ایسا تصور نہیں کر سکتے، جس طرح ہم خیال کو مکانی چیز نہیں سمجھ سکتے۔ "مادہ" کی جان جو زندگی اور خود اختیاری کی صفات سے آراستہ ہے، اور یہ باریک پنہاں قوت جس کے جلوے ہم ہر جگہ دیکھتے ہیں، ہر چیز کی جان ہے۔

لیکن یہ الفاظ "جان" اور "اندر" محض استعارے ہیں۔ اگر ہم انہیں استعارے نہ سمجھیں تو یہ ہمیں فکر کی الجھنوں میں پھنسا دیں گے۔ ہمیں "مادہ" کا اس طرح تصور نہیں کرنا چاہئے کہ یہ "قوت" سے کوئی علیحدہ چیز ہے۔ اور اس طرح اس کے اندر رہتی ہے جس طرح پارہ ۔ ڈیڈالس کے اقسام کے اندر رہتا ہے اور انہیں استحکام اور ظاہری زندگی بخشتا ہے۔ یہ حیاتیاتی عنصر، یہ فعال قوت، کوئی الگ چیز نہیں، جسے مادہ سے الگ کیا جا سکے۔ اس کا وجود مادہ کے وجود کے ساتھ اسی طرح منسلک ہے، جس طرح بدن کا وجود ذہن کے ساتھ قوت اور مادہ ایک ناقابل تحلیل حقیقت کے داخلی اور خارجی مظہر ہیں۔ مادہ پرست ٹھیک کہتا تھا۔ اس نے مادہ کی حقیقت کو تفوق بخشتے ہوئے اس ایمان کا اظہار کیا کہ کائنات کا تسلسل ارتقا کہیں نہیں ٹوٹتا۔ اور یہ کہ مفکر بندروں سے، بندر حیوانات ابتدائی سے اور موخرالذکر بے جان مادہ سے اور بے جان مادہ سادہ ترین ذرات سے پیدا ہوا ہے۔ لیکن ہم اس خیال کو صحیح تبھی مان سکتے ہیں، جب ہم یہ سمجھیں کہ بے جان مادہ کے اندر زندگی کا

ایک اصول کار فرما ہے۔ ایک ایسی طاقت جو اسے ارتقا پر مجبور کر رہی ہے۔ مادہ اور ذہن کے درمیان جو خلیج ہے۔ ہم اس کو ذہن کی تحلیل سے نہیں بلکہ مادہ کو اعلیٰ مرتبہ دے کر عبور کرتے ہیں۔ اس دنیا کی حقیقت وہی ہے جو مادہ پرست کہتا ہے۔ اس کا ہر ذرہ مادہ سے بنا ہوا ہے۔ لیکن مادی دنیا کے ہر ذرہ میں ایک خود اختیار قوت کام کرتی ہے' جو زندگی اور ذہن کی ضامن ہے۔ ہم بے کیف حقائق کے بارے میں وہی کچھ کہہ سکتے ہیں جو ہر۔کلٹس ممتاز مہمانوں کو اپنے مطبخ میں دعوت دیتے ہوئے کہا کرتا تھا "تشریف لائیے کیونکہ یہاں بھی دیوتا بستے ہیں۔"

۵۔ زندگی

ہم نے "روحانیت" اور "مادیت" میں ربط پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک طرف تو ہم نے اس نقطہ نظر کو اپنایا ہے کہ تمام چیزوں کی اصلیت مادہ سے زیادہ ذہن کے قریب ہے۔ اور دوسری طرف ہم نے یہ کہا ہے کہ زندگی اور ذہن مادہ کے ساتھ لازمی اور لابدی طور پر مربوط ہیں اور یہ کہ تمام اعلیٰ اشکال فطرت ادنیٰ اشکال سے پیدا ہوئی ہیں۔ ہم نے پہلے نقطہ نظر کی ماہرین طبیعات کے اقوال کی مدد سے حمایت کی ہے۔ لیکن ہمیں ان مشکلات سے دوچار ہونا ہے جو دوسرے نقطہ نظر کی حمایت سے پیدا ہوتی ہیں۔ آیئے پہلے ہم آخری مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کریں کہ اعلیٰ اور ادنیٰ اشکال فطرت کے درمیان تسلسل کی نوعت کیا ہے؟

اگر اس تسلسل کا مطلب یہ ہے کہ ذی حیات موجودات بے جان موجودات سے پیدا ہوتی ہیں تو حیاتیات کی شہادت اس نظریہ کے خلاف ہے' اس قسم کے ارتقا کی کوئی مثال ہمارے علم میں نہیں ہے۔ "سپنر کے تجربات جو سات برس (۱۸۶۲ - ۶۹ء) تک جاری رہے تھے' اس خیال کی تردید کرتے ہیں کہ ابتدائی حیوانات بے جان مادے سے پیدا ہوتے ہیں اور جدید سائنس مختلف شکلوں میں سرولیم ہاروے کے اس خیال کا اعادہ کرتی ہے' ہر انڈا انڈے سے' ہر خلیہ خلئے سے اور ہر ذی حیات' ذی حیات سے پیدا ہوتا ہے۔ جے ایس ہالڈین کہتا ہے کہ "بے جان مادہ سے ذی حیات کو اخذ کرنے کا قطعاً کوئی امکان نہیں۔" گستاف بونیئر کہتا ہے "ذی حیات کی تخلیق؟ سائنس کی موجودہ حالت میں لمحہ بھر کے لئے کیا یہ امید کی جا سکتی ہے۔ جب کہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کتنی صفات' کتنی وراثت' مستقل کے کتنے امکانات ایک ذی حیات چیز میں موجود ہیں۔"

لیکن اس شعبہ کی ہیئت کے باوجود ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ مشکلیں کسی قدر لاشعوری طور پر بے جان مادے کا ذی حیات موجودات سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ یہ مشکل کسی قدر ر ہو جاتی ہے اگر ہم اسے سادہ ترین ذی حیات اور نہایت پیچیدہ بستہ مادہ کے درمیان خلیج تک ہی محدود رکھیں۔ ترکیبی کیمیاء کوئلے کی اصل سے ۳۰۰۰۰۰ مرکب پیدا کر سکتی ہے۔ کوئی ہٹ دھرم ہی جس نے ابھی غیر ممکن کا ممکن ہوتا نہیں دیکھا' یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہے کہ کیمیا کبھی زندگی نہیں پیدا کر سکتا' جو فطرت کرتی ہے۔ ممکن ہے شاید کسی دن انسان بھی فطرت کے کام کرنا سیکھ لے۔ لیکن جب ایک پودا سورج کی روشنی اور زمین کے کیمیاوی مرکبات کو اپنے رس میں تبدیل کرتا ہے تو یہ بے جان موجودات کی جاندار موجودات میں تبدیل ہونے کی مثال ہے۔ ہاں اس میں ایک ذی حیات کا وجود پہلے لازمی ہے۔ لیکن یہ تبدیلی پھر بھی ایک حقیقی تبدیلی ہے اور اس ناقابل فہم حقیقت کی ضد ہے۔ جس کے ذریعے ذی حیات منتشر ہو کر بے جان بن جاتا ہے۔ بے جان اور جان دار' ارتقا اور انحطاط کے ایک ہی عمل کے دو پہلو ہیں۔ ممکن ہے جیسا کہ فیکنز نے کہا تھا کہ مادہ کسی ذی حیات وجود کی انحطاط یافتہ شکل ہو اور "بے جان" اور "میکانکی" موجودات کسی جمی ہوئی زندگی کے آثار ہوں۔

غالباً کسی زمانہ میں یہ زمین جاندار موجودات کے لئے موزوں نہیں تھی اور غالباً اس پر زندگی نے اس وقت جنم لیا جب زندگی کے لئے سازگار فضا پیدا ہو چکی تھی۔ ہمیں آرنیس کے خیال کی پیروی سے کوئی فائدہ نہیں کہ دور دراز کے ستارے زندگی کا سرچشمہ ہیں۔ کسی مسئلہ کو ملتوی کرنا اس سے دوچار ہونا نہیں۔ آیئے ہم یہ تصور کریں کہ کوئی حادثہ تمام نباتات اور حیوانات کو مٹا دیتا ہے۔ اور پھر یہ تصور کریں کہ ایک لمبے عرصہ کے بعد ایک ایسی آب و ہوا دوبارہ پیدا ہوتی ہے جو آج کل کی طرح معتدل اور مرطوب ہے اور آج کل کے سے تمام طبیعاتی اور کیمیاوی حالات بھی موجود ہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ زمین پھر جراثیم' نباتات اور زندگی کی لاکھوں اشکال پیدا کرے گی؟ ایک مرتبہ ہم ارتقا کے اصول کو تسلیم کر لیں تو ہم اس کی حد بندی نہیں کر سکتے۔ ارتقا کی صف میں شیکسپئر سے لے کر ایک ابتدائی حیوان تک' کوئی جگہ نہیں جہاں ہم رک جائیں۔ اور تسلسل کی جگہ کسی معجزے کا دخل قبول کر لیں۔ جس طرح ہکسلے نے کہا تھا کہ انسان اور بندر کا فرق اتنا زیادہ نہیں جتنا کہ ادنیٰ اور اعلیٰ بندروں کا باہم فرق۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ترکیبی لحمیوں اور بدلو کے درمیان فاصلہ تھوڑا ہے' بہ نسبت اس مسلسل صف کے جو "بدلو" اور کسی خدا

پرست انسان میں تعلق پیدا کرتی ہے۔

مادہ کا یہ نیا تصور کہ وہ "زندہ" ہے۔ "بے جان" اور "ذی حیات" کے درمیان تقابل کو اور مسلسل ارتقا کا تصور باندھنے کی مشکل کو کسی قدر کم کر دیتا ہے۔ زندگی حقیقت کے اس خارجی پہلو کی تخلیق نہیں ہے جو ہمیں وزن' ٹھوس پن اور مکانی صفات دیتا ہے' بلکہ اس داخلی پہلو کی تخلیق ہے جو ہمیں ذرے کی قوت' اثیر کی برقی بے تابی اور خلیہ کی بے قرار توانائی سپرد کرتا ہے۔ انیسویں صدی کی طبیعات اور کیمیا کے سیدھے سادے تصورات نے "بے جان" اور "جان دار" چیزوں کے تفاوت کو قطعی بنا دیا ہے اور سپنسر بھی اگرچہ ارتقا کو مکمل بنانا چاہتا تھا' اس مسئلہ سے پہلو بچانے اور یہ لکھنے پر مجبور ہو گیا ہم یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہیں کہ زندگی اپنی اصلیت میں طبیعاتی اور کیمیاوی عناصر میں تحلیل نہیں ہو سکتی۔" جب طبیعات اور کیمیا زندگی کے تصور اور مادے کو مسلسل سمجھنا سیکھ لیں گی' حقیقت اور ارتقا کی دو متضاد حصوں میں تقسیم ختم ہو جائے گی۔ اور وہ مادہ جس کی حقیقت قوت ہے' اور وہ زندگی جس کی ہیئت مادہ ہے' ان دونوں کا ربط ہمیں وہ مکمل اتحاد اور ہم آہنگی بہم پہنچاتا ہے جس کے بغیر نہ سائنس کو سکون حاصل ہو سکتا ہے نہ فلسفہ کو۔

مادہ پرست کا نظریہ

لیکن اگر "بے جان" مادہ سے زندگی کا پیدا ہونا بعید از قیاس ہے تو وہ چیز جسے ہم "ذہن" کہتے ہیں اس کے فطری ارتقا کا تصور باندھنا کس قدر مشکل ہو گا۔ نیلیشے نے کہا تھا کہ مادہ کا کسی ایسی ذات میں تبدیل ہونا جو فکر و تدبر کی اہلیت رکھتی ہو' ناممکن ہے۔ ہم یہاں بے جان مادہ کے تصور میں وہی مشکلات دیکھتے ہیں جو ارتقا کے تسلسل کو قربان کر کے ہی دور ہو سکتی ہیں۔ روحانیت اور مادیت پھر اپنی ناقابل تردید دلائل پیش کرتی ہیں اور ہمیں دو متضاد نظریوں کے درمیان حیران چھوڑ جاتی ہیں' جو ایک مکمل اور مربوط وحدت کے اجزا بننے سے گریز کرتی ہیں۔ آیئے ہم کچھ دیر ان نیم حقائق کا تجزیہ کریں :۔

مادہ پرست تسلسل کے ثبوت سے ابتدا کرتا ہے۔ بوس کے تجربات مادہ میں ایک خاص قسم کی حساسیت کی شہادت بہم پہنچاتے ہیں۔ شعاع پیما میں نقریہ کی ایک پتلی سلاخ۔ حرارت میں ۱/۱۰۰۰۰۰۰۰ درجہ کے اضافہ سے متاثر ہوتی ہے۔ یقیناً یہ حساسیت اس حساسیت سے بہت مختلف ہے جو جاندار چیزوں میں پائی جاتی ہے۔ یہ ماحول پر قابو پانے کی صلاحیت پیدا نہیں کرتی۔ یہ محض اس راہ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ جس کے ذریعے

قدرت نے مادہ اور ذہن کے درمیان خلیج کو عبور کیا۔

ذہن کے ارتقا میں اگلی منزل پودوں کے ان تاثرات میں نظر آتی ہے جو وہ مقام تعلق، حرارت، نمی اور روشنی سے حاصل کرتے ہیں۔ لیرکز سمجھتا ہے کہ ذہن کی بڑی طاقت اور خصوصیت، سیکھنے اور تجربہ کی مدد سے مختلف طریقوں سے عمل کرنے کی صلاحیت ایک ادنیٰ ذی حیات کی ممیز صفات ہیں۔ بوس ہی نے "برطانوی مجلس ترقی سائنس" کو یہ ثابت کر کے متاثر کیا کہ انسان اور پودوں کے دوران خون کے نظام بہت مشابہ ہیں، اور یہ کہ بہتا ہو رس، محرکات، مسکنات اور زہروں سے تاثر حاصل کرتا ہے۔ ایڈورڈ مینگل نے پودوں کے خلیوں میں مادۂ حیات کے مہین دھاگے دریافت کئے۔ جنہیں اکثر ماہرین نباتات حیوانوں کے عصبی دھاگوں کے مشابہ سمجھتے ہیں۔ کچھ پودے روشنی سے اس قدر متاثر ہوتے ہیں کہ وہ گلستانی گھڑیاں بن گئے ہیں۔ کیڑے کھانے والے پودوں کی پانچ سو اقسام ہیں جن میں سے کچھ کے پاس جیسا کہ ہمیں ڈارون نے بتایا ہے بہت حساس گومڑے ہیں، جو بہت معمولی دباؤ کا اندازہ کر لیتے ہیں۔ ان مقاصد سے جو ذی حیات کے لئے مفید ہیں، سازگار اعمال کی یہ ابتدائی کوشش ہمیں ذہن کے آغاز کا پتہ دیتی ہے۔

حرکت کے ساتھ حساسیت بھی بڑھتی گئی۔ پودوں میں بے جان مادے کو غذا بنانے کی صلاحیت تو ہے مگر وہ حرکت نہیں کر سکتے۔ سوائے اس کے کہ وہ اپنی جڑوں کو زمین میں زور سے دبا سکتے ہیں یا اپنے بوٹوں کو آسمان کی طرف اچھال سکتے ہیں، لیکن انہوں نے اس سادہ زندگی کے لئے بہت سے بامقصد اعمال کی صلاحیتیں قربان کر دیں۔ وہ پودے جنہوں نے حرکت کی حیوان بن گئے اور انہوں نے اس عظیم الشان اور درد ناک نظام عصبی کی طرح ڈالی جو آج معرکہ خیزی اور ضبط کا آلہ بن گیا ہے۔ ادنیٰ حیوانوں میں کوئی نظام عصبی نہیں ہوتا۔ ان میں حساسیت عمومی ہوتی ہے اور بدن کے ہر رگ و ریشہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن ان ادنیٰ اقلیموں میں بھی تخصیص کار شروع ہوتی ہے۔ بعض ابتدائی حیوانات میں خارجی خلیے ایک خاص حساسیت رکھتے ہیں۔ لیکن اندرونی یا تجنیسی خلیے خارجی ماحول سے بے نیاز رہتے ہیں۔ ایک اور منزل اوپر آیئے اور حساسیت کی تخصیص کار بڑھ جاتی ہے۔ جیلی مچھلی میں کچھ عصبی خلیے بیرونی حصے میں پھیلے ہوتے ہیں۔ وہ چند عملی خلیوں سے متعلق ہوتے ہیں۔ یہاں تخصیص کار نے عصبی خلیوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ یہاں ہمیں نظام عصبی کی پہلی شہادت میسر آتی ہے جو کہ ذہن کا آلہ ہے۔

کسی نے اس سوال کا جواب نہیں دیا کہ جسم اور ذہن اگر وہ اتنے ہی مختلف ہیں تو

ایک دوسرے پر کیونکر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔" کیونکہ جب روح' لیوکریٹس نے کہا' اعضا و حرکت میں لاتی ہے یا جسم کو خواب سے ابھارتی ہے یا چہرہ بدل دیتی ہے یہ ہدایت دیتی ہے یا سارے آدمی کو اوپر تلے کر دیتی ہے۔ اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان میں سے کوئی اثر بھی بغیر لمس کے' اور لمس بغیر جسم کے ممکن نہیں تو کیا ہمیں یہ تسلیم نہیں کرنا پڑتا کہ ذہن اور روح کی وہی حقیقت ہے جو بدن کی ہے۔" دیکھو اس کے دو ہزار برس بعد مارک ٹوین کیونکر فلسفی کا روپ بھرتا ہے۔

بوڑھا آدمی (طنزاً) "ذہن کی حقیقت چونکہ روحانی ہے وہ جسمانی اثرات قبول نہیں کر سکتا۔"

جوان آدمی۔ "نہیں!"

بوڑھا آدمی۔ "تو کیا ذہن صحیح رہتا ہے۔ جبکہ جسم نشہ میں بدمست ہو؟"

دماغ کے مجروح ہونے سے جنون پیدا ہو سکتا ہے۔ تکان سے نیند آ جاتی ہے دواؤں' بیماریوں' آکسیجن یا خون کی کمی سے بے ہوشی پیدا ہو سکتی ہے۔ شعور کی بنیاد حواس ہیں۔ ڈرمیل کا لڑکا' جو صرف بینائی کی حس رکھتا تھا' جب کبھی آنکھیں بند کرتا سو جاتا۔ آگہی میں شعور جبلتوں کی کشمکش سے پیدا ہوتا ہے۔ جب کوئی کشمکش نہیں ہوتی' عمل بغیر توجہ کے ہو سکتا ہے۔ شاید شعور ایک ہنگامی مصیبت ہے۔ ایک حیوان جس کی جبلتیں اور حواس اس کی ضروریات کے عین مطابق ہیں' شعور سے ناآشنا ہو گا۔ نیٹشے کا خیال تھا کہ جب انسان ماحول سے حاصل کی ہوئی عادات کو فطرت ثانیہ بنا لے گا' شعور ختم ہو جائے گا۔

جہاں تک "خودی" یا "روح" کا تعلق ہے۔ یہ فقط موروثی صفات اور سیکھے ہوئے اوصاف کے مجموعہ کا نام ہے۔ جب تجربہ بدلتا ہے تو روح بھی بدل جاتی ہے۔ آدمی اپنے بچپن پر ایک اجنبیانہ خارجیت کے ساتھ نظر ڈالتا ہے۔ چند المناک حالات کی شرط ہے اور ایک انسان دو شخصیتوں میں بٹ جاتا ہے۔ تجربہ کا کوئی مرکز' دماغ کے اعصاب کا کوئی حصہ اگر باقی حصوں سے علیحدہ کر دیا جائے تو وہ اپنی الگ ہی مملکت قائم کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ خودی یا روح' وراثت۔ حافظہ اور مقصد کی ایک نازک وحدت ہے جو لافانی سے زیادہ ناتواں ہے۔

فکر عمل کا امکان ہے۔ توجہ ایک تناؤ ہے۔ نفرت ایک گریز ہے۔ اشتہا ایک جستجو ہے۔ جذبہ ایک حرکت ہے۔ خیال عمل کی پہلی منزل ہے۔ ہم اسے خیال اس لئے کہتے ہیں کہ عمل کے کسی اور رجحان نے اسے تکمیل سے پہلے ہی روک دیا تھا۔ تدبر میں جسم ممکن

اعمال جذبوں اور آرزوؤں کی رقابت کے بس میں آ جاتا ہے۔ جیسا کہ جیمز نے بتایا، جذبات خون کے کوائف ہیں جو غدودوں کے رس سے پیدا ہوتے ہیں۔ ایڈرینل کے بغیر ہمیں غصہ نہیں آ سکتا۔ غدود درقیہ کے بغیر ہم احمق بن جاتے ہیں۔ تمام فکر و عمل غذا کا رہین منت ہے، جو خود جسم کی ایک حالت ہے۔ بھوک چند خلیوں کے خالی ہونے کا نام ہے۔ محبت چند خلیوں کے لبریز ہونے کا۔ جنسی تصورات جسمانی بلوغت سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور دنیا کی نصف شاعری خلیوں کے باعث معرض وجود میں آئی ہے۔ ذہن اپنے تمام فریضوں میں جسم کا ایک حصہ ہے۔ وہ اس کی نشوونما کے ساتھ بڑھتا ہے۔ اور اس کے انحطاط کے ساتھ فنا ہو جاتا ہے۔ یہ ہاضمہ، تنفس اور اخراج کی طرح جسم کی دنیا سے متعلق ہے۔ یہ محض بدن کا عظیم ترین وظیفہ ہے۔

۷۔ عینیت پرست کا جواب

عینیت پرست کہتا ہے کہ یہ استدلال شرمناک ہے۔ اس سادہ لوح مادیت سے زیادہ کیا چیز مضحکہ خیز ہو سکتی ہے؟ کیا یہ بات سوچی جا سکتی ہے۔ کہ مادہ اپنی تبدیلیوں کے ذریعے مشاہدے، علم اور تسلط کے لئے اپنے آپ کا رخ کر سکتا ہے؟ ذہن کی ادنیٰ کیفیتیں بھی مادی اصطلاحوں میں ادا نہیں ہو سکتیں۔ مثلاً مادہ کس طرح الم کا احساس کر سکتا ہے؟ انسان ماضی کو یاد کرتے تصور کر سکتا ہے لیکن مادہ کو مستقبل کا تصور کرتے یا شناخت کرتے تصور کرنا محال ہے۔ اگر ذہن دماغ ہے تو حافظہ کی ہر کوتاہی کے لئے دماغ میں ایک کاٹ ہونی چاہئے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ ذہن اور دماغ کے فریضوں میں کمل متوازیت قائم کرنے کی ساری کوششیں ناکام رہی ہے، سوائے اس کے ذہن حاوی اور آقا ہے۔ اور دماغ آلہ اور مشین۔ کیا ہمارے زمانہ کی کوئی اور علمی شکست بدنیاتی نفسیات کی شکست سے بڑھ سکتی ہے؟

لیکن یہ معمولی باتیں ہیں۔ ذرا فکر پر غور کرو۔ یہ صحیح ہے کہ ولیم جیمز نے داخلی مشاہدہ کر کے ہمیں یہ بتایا تھا کہ مجھے "میں سانس لیتا ہوں" کے علاوہ شعور میں کچھ اور نظر نہیں آتا۔ لیکن یہاں "میں" اہم ہے۔ "سانس لیتا ہوں۔" نہیں۔ ہمیں داخلی مشاہدے میں کچھ نظر نہیں آتا۔ کیونکہ ہماری نگاہیں کسی مکانی اور مرئی چیز کو ڈھونڈتی ہیں۔ ہم جو کچھ "دیکھتے" ہیں اسے بیان کرنا مشکل ہے، کیونکہ ہم مرئی تصورات کی جستجو کرتے ہیں۔ اور "دیکھنا" بھی تو ایک مادی فعل ہے۔ لیکن کسی نے خارجی دنیا کے مکانی روابط اور ذہن دنیا

کی لامکانی کے مابین جو مسافت ہے' اسے عبور کرنے کے لئے پہلا قدم بھی نہیں اٹھایا۔ ہم بڑے فاصلوں کے بارے میں بھی اسی طرح سوچ سکتے ہیں' جس طرح کہ چھوٹے فاصلوں کے بارے میں۔ ہمارا ایک میل کا تصور ایک انچ کے تصور سے زیادہ جگہ نہیں روکتا۔ یا اس کے لئے زیادہ کوشش درکار نہیں ہوتی۔ ہم وقت کی طویل مدتوں کے بارے میں اسی طرح سوچتے ہیں' جس طرح کہ ایک لمحہ کی یاد کے متعلق۔ ہم اپنی مرضی کے مطابق تصورات کو بڑھا' گھٹا اور جوڑ سکتے ہیں۔ تجربے میں چاہے وہ کسی طرح آئے ہوں' اور تصور فکر نہیں ہے۔ بہت سے لوگ کبھی کبھی اپنے فکر میں تخیل کا عنصر نہیں پاتے۔ ہمارے تصورات بنیادی نہیں ہیں بلکہ ضمنی حقیقت رکھتے ہیں۔ ایک مثلث ٹوپی اور ابھری ہوئی توند پر ہاتھ نپولین کی سینکڑوں پہلوؤں اور نقطہ ہائے نظر سے نمائندگی کرتے ہیں۔ جس چیز کے بارے میں ہم بار بار سوچیں' اس کے لئے ہمیں کم تخیل درکار ہے۔ تخیل عمل کی تیاری کے طور پر اہم ہے۔ جہاں عمل نہ ہو' فکر کم سے کم تخیل کے ساتھ رواں دواں نظر آتا ہے۔ اس وقت یہ عمل کسی مادی تصور یا استعارے کی حد سے باہر چلا جاتا ہے۔

مادہ پرست کے لئے شعور کا مسئلہ حل کرنا بہت دشوار ہے۔ وہ دیانت کم اور جرات زیادہ استعمال کرتا ہے۔ اور یہ کہہ کر کہ "شعور کا کوئی وجود نہیں" فرض کر لیتا ہے کہ اس نے یہ مسئلہ حل کر لیا ہے۔ اس کا مرتبہ اخلاقی اور ذہنی طور پر اس عینیت پرست کے برابر ہے' جو خارجی دنیا کی حقیقت سے انکار کرتا ہے۔ فلسفی ہمیشہ کسی حقیقت کا انکشاف عام لوگوں کے بعد کرتے ہیں۔ انہیں یہ جاننے میں کہ خارجی دنیا موجود ہے' تین سو برس لگے۔ اور جب نئے حقیقت پسندوں نے شادیانے بجا کر اعلان کیا کہ خارجی دنیا کا وجود کسی قدر ممکن ہے' تو اقلیم فلسفہ حیرت اور تشکک سے گونج اٹھا کہ شاید خارجی دنیا موجود ہے۔ ممکن ہے تین سو برس بعد کردار پرست اور مادہ پرست داخلی دنیا کی حقیقت اور شعور کی حقیقت اور فعالیت دریافت کر لیں۔ اس وقت وہ ایک عام آدمی کے مبلغ علم تک رسائی حاصل کر لیں گے۔

ہکسلے نے اپنی صدقہ دیانت کے ساتھ یہ اعتراف کیا کہ مادیت شعور کی توجیہہ نہیں کر سکتی۔ اور وہ اپنی منطق اور مفروضوں سے مجبور ہو کر یہ کہتی ہے کہ شعور ایک نتیجہ ہے' جو سبب نہیں بن سکتا۔ وہ دماغ اور اعصاب میں ایک بے سود اضافہ ہے' جس طرح چراغ میں حدت یا آگ میں روشنی۔ یہ صحیح ہے کہ ارتقاء میں بہت سے بے سود اعضاء پیدا ہوئے۔ غالباً اس لئے کہ وہ بے ضرر تھے یا کبھی کسی زمانہ میں سودمند تھے۔ مادہ پرست کو

اس خیال کی اجازت نہیں کہ شعور کبھی بھی سودمند یا مضرت رساں تھا' جیسا کہ بہت بار ہے۔ اگر وہ ایک شرمیلا مفکر ہونے کی وجہ سے یہ مان لے گا کہ خود مرکزیت Self Conciousness وبال جان ہے ہم میں سے کون ٹانگوں کے متعلق سوچتے ہوئے ٹھیک طرح چل سکتا ہے؟ اور مادہ پرست کس طرح اس شہادت کو نظر انداز کر سکتا ہے۔ شعور نے زندگی کی طاقت اور لچک کے ساتھ ساتھ نشوونما پائی ہے۔ اور وہ حیوان جن میں شعور بدرجہ اتم موجود ہے' تخلیق پر حاوی ہیں۔

۸۔ ترکیب

وقت آگیا ہے کہ ہم ان رشتوں کو جوڑیں اور ان نیم حقائق کو وحدت میں مربوط کریں۔ لائبنز نے نہایت سادگی سے وحدت پیدا کرنے کے لئے "معینہ ہم آہنگی" کا تصور پیش کیا۔ اس کے نزدیک ذہن اور جسم متوازی تھے لیکن ایک دوسرے سے مستغنی دوش بدوش چلتے ہیں' لیکن ایک دوسرے کو چھو نہیں پاتے' نہ ایک دوسرے کو متاثر کرتے ہیں۔ ان کا ہر لحہ ارتباط' کبریائی رحمت کا ایک اور ثبوت ہے۔ اس نظریہ کا فقط یہی فائدہ ہے کہ یہ اکثر نظریوں سے زیادہ احمقانہ نہیں ہے۔ اس کی حیثیت تقریباً وہی ہے جو فلسفے کے تازہ ترین فیشن "ناجانب دار حقیقت" کی ہے۔ ہمارے "غیر جانب دار وحدت پرستوں" کے لئے (جن میں برٹرینڈ رسل کا فلسفہ سب سے زیادہ قابل قبول ہے) طبیعات نے مادہ کو روابط اور واقعات کا نظام بنا دیا ہے اور نفسیات نے ذہن کو روابط اور واقعات کا نظام بنا دیا ہے اور مشاہدہ ان دو دنیاؤں کا ہنگامی تصادم ہے۔ ان دو قدیم ضدین کا یہ میل بھی خدا ہی عمل میں لایا ہو گا۔ اس "غیر جانب دار حقیقت" کے سمندر میں روابط اور واقعات کے اس مہین گودے میں سے مادہ اور ذہن پیدا ہوتے ہیں۔ جسم اور روح یہ مہین حقیقت بن گئے ہیں۔

ہم تو اسی بات میں یقین رکھتے ہیں کہ خارجی دنیا کے واقعات ہمیں ایک مرئی حقیقت کا پتہ دیتے ہیں' جسے ہم بجا طور پر مادہ کہہ سکتے ہیں۔ اور جو افسوس ناک حد تک ہماری آرزوؤں اور ہمارے احساسات سے مستغنی ہے۔ چونکہ مادہ "بے جان" نہیں "جان دار" ہے؟ ذہن اور مادہ کا مسئلہ غلط مفروضوں کی بنا پر پیدا ہوتا ہے۔ یقیناً مادہ پرستوں کے مادہ کے لئے ذہن بننا مشکل ہے۔ لیکن جن لوگوں نے جدید طبیعات کے ہنگاموں کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ آج کل کی سائنس کا مادہ ذہن کی طرح زندہ اور غیر مرئی ہے۔ اس قسم

کے مادہ سے ذہن کا پیدا ہونا کوئی معجزہ نہیں- لیکن سوال یہ ایک کے دوسرے سے پیدا ہونے کا نہیں ہے- اب یہ سوال اس طرح ادا ہو سکتا ہے کہ ذہن مادے کی ادنیٰ اشکال اعلیٰ اشکال کیونکر بن سکتی ہیں؟

کیونکہ ذہن مادہ نہیں ہے اور مادہ ذہن نہیں ہے- مادہ ذہن حقیقت ہے- ذہن مادہ کے اندر کوئی علیحدہ وجود نہیں ہے- زندگی جسم میں اس طرح نہیں رہتی جس طرح کوئی شخص اپنے مکان میں رہتا ہے- ذہن ایک اسم مجرد ہے- ایک اجتماعی نام ہے- جو ہم زندہ حقیقت کے اعمال کو تب دیتے ہیں جب وہ سوچتی ہے- جس طرح بینائی حقیقت کے اعمال کا نام ہے- جب وہ دیکھتی ہے یا محبت حقیقت کے اعمال کا نام ہے' جب وہ ملکیت یا سپردگی کی طلب رکھتی ہے- ذہن اور مادہ ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں- اس طرح نہیں کہ دو علیحدہ چیزیں ایک دوسرے کو متاثر کرتی ہیں' بلکہ محض اس طرح کہ جسم کا ایک عضو اور وظیفہ (اعصاب' خیال) دوسرے اعضا اور وظائف کو (سینہ تنفس- پیٹ- ہاضمہ- اعضا- حرکت- جنس- تناسل- غدود - رس) کس طرح متاثر کرتا ہے- اور کیونکر ان سے متاثر ہوتا ہے؟ زندہ حقیقت کا نشوونما یافتہ حصہ نظام عصبی کے ترکیبی اعمال سے باقی ماندہ حصوں کو یکجا کرتا اور ان کے اعمال کی رہنمائی کرتا ہے- ذہن کی اعلیٰ شکل ادنیٰ ترین اشکال حیات اور ذرہ کی قوت سے فطری طور پر مماثل ہے- حتیٰ کہ شعور جس کی ہم شکلوں اور خاکوں سے وضاحت نہیں کر سکتے' ارتقاء کے اس اصول کے ماتحت آتا ہے- کیونکہ ہم اسے "بے جان" مادے سے نہیں بلکہ اس بے پناہ قوت سے اخذ کرتے ہیں جو کہ مادہ کی جان ہے-

اگر ہم "فکر" کا ذکر اس طرح کریں کہ وہ جسم کا ایک وظیفہ ہے تو یہ جان لینا چاہئے کہ ہم جسم کو مادہ نہیں سمجھتے بلکہ زندگی سمجھتے ہیں- ایک سادہ ترین خلیہ میں بھی قوت مرکزی حیثیت رکھتی ہے- اور مادی ہیئت (اگر استعارہ سے کام لیں) تو محض ایک خول ہے- زندگی ہیئت کا وظیفہ نہیں' بلکہ ہیئت زندگی کا وظیفہ ہے- مادہ کا وزن اور ٹھوس پن ایٹمی قوت کا اظہار ہے- اور جسم کا ہر عضو اور ہر عصب آرزو کا آلہ ہے- یہ خیال غلط ہے کہ ذہن کی ابتدا احساسات سے ہوتی ہے' جو خود بخود فکر بن جاتے ہیں- اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ آرزو کی قوت ذی حیات موجودات کی جان ہے- خارجی مداخلت سے قطع نظر' آرزو ہمارے مقاصد' میلانات اور اعمال کی ذمہ دار ہے- اور وہ احساسات اور تجربہ کا انتخاب کرتی ہے- تجربہ حقیقت مطلق نہیں ہے؟ کیونکہ اسے ہماری آرزوئیں

انقلاب کرتی ہیں۔ اگر حقیقت مطلق کا تصور لازمی ہے تو وہ قوت ہے جو ذرہ کی منتشر توانائی سے ابھر کر بالغ ذہن کے مربوط اعمال تک پہنچتی ہے۔ وہ بالغ ذہن جو اس کے مقاصد میں وحدت پیدا کرتا ہے۔ اور تمام اجزاء کو کل کے رشتہ میں دیکھتا ہے؟ اس زندہ حقیقت کی قوت تھی۔ یہ جس نے اعصاب اور دماغ کی تشکیل کی۔ اب ہم سوچ سکتے ہیں' کیونکہ ہمارے پاس دماغ ہیں۔ لیکن کبھی زندگی نے دماغ سوچنے کی کوشش میں بنایا تھا۔ اب بھی دماغ کا نشوونما اس طرح ہوتا ہے کہ آرزو سے بہائے ہوئے خیالات کی آزمائشوں میں الجھے۔ زندگی اول ہے اور داخلی حقیقت ہے۔ مادہ زمان میں ہے۔ اور مکان سے جدا نہیں ہو سکتا۔ اس کی حیثیت منطق اور اہمیت میں ثانوی ہے۔ مادہ زندگی کی ہیئت اور مرئیت ہے۔

یہ ہے قوتیت' لیکن موحد قوتیت۔ یہ زندگی کو اساسی حقیقت سمجھ کر قبول کرتی ہے۔ مادہ اس کا ظاہری لباس ہے۔ لیکن یہ برگساں کی طرح یہ تسلیم نہیں کرتی کہ مادہ اور زندگی کبھی علیحدہ بھی ہو سکتے ہیں۔ ہر جگہ یہ دونوں ایک ہیں۔ کوئی ہمیں یہاں تصوف کا طعنہ نہ دے۔ مادے اور ذہن کی حاضر ناظر وحدت اس حقیقت سے زیادہ متصوفانہ یا قابل فہم نہیں کہ ایک ہی انسان میں بامقصد فکر اور بے تاب بدن مل جاتے ہیں۔ زندگی کو بنیادی حیثیت دینا "تصوف" کیونکر بن گیا' جب کہ ہم کسی اور چیز سے زیادہ زندگی کو قریب سے اور باقی سب چیزوں کو زندگی کے توسط سے جانتے ہیں۔

مادی میکا کیت مذہب کے خلاف ایک یورش تھی اور داخلی عینیت لا مذہبی کے خلاف ایک جہاد تھا۔ اگر ہم اپنے خیالات اور اپنے زمانہ سے خوف زدہ نہیں' تو ہم دونوں کو مسترد کر سکتے ہیں۔ اور ذہن اور بدن کی وحدت میں مادیت' روحانیت عینیت' رد نہیں کئے گئے' بلکہ وہ سب ایک رشتہ میں منسلک ہو گئے ہیں۔ مادیت' جہاں تک وہ کائنات کو ارتقا اور نشوونما کی وحدت میں بندھا دیکھتی ہے۔ عینیت جہاں تک وہ معلوم حقیقت کو تجربہ تک محدود رکھتی ہے' روحانیت' کیونکہ وہ حقیقت کو مکان۔ دبازت اور وزن میں تلاش نہیں کرتی بلکہ ایک "فعال قوت" میں جو کہ ایٹم کی زندگی بھی ہے اور صاحب تخلیق کی طاقت اور راز بھی۔" یہ وہ تحریک اور وہ روح ہے جو ہر صاحب فکر' فکر کے تمام موضوعات اور دنیا کی تمام چیزوں میں جاری و ساری ہے۔" سائنس نے اس شاعرانہ وجدان کی تصدیق کر دی ہے۔

ہم نے ایک ایسا فلسفہ وضع کرنے کی کوشش کی ہے' جو جامع ہو' اور دنیا کی متنوع

پیچیدگی پر حاوی ہو۔ یقیناً ہم اس کوشش میں ناکام رہے ہیں اور اپنے مشاہدے اور احساس کو ہم نے زیادہ الجھا دیا ہے۔ سمندر کا ایک قطرہ سمندر کی حقیقت کو کیونکر سمجھ سکتا ہے؟ ہمارا منطق اور ہمارے فلسفیانہ نظام اس سے درماندہ ہیں۔ دریاؤں اور ندیوں، چشموں، قدرتی مناظر اور گمبھیر بادلوں میں بے پناہ زندگی موجزن ہے

باب چہارم

کیا انسان ایک مشین ہے؟

ا۔ تناظر

اب ہم خارجی دنیا سے داخلی دنیا کی طرف آتے ہیں۔ لیکن ہم ذہن کی حقیقت پر نہیں بلکہ اس کے عملی پہلوؤں پر غور کریں گے اور غور و فکر کے اس عمل میں ہم خارجی اور داخلی دنیاؤں کو الگ نہیں کریں گے، کیونکہ جیسا کہ ہم دیکھ آئے ہیں یہ دنیائیں محض خیال میں علیحدہ ہو سکتی ہیں ورنہ درحقیقت مکان اور زمان میں وہ ایک ہیں۔ ہر ایٹم کا ایک زندہ مرکز ہے اور ہر ذہن کی ایک مادی ہیئت۔ بلند ترین ذہن ارتقا کے سلسلہ میں ادنیٰ ایٹم سے متعلق ہے اور ایک کے قانون دوسرے کے قانون بھی ہیں۔ اگر ایٹم ایک کل ہے تو انسان ایک مشین ہے۔

جبریت قدیم ترین فلسفہ ہے، جس طرح زوجیت مظاہر قدیم ترین مذہب ہے۔ سادہ ترین مذہب، ہر چیز میں ایک بے ربط عزم دیکھتا ہے اور ابتدائی فکر اس شفاف عقیدہ کے خلاف اس طرح احتجاج کرتا ہے کہ فرد کائنات کے قانون کے سامنے بے بس ہے۔ ان مختلف ابتدائی مراحل سے ابھر کر فلسفہ اور مذہب شاید ایک ہی مقام اور منزل پر پہنچ جائیں۔ عالمگیر عزم کی بے ربطی شاید کبھی دور ہو جائے اور وہ دنیا کے اٹل قوانین کے مطابق نکل آئے۔ مشرق میں جہاں انسانوں کی زرخیزی زمین کی سہگل انگار پیداوار سے بڑھ گئی ہے اور جہاں روح مصائب کے تلے کچلی گئی ہے اور فرد اجتماع میں گم ہو گیا ہے، عزم میں ابتدائی عقیدہ۔ مذہب اور فلسفہ سے ختم ہو رہا ہے۔ وہاں مذہب اور فلسفہ یہ سمجھتا ہے کہ آرزو کے خاتمے اور قدرت کی طاقتوں کے سامنے سر تسلیم خم کر دینے ہی سے سکون قلب حاصل ہو سکتا ہے اور وہاں کے مفکر اور مذہبی پیشوا تقدیر میں ایک اداس ایمان رکھتے ہیں۔ انسانیت کے اس وسیع سمندر میں فرد کی کوئی قدر و اہمیت نہیں۔ ایک لامتناہی اور المناک ماضی کے پس منظر میں فرد اپنے آپ کو ایک بیکار ذرہ سمجھتا ہے جو عدم سے وجود میں آیا اور جو کچھ دیر بزعم خود تگ و دو کرنے کے بعد بالآخر تاریکی کی طرف یوں کھنچا چلا

تا ہے جیسے کوئی جابر دشمن اسے ایسا کرنے پر مجبور کر رہا ہو۔ عمر خیام نے بھی فرد کی حالت کے متعلق کا یہی اندازہ لگایا تھا اور اس خیال کو اشعار میں یوں ادا کر دیا ہے کہ ہر سرکش نوجوان نے انہیں اپنا درد بنا لیا ہے۔ لیکن فعال اور ترقی پذیر تہذیبوں میں جہاں تدبیر کا چراغ تقدیر کے سامنے روشن ہو کر کائنات پر کسی قدر تسلط پاتا ہے اور دیوتاؤں کے لئے خوبصورت عبادت گاہیں اور فلسفہ کی عالی شان عمارتیں بناتا ہے' فرد اپنی شخصیت کے تخلیقی پہلوؤں پر ایمان رکھتا ہے۔ وہ اپنے اندر خود اختیاری کے شعلہ کو محسوس کرتا ہے اور اولمپس کے دیوتاؤں کو بھی اپنے تصور کے سانچے میں ڈھالتا ہے۔ یونانیوں نے کائنات میں ارتقا کے اصول کو کار فرما دیکھا۔ ہر جگہ دیوتا تھے اور متضاد حقائق کے درمیان ہم آہنگی پیدا ہو جاتی تھی۔ افلاطون اور ارسطو یہ سمجھتے تھے کہ یہ کائنات اس طرح کسی کامل مقصد کی طرف رواں ہے جس طرح عاشق کی نظر کی کشش محبوب کو اپنی طرف کھینچتی ہے لیکن یہ زندہ دل تہذیب جو فتح و دولت کی پیدا کی ہوئی تھی۔ چند دنوں کی مہمان تھی۔ جب سپارٹا نے پریکلیس کے ایتھنز کو تباہ کیا اور سکندر نے تھیس کو تو انسان باقی و لافانی معلوم نہیں ہوتے تھے اور فلسفہ شرقی زینو کے فکر میں اس نتیجہ پر پہنچا۔ وہ نتیجہ جسے سفوکلیس کئی نسلوں پہلے یوں ادا کر چکا تھا کہ خداؤں اور انسانوں کی زندگی ایک تاریک قسمت کے ہاتھ میں ہے۔

تھکی ہوئی تہذیبیں۔ پیرانہ سال انسانوں کی طرح قسمت پر یقین رکھتی ہیں۔ انحطاط کی قوتوں کے سامنے بے بس ہو کر وہ اپنی تکان کو قسمت اور اپنی شکست کو تقدیر کا حسین نام دے کر تسکین حاصل کرتی ہیں۔ حزن و یاس کی اس تاریک مٹی میں سے مسیحیت کا وہ پودا پھوٹا جس کی حیثیت ایک منتشر دنیا میں امید کی آخری کرن کی سی تھی اور نئے مذہب کے قلب میں جو ابھی تاریک خیال رسوم اور عشرتوں سے الجھا نہیں تھا وہ ریاست تھی جس میں اس نے جنم لیا۔ جنت میں ایمان کا ایک اور پہلو زندگی کا خوف اور مستقبل پر بداعتمادی تھی۔ یہ اداس بداعتمادی' غمگین کیلون کے فلسفہ میں کمال پر پہنچ گئی۔ خدا کو مستقبل کا علم تھا۔ اور ہر انسان کے انجام سے واقف تھا۔ ہر روح کی نجات یا عاقبت اس کی پیدائش سے پہلے ہی متعین ہو چکی ہے کیونکہ مستقبل خدا کے علم کو جھٹلانے کی جرات نہیں کر سکتا۔ مسیحیت جس نے مظلوموں کو سکون قلب دینے کا بیڑا اٹھایا تھا کئی فرقوں میں بٹ گئی۔ جن میں بعض کسی ارضی تقدیر سے بھی زیادہ ظالم اور جابر تھے۔

جدید اذہان نے سائنس کے نئے کمال کے ذریعہ اس بے درد مذہب کی پشت پناہی کی۔

گلیلو نے جو سیاروں کی باقاعدہ گردش سے مسحور ہو چکا تھا۔ ہر سائنس کا یہ مقصد متعین
کہ اسے اپنے علم کو ریاضی اور مقدار کے قوانین تک ہی محدود رکھنا چاہئے۔ نیوٹن
شہرت اور میکانکیت میں اس کے کمال نے ہر طالب علم پر جادو کا کام کیا۔ علم الابدان ا
علم نفسیات کے ماہرین خلیہ کی نشوونما اور آرزو کی بیتابی کے لئے میکانکی توجیہیں اور ریاضی
کے اصول تلاش کرنے لگے۔ فلسفہ ریاضی کے نشہ میں [illegible] گیا۔ ڈے کارٹ نے
ابہام سے کام لے کر یہ بتایا کہ تمام دنیا ایک مشین ہے اور سپینوزا نے کائنات کی ترتیب
کے نمونہ پر اپنے خیالات کی تشکیل کی۔ نئی روشنی کے باغیوں کو جنہوں نے اپنے عہد
انسان کے ہاتھوں اور ارادوں کی جگہ لینا شروع کر دی تھی' یہ بات پسند آئی کہ انسان خدا
کی صورت کے مطابق نہیں بنا بلکہ مشینوں کے نمونہ پر بنا ہے۔

"صنعتی انقلاب نے حریت کا قدیم فلسفہ برباد کر دیا۔ سب سے پہلے اس نے ذہن
مشین چلانے کے عمل سے آشنا کیا' اور اسے اس بات پر مجبور کیا کہ وہ اسباب کو میکانکی
سمجھے۔ مزدور جو کارخانہ کی چار دیواری سے خوگر ہو گیا تھا' جب اس نے دیکھا کہ اس کے
گرد دھڑکتی زندگی پہیوں اور آلوں پر گھومتی ہے تو اس نے زرعی زندگی کو فراموش کر د
جس میں بیج زمین میں سے یکایک پھوٹ پڑتے تھے اور ہر کھاد کا خیر مقدم کرتے اور زرخیز
فراوانی سے پیدا ہوتے تھے۔ وہ دنیا جو اگتے پودوں اور ضدی بچوں' شفیق ماؤں اور اولو العزم
باپوں کی دنیا تھی' جدید ذہن کے لئے کلوں کی دنیا بن گئی۔ ان سیاروں سے لے کر جو میکانکی
طور پر سورج کے گرد چکر لگاتے تھے' اس خوردبینی زندگی تک' جو روشنی ایک کرن کی طرف
انبوہ در انبوہ کھنچی آتی تھی' ہر چیز مشین تھی۔ سائنس کو یقین تھا کہ اسے آخر کار کائناتی
تمثیل کا راز معلوم ہو گیا ہے۔ وہ اس مشینری پر حیران تھی' جس نے ہزاروں فریب نظریہ
کئے تھے اور ہزاروں منظر بدلے تھے۔ اس نے احتراماً یہ نتیجہ نکالا کہ صاحب جائداد صحیح
تمثیل نگار ہے اور اس کے تار تمثیل ہیں۔ لیکن صنعتی تہذیب نے شہر بنائے اور شہروں نے
لوگوں کے ہجوم بنائے اور ہجوموں نے افراد کی انفرادیت کو ختم کر دیا۔ ایک بار پھر جدید شہر
میں وہی حالات پیدا ہو گئے جنہوں نے مشرق میں فرد کی شخصی اور انفرادی اہمیت ختم کر دی
تھی اس طرح پھر تقدیر اور یاس کے فلسفہ کی طرح پڑ گئی۔ آبادی کے اس اژدہام میں فرد
محض ایک عدد یا ایک آلہ کار بن گیا۔ ذہن ناپنے اور گننے کا ایک آلہ اور انسان اپنی بنائی
ہوئی کلوں کا ایک جزو بن گیا۔ جمہوریت جس نے انسان کو آزاد کرانے کی ٹھانی تھی' خود
ایک کل بن گئی' جس نے بے ذہن اجتماع کو رائے دہندگی کا حق عطا کیا۔ ان کلوں اور ان

کے خلاف فرد کا احتجاج اسی قدر بے سود تھا جتنا کہ مشرق میں اجتماع کے خلاف فرد کی آواز۔ حتیٰ کہ "قائدین" بھی کلوں کے بے جان اور بے روح اجزا بن گئے' جو اپنے فریب خوردہ پیرووں کی طرح' جنہیں انتخابات میں فقط گنا جاتا تھا' بے حس ہو کر رہ گئے۔

جب غلاموں نے اس مشین کے خلاف بغاوت کی تو اسی فلسفہ کی راہنمائی میں جو کلوں کے تسلط اور غلبہ کو تسلیم کرتا تھا۔ اشتراکیت نے بھی بے باکی سے جبریت اور میکانکی سائنس کی حمایت کی۔ اس نے اپنے پیرووں کو بخنر اور ہیگل۔ سپنسر اور مارکس کی کتابیں پڑھائیں۔ اس فلسفے کے نزدیک نہ صرف دنیا بلکہ تاریخ بھی ایک مشین تھی' جس میں ہر انقلاب کا سبب روٹی کی قیمت تھی اور ایک اچھا ماہر اقتصادیات' جسے حال اور ماضی سے واقفیت ہو' مستقبل کے ہر پیچ و خم کے متعلق پیش گوئی کر سکتا تھا۔ انسان اب وراثت اور ماحول کا بندہ تھا۔ اس کے تمام اعمال موروثی اور مادی اسباب کا نتیجہ تھے جو اس کے اختیار سے باہر تھے۔ وہ محض ایک حیران کن ذی حیات کل تھا۔ اس لئے جب وہ کسی جرم کا مرتکب ہوتا تو حقیقت میں وہ خود بے قصور تھا۔ یہ سماج کی خرابی تھی۔ اگر وہ احمق تھا تو یہ اس کل کا قصور تھا جس نے اسے بناتے ہوئے کوئی پرزہ ٹھیک طرح نہیں جڑا۔ اس وجہ سے اسے رائے دہندگی یا صدر حکومت بننے کے حق سے محروم نہیں کرنا چاہئے۔ دنیا کو ضرورت ہے ایک بڑی اور بہتر مشین کی' ایک قوی مشین کی' جس میں ایک منظم مشین' کروڑوں کلوں کی نگہداشت کرتی ہو' جو میکانکی طور پر صدارتی بٹن دبا دے۔

کسی امارت پسند عہد میں قائدین شاید یہ اجازت دے دیتے کہ مظلوم عوام بس اسی خواب آور فلسفہ کو اپنا سکتے ہیں لیکن. ایک جمہوری صدی میں عظیم ترین مفکر وطن پرستی کے احساس سے مجبور ہو کر عوام کے فلسفے میں شریک ہو گئے۔ قادر مطلق اور حاضر ناظر مشین پر شک کرنا رواج اور مصلحت کے عین خلاف تھا۔ بڑے بڑے ادیبوں نے یہ اعلان کر دیا کہ ہم بھی کلیں ہیں اور ہمارے خیالات لاکھوں صدیوں پہلے ہم میں داخل کر دیئے گئے تھے کہ بروقت ان کا اظہار کر دیا جائے۔ ٹیسن نے نئے دیوتا کو تسلیم کیا اور اس کے اعزاز میں ایک فلسفہ تنقید تیار کیا۔ زولا نے یہ دکھانے کے لئے طویل الٹنے لکھے کہ آباؤ اجداد رکھنے کی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ طامس ہارڈی نے حالات کے مقابلہ میں انسان کی بے بسی دکھائی' اناطول فرانس نے لاثانی حسن کے ساتھ روح کی غلامی اور زندگی کی رائیگانی کا رونا رویا اور ڈانزیو کو ہر جگہ موت' فتح یاب اور خندہ زن نظر آئی۔

غالباً شخصیت کی یہ بے قدری اس خاموش اندوہ کی ایک وجہ ہے جو جدید ذہن کی

درخشانی اور چالاکی کے پیچھے چھپا ہوا ہے۔ جس شخص نے "انسان کیا ہے۔" پڑھی ہے۔ اسے مارک ٹوین کی یاسیت عجیب معلوم نہیں ہوتی کیونکہ یہ ناشاد مزاح نگار پکا جبریت پرست تھا۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ اس کے مذاق ابتدائی سدیم کی گیسوں نے شروع ہی سے متعین کیے ہوئے تھے (یہ بے چاری گیس بھی کن کن گناہوں کی ذمہ دار ٹھہرائی گئی ہے) اور وہ ٹائم سائیر کی بے تاب توانائی کو ایک کاربن مرکب کے ابال سے منسوب کرتا تھا۔ فلسفہ کا ادھورا علم خطرناک ہوتا ہے اور ذہن کو یاسیت کی طرف مائل کرتا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ وہ زندہ دل کل (مارک ٹوین) جس نے "ہیکل بری فن" لکھا۔ اس کے تعلقات اپنی بیوی سے ناخوشگوار تھے۔ لیکن کون عورت اطمینان سے اپنے بستر اور اپنی خوراک میں ایک ایسی کل کو خوشی سے شریک کر سکتی ہے جو اسے محض کل پرزوں کا ایک آلہ سمجھتا ہو، جسے زمانہ کے آغاز میں جوڑا گیا تھا اور جواب بیکار شور و غوغا کے ساتھ کام کر رہا ہو۔ اور اس کا انجام خاموشی اور بے بسی ہو؟

یقیناً ہمارے بچپن کے ایمان کی موت نے ہمیں اداس کر دیا ہے۔ ہر بالغ روح کو یہ دوہرا صدمہ برداشت کرنا پڑتا ہے کہ اس سے بچپن کے ابہیاتی مقاصد اور بعد میں جوانی کے سماجی مقاصد چھن جاتے ہیں۔ اور جوان دل اس ناقابل فہم کائنات کے بوجھ سے گراں تر ہو جاتا ہے۔ لیکن ہماری سطحی زندہ دلی کی تہ میں جو غمناک لے موجود ہے، وہ ہمارے افکار کی میکا نکیت کا نتیجہ ہے۔ یہ لازمی نہیں تھا کہ ہم اس فلسفہ مذہب سے تو کنارا کر لیتے جو وجود کے فطری اسباب کی تضحیک کرتا ہے اور ایک ایسے فلسفہ کی آغوش میں جا گرتے جو زندگی کے تخلیقی پہلوؤں اور ذہن کی خود اختیاری کو نظر انداز کرتا ہے۔ یہ لازمی نہیں تھا کہ جہاں ہم اپنے اس طفلانہ خیال کو ترک کریں کہ ہم ساری دنیا کی تاریخ کا مرکز اور کمال ہیں، وہاں ہم اپنے آپ کو اپنے کارخانوں کی کلوں کے سامنے ذلیل کر دیں اور انہیں افلاطونی اعیان سمجھ کر قبول کر لیں، جن کے اعلیٰ نمونہ پر بے ربط ارتقا نے ہماری روحوں کی تربیت کی ہے۔ یہ لازمی نہیں تھا کہ ہم دنیا کی قوت زندگی کے بے قرار پھیلاؤ یا فکر کی متصل تخلیق میں شرکت کرنے سے انکار کر دیں لیکن جنگ کے ایک ہی محاذ پر شکست کھا کر ہم ہتھیار پھینک کر میدان کو چھوڑ بھاگے۔

کیا یہ ضروری تھا کہ ہم اس طرح مکمل طور پر اعتراف شکست کر لیتے؟ کیا انسانی کردار کی وہی حیثیت ہے جو پہاڑوں کے پھٹنے۔ ہوا کے سیلاب یا سمندر کے مدو جزر کی ہے؟ کیا ماں کی مامتا۔ جوانوں کی جنسی ہوس یا محبت کی خاموش درد مندی محض کیمیاوی عناصر اور

طبیعاتی طاقت کی میکانکی تقسیم ہے؟ کیا زندگی کی زرخیز فراوانی محض فریب نظر ہے؟ کیا کمال کی آرزو ایک اندھی تلاش ہے اور عزم کی حقیقت ایک خواب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی؟

کیا انسان واقعی ایک مشین ہے؟

۲۔ میکانکیت

آیئے ذرا ہم ایک سادہ مشین کی حرکت پر غور کریں۔ مثلاً ایک کھلونے کی موٹر کار جو اس وقت تک تو برابر چلتی رہتی ہے جب تک اس کا سپرنگ بھرا ہوا ہو۔ اس کے اوپر ایک ربڑ کا مربع ٹکڑا لگا ہوتا ہے۔ ہم اس کھلونے کو کسی دیوار سے کس قدر دور ایک ہموار زمین پر چھوڑ دیتے ہیں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ دیوار' زمین اور کھولنے کی نسبتیں ریاضی اور میکانکیت کے اصولوں کے مکمل طور پر مطابق ہیں۔ ان حالات میں کار' دیوار سے اسی راہ پر مڑے گی جس راہ سے گئی تھی۔ فکری نقطہ نظر سے وہ بار بار یہی کچھ کرے گی۔ ہمیشہ دیوار کے مخالف سیدھی راہ پر یہاں تک کہ اس کی مصنوعی طاقت بالکل خرچ ہو جائے گی۔ یہ میکانکی عمل کی ایک مثال ہے۔

اب ایک مستطیل گلاس میں پانی بھرو۔ اس کے مرکز میں ایک شیشے کی دیوار کھڑی کر دو۔ اس طرح کہ اس کے دونوں طرف پانی کے آنے جانے کے لئے ایک باریک شگاف رہ جائے۔ گلاس کے ایک حصے میں غذا کا ایک ٹکڑا پھینک دو اور دوسرے حصے میں ایک نہایت حقیر حیوان مثلاً پیرا میسیم کو ڈال دو۔ اب اسے خوردبین کے ذریعہ دیکھو۔ وہ فوراً غذا کی طرف جائے گا۔ وہ گلاس کی دیوار سے ٹکرا کر سیدھا واپس لوٹے گا۔ بظاہر یہ محض مشین ہے لیکن جلد ہی سیدھی راہ سے انحراف کرتا ہے اور زاویہ بنا کر چل نکلتا ہے۔ وہ دوبارہ گلاس سے جا ٹکراتا ہے' وہ لوٹتا ہے' گھومتا ہے اور پھر دیوار سے ٹکراتا ہے' لوٹتا ہے' راہ بدلتا ہے اور آخرکار شگاف میں سے نکل کر غذا تک جا پہنچتا ہے۔ کسی مشین کی ساخت یا میکانکس کے اصولوں میں کوئی بات ایسی نہیں جو اس حقیر ترین حیوان میں اس عاقلانہ جستجو اور مقصدیت کے وجود کی توجیہہ کر سکے۔

ایک اور حیوان سنٹر کے کردار پر غور کرو۔ ایک نازک آبی جانور جس کی شکل ترم کی مانند ہوتی ہے اور جو دلدل میں پودوں کے ساتھ چمٹا ہوتا ہے۔ اس کے منہ پر پانی انڈیلو تو یہ فوراً سکڑ کر اپنے نرم خول میں گھس جائے گا۔ ایک منٹ کے بعد وہ پھر اپنی اصلی حالت

پر آجائے گا۔ اس پر پھر پانی انڈیلو کیڑا اس پانی سے قطعی بے نیاز رہے گا۔ جس چیز سے وہ چمٹا ہوا ہے اسے چھیڑو۔ وہ فوراً اپنی نلکی میں سکڑ جائے گا کچھ دیر بعد پھر چھیڑو، لیکن اب سٹر کی طرف سے کوئی رد عمل نہیں ہو گا۔ اس فوری مطابقت کی وجہ کیا ہے؟ کیا اس کی وجہ تکان ہے؟ رد عمل کی شدت کی خستگی ہے؟ نہیں۔ کیونکہ جہاں سٹر پانی کے چھینٹے سے بے نیاز رہتا ہے وہ مضر چیزوں کی موجودگی میں پر زور طریقہ سے سکڑتا ہے لیکن بے ضرر چیزوں کی موجودگی میں یہ حیوان خاموشی اور بے پروائی سے اپنے آپ کو نئے حالات کے سانچے میں ڈھال لیتا ہے۔ ذرا میکا نکیت پرست حیوانی دنیا کی اس حقیر مخلوق کے مخصوص اور حیاتیاتی اعمال کی توجیہہ کر کے دیکھے، لیکن ہمیں وہ ایک مرد مومن کی طرح یقین دلائے گا کہ کسی نہ کسی دن ہم ان چیزوں کی میکانکی توجیہہ بھی ڈھونڈ نکالیں گے۔ اناطول فرانس نے کیا خوب کہا تھا کہ سائنس دان شک کرنے کا فن بھول گئے۔

ہاضمہ کے عمل پر غور کرو۔ چند حساس پودے خوراک کے ان ذرات کو جو ان کی سطحوں پر ہوتے ہیں پکڑ کر ہضم کر لیتے ہیں۔ لیکن جو چیزیں کہ ان کی خوراک نہیں بن سکتیں انہیں نہیں کھاتے۔ بدبو عموماً اس چیز کو ٹھکرا دیتا ہے جو اس کی غذا نہیں ہے۔ ایک بیج نما حیوان اپنی پھولی ہوئی گردن محض موزوں شکار دیکھ کر ہی مارتا ہے۔ ہماری انتڑیاں اپنے عمل میں انتخاب سے کام لیتی ہیں۔ خلیوں کا ہر گروہ چند خوردنی اشیاء پر ہی عمل کرتا ہے۔ انسانی جسم کا ہر خلیہ خون میں سے وہی کچھ لیتا ہے جس کی اسے ضرورت ہوتی ہے۔ باقی کو وہ نظر انداز کر دیتا ہے اور خون میں بچی کھچی غذا پھینک دیتا ہے۔ یہ منتخب غذا کو عناصر میں توڑ پھوڑ دیتا ہے اور انہیں پھر مرکبات میں جوڑتا ہے جن کی اسے توانائی کے لئے ضرورت پڑتی ہے۔ وہ سانس لیتا ہے، کھاتا ہے، خارج کرتا ہے، بڑھتا ہے، بچے پیدا کرتا ہے اور مر جاتا ہے جیسے اسے انفرادیت ودیعت کی گئی ہو۔ یہ خلیے جو کام ہماری زندگی کے ہر لمحہ میں کر گزرتے ہیں۔ ان کا راز ترقی یافتہ سائنس بھی نہیں پا سکتی۔ وہ عالم جو اپنی ذہانت سے ان مسائل کو حل کر دے جو حقیر ترین مخلوق کے خلیے ہر لمحے حل کرتے ہیں، دوسرے انسانوں کی نظر میں دیوتا بن جائے گا۔

اب ذرا نشوونما کے مسئلے پر غور کرو ۔۔۔ ایک مشین کیونکر پھل پھول سکتی ہے؟ وہ پھلنا کیوں چاہے؟ کیا کبھی آپ نے ایسی کل دیکھی ہے جو اپنے اعمال میں زندگی کی وسعتوں کے مماثل ہو؟ ذرا باغ میں سوسن کے پھولوں پر غور کرو۔ وہ کون سی ساحرانہ قوت ہے جو انہیں زمین کے قید خانہ سے نکال کر آہستہ آہستہ سورج کی طرف ابھارتی ہے؟ ذرا ہوا میں

ابابیلوں پر غور کرو۔ ان میں نہ کوئی کل ہے نہ پرزے' نہ پیسے۔ لیکن ان کی شاداں زندگی پر انسان بھی رشک کر سکتا ہے۔

ایک بچہ کی مثال لو۔ وہ غذا کے لئے کیوں بھوکا پیاسا رہتا ہے؟ اور اپنی نرم انگلیوں سے دنیا پر سلا جمانے کی کیونکر کوشش کرتا ہے؟ اسے بڑھتے ہوئے دیکھو۔ اسے محض غذا کی ضرورت ہے جو اس کے رخساروں کو بھر دے' اس کے بالوں میں فراوانی پیدا کر دے اور اس کی آنکھوں کو متبسم کر دے۔ اسے پہلی مرتبہ سہمے ہوئے مگر جرات سے زمین پر سیدھا کھڑا ہوتے دیکھو۔ وہ کیوں کھڑا رہنے اور چلنے کے لئے بیتاب ہے؟ وہ ایک مستقل تجسس اور خطرناک اور ناقابل تسکین آرزوں کی وجہ سے کیوں لرزہ براندام ہے؟ وہ چھوتا ہے' چکھتا ہے' دیکھتا ہے' سنتا ہے۔ چیزوں کو اپنی گرفت میں لاتا ہے' تجربہ کرتا ہے' مشاہدہ کرتا ہے' تدبر کرتا ہے۔ پھلتا پھولتا ہے حتیٰ کہ وہ زمین کا وزن کرنے لگتا ہے اور سیاروں کی پیائش شروع کر دیتا ہے۔ عنوان شباب کس قسم کا انقلاب ہے' جو لڑکے کو توازن اور وسعت دے کر مرد بنا دیتا ہے۔ اور لڑکی کو کسی معجزہ فن سے زیادہ حسین عورت بنا دیتا ہے۔

ذرا احیاء کی حقیقت پر غور کرو۔ کسی تازہ مچھلی کی ایک کرن کاٹ دو۔ وہ کرن دوبارہ پیدا ہو جائے گی۔ سب کرنوں کو کاٹ دو۔ مرکز انہیں دوبارہ پیدا کرے گا۔ مرکز کو کاٹ دو۔ کرنیں خود ایک نیا مرکز تخلیق کر لیں گی۔ ایک بگڑی ہوئی کل اپنے حصوں کی خود مرمت نہیں کرتی۔ وہ بے جان کھڑی رہتی ہے اور کسی زندہ ہاتھ کے لمس کا انتظار کرتی ہے کہ وہ اس کے حصوں کو دوبارہ جوڑے۔ لیکن یہ واقعات جنہیں برگسان نے بیان کیا ہے اہم ترین نہیں ہیں۔ ایک معمولی سا زخم خود بخود مندمل ہو جاتا ہے یقیناً حیرت انگیز ہے۔ کس کمال سے نئے خلیے مجروح بدن پر پھیل جاتے ہیں جیسے کوئی ذہانت اس کار خیر کی ہدایت کر رہی ہے۔ ہم عمل حیات کے ان مظاہر کی میکانکی اور کیمیاوی امداد کرتے ہیں۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ ان مظاہر کی قدرت کو صحت بخشنے کی طاقت سے وہی نسبت ہے جو پتھر یا مٹی کو فن کار کے ہاتھوں سے ہم جانتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح جس کی میکا نکیت توجیہہ نہیں کر سکتی' زندگی کی قوت اور ابھار' ہزاروں جراحتوں اور ہزاروں جنگوں میں ہماری دست گیری کرے گی حتیٰ کہ یہ پچکیلی توانائی ختم ہو جائے اور اپنے لئے کوئی تازہ ہیئت تلاش کرے۔

ذرا شعور پر غور کرو۔ وہ کون ایسی ناقابل فہم صفت ہے جو ہمیں اس بات کی آگاہی دیتی ہے کہ ہم کیا کر رہے ہیں یا کیا کرنا چاہتے ہیں یا ہم نے کیا کیا ہے؟ یا ہم اپنے خیالات

اور آرزوؤں کے درمیان تصادم دیکھتے ہیں اور دوسرے خیالات اور آرزوؤں کے ذریعے ایک پر تمہید کرتے ہیں؟ یا ان ممکن اعمال اور حافظہ کے ذریعہ ممکن نتائج کا تصور کرتے ہیں اور پھر فکر اور آرزو کی تمام طاقتوں کے ساتھ ایک تحلیل شدہ حالت کو ایک تخلیقی عمل میں تبدیل کرتے ہیں۔ کوہلر کے تجربات نے جو میکانکی عمل کے تصور کے خلاف کیا وجدان کی شہادت دیتے ہیں' ذہنی اعمال کی میکانکی توجیہہ کی تردید کر دی ہے۔ ہم غیر شعوری طور پر کتنے بددیانت ہو گئے ہیں۔ کہ آج اگر ہم زمانے کے فیشن کے مطابق چلنا چاہیں تو ہمیں ایک میکانکی فلسفہ کو قائم رکھنے کے لئے شعور کے وجود کو مسترد کرنا پڑے گا۔

ہم ابتدا ان چیزوں سے کرتے ہیں جنہیں ہم محض خارجی اور سطحی طور پر جانتے ہیں (جس طرح کہ جدید طبیعات میں مادہ سے ابتدا کرتے ہیں جو کہ قوت کی سطحی شکل ہے) اور قدرتی طور پر ہم اپنے آپ کو ان سطحی مشینوں سے اس داخلی شعور تک پہنچتے ہوئے دیکھتے ہیں جو تمام علم کا فوری موضوع ہے۔ لیکن نظریہ کردار کا پیرو ایک بین حقیقت کو ایک مشکوک نظریہ پر قربان کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کرتا۔ وہ دلاوری سے اعلان کرتا ہے کہ یہ شعور میکا نکیت' جس کی توجیہہ نہیں کر سکتی ایک فاضل چیز ہے اس کی دراصل کوئی حقیقت نہیں۔ ایک اچھے فلسفی' منکر مذہب کی طرح وہ اپنے بنیادی اصول' طبیعات سے اخذ کرتا ہے اور اس بات کا دھیان رکھتا ہے کہ کوئی ایسے واقعات تسلیم نہ کئے جائیں جو اس کے کلیات کے خلاف ہو۔ نظریہ کردار کے پیرو کی نفسیات مستند ہے۔ لیکن اس کا فلسفہ کمزور ہے مگر وہ اپنی کبریائی سادگی میں یہ کہتا ہے کہ فلسفہ بے سود چیز ہے اور وہ ایک نسل کے اندر ختم ہو جائے گا۔ جدید فکر کی آوارہ سطحیت اس امر سے ظاہر ہے کہ یہ دینیات معکوس اسی طرح لوگوں میں مقبول ہو رہی ہے جس طرح مسیحی سائنس۔ ہم کس مشکل منزل پر آپہنچے ہیں کہ ہم میں سے نصف لوگ تو مادہ کی حقیقت سے منکر اور نصف شعور کی حقیقت سے۔ ہم اس اداس تجسم کا تصور کر سکتے ہیں جس کے ساتھ ایک گوئٹے یا ایک والٹیر۔ ہمارے عہد کے علمی انتشار کو دیکھ رہے ہوں گے۔

آخر میں آیئے ہم تناسل کے مسئلہ پر غور کریں۔ ایک چھوٹی سی فرج جسے ہم دیکھ نہیں سکتے اور ایک بیتاب قطرہ منی ان اقالیم میں حرکت کر رہے ہیں' جن پر ابھی ہم نے تسلط نہیں پایا۔ ان میں سے ہر خلیہ لاانتہائی طور پر موروثی اوصاف سے آراستہ ہے جو ہزاروں نسلوں کی یاد میں اپنے ساتھ لئے ہوئے ہے۔ ان میں سے ہر ایک جسم اور ذہن کی لاثانی صفات جبلتوں' رجحانات اور میلانات' اشتہا' شدت اور محبت کا حامل ہے غالباً ان کی

ساخت میں مردانا کا جذبہ اور استقامت موجود ہے۔ قطرہ منی اور انڈا مل گئے۔ یکایک یہ امکانات حقائق بن گئے اور ایک نئی زندگی کا معجزہ شروع ہو گیا۔ کسی داخلی ضرورت کے ماتحت جس کی خون سے آبیاری کی گئی ہے' زرخیز خلیہ اپنے آپ کو دو خلیوں' چار خلیوں' آٹھ خلیوں اور کروڑوں خلیوں میں تقسیم کرتا ہے جوں جوں جوں تعداد میں بڑھتے ہیں ان کی وحدت میں اضافہ ہوتا ہے۔ ایک دل بن کر دھڑکنا شروع ہوتا ہے ایک دماغ بن کر محسوس کرنے لگتا ہے۔ ہاتھ اور پاؤں' ماں کے رحم میں حرکت کرنے لگتے ہیں۔ اور پھر یہ نیا معجزہ دنیا میں آتا ہے۔ ہوا' خنکی' آواز اور روشنی اس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس کی آنکھیں' ہونٹ اور کان کھل جاتے ہیں اور اس کے تمام اعصاب احساس سے جھنجنا اٹھتے ہیں۔ زندگی نے پھر موت کو شکست دی ہے اور نئی ہیئت میں جلوہ گر ہوئی ہے۔ ایک بار پھر شاداں' قوی اور جوان۔

کیا یہ میکانکی عمل ہے؟ ژاک لوبب نے یہ دیکھا کہ وہ ایک مچھلی کے انڈے کو حل کئے ہوئے نمک اور پن کی چبھن سے باردار کر سکتا ہے۔ اس نے فوراً یہ نتیجہ نکالا کہ اس نے تناسل کی میکانکی نوعیت کو ثابت کر دیا ہے۔ درحقیقت اس نے محض یہ دکھایا تھا کہ بعض حالتوں میں مادہ' نر کی مدد کے بغیر بچے پیدا کر سکتی ہے۔ اس نے مصنوعی تولید کے اصول کو پھر دریافت کر لیا تھا۔ جسے ماہرین حیاتیات مدتوں سے جانتے تھے۔ اس حقیقت میں کہ مادہ پن کی طرح میکانکی نہیں ہے یا نمک کی طرح سادہ نہیں ہے اب غالباً شک و شبہہ کی گنجائش نہیں۔ صرف بغیر خارجی امداد کے تولید اس تولید سے کسی قدر زیادہ حیرت انگیز ہے جو نر اور مادہ کے وصل کے باعث رونما ہوتی ہے۔ اس میں ایک خطرہ بھی مضمر ہے کہ صنف نازک کی حریت کہیں ناخوشگوار حد تک نہ پہنچ جائے۔

لوبب کے ان تجربات سے کہیں زیادہ نظر افروز' ہانس ڈریش کی دریافتیں ہیں۔ ڈریش کی تربیت جنیا میں ارنسٹ ہیکل کے دارالعمل میں ہوئی تھی۔ اس کے پاس میکانکیت پرستی کی تمام ترغیبات موجود تھیں لیکن اس نے ایسے ایسے واقعات کا مشاہدہ کیا جو اس کے اساتذہ کے خواب و خیال میں بھی نہیں آئے تھے۔ اس نے ایک زرخیز بیضہ کو دو نیم کر دیا۔ پھر بھی اس کی نشوونما ٹھیک ہوئی۔ اس نے دوسری تقسیم کے بعد خلیوں کے نظام کو بے ربط طریقہ پر بکھیر دیا۔ پھر بھی اس کی نشوونما صحیح طریقہ پر ہوئی اس نے تیسری مرتبہ بیضہ کو دو حصوں میں تقسیم کر کے اس کے خلیوں کو منتشر کر دیا۔ پھر بھی بیضہ نے اسی طرح نشوونما پائی۔ جیسے کہ اسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ اب ذرا دو مشینوں کے وصال کا تصور کرو

تاکہ وہ ایک تیسری مشین پیدا کریں۔ تصور کرو کہ ہر مشین کا ہر پرزہ تناسل کی طاقت
عادت سے مزین ہے اور مستقل طور پر اپنے آپ کو تقسیم کرتا ہے اور پھلتا پھولتا ہے
تصور کرو کہ والدین کے کچھ حصے مل کر ایک نئی مشین بنا لیتے ہیں اور یہ کہ یہ اپنے
اختیاری سے دو دو' چار چار' آٹھ آٹھ میں بٹ کر ایک مکمل مشین پیدا کر لیتا ہے جتنی
زیادہ تقسیم ہوتی ہے اتنی ہی اس میں وحدت پیدا ہوتی ہے۔ تصور کرو کہ کوئی ڈرائیور
مشین کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے اور اس کے حصوں کو منتشر کر دیتا ہے اور یہ تصور
کرو کہ مشین پھر بھی بدستور کامیابی اور صحت سے اپنا کام کئے جاتی ہے۔ جیسے کہ اسے کچھ
ہوا ہی نہیں۔ کیا سائنس اور فلسفہ میں اس سے زیادہ مضحکہ خیز بات تصور کی جا سکتی
ہے؟ کیا کسی قدیم یا جدید مذہب کا کوئی معجزہ اس عظیم الشان واہمہ کا مقابلہ کر سکتا ہے؟

۳۔ جبریت

لیکن میکا نیکیت پرست ہمیں یہ بتائے گا کہ ہم اس سے ناانصافی برت رہے ہیں کہ ہم
نے اس کی "اصلاح" کو غلط سمجھا ہے اور اس کے اس نظریہ کی تردید کی ہے جس کی اس
نے کبھی حمایت نہیں کی۔ ہم اس کی مدافعت کا تصور کر سکتے ہیں :۔

"ہمارا مقصد انسانی کردار کو مشین نما بنانا نہیں بلکہ ذہنی اور جسمانی دنیا میں اسباب و
نتائج کے کڑے سلسلہ کی تائید کرنا ہے۔ انسان قدرت کا ایک حصہ ہے اور غالباً قدرت کے
قوانین اس پر عائد ہوتے ہیں۔ یہ سلسلہ کہیں ٹوٹ جائے' اس بات کا تصور نہیں کیا جا
سکتا۔ اس شکست کا مطلب یہ ہو گا کہ قوت تباہ یا تخلیق کی جا سکتی ہے۔ لیکن قوت کا
تسلسل اور اس کی مقدار کی بقا ایک بین حقیقت ہے۔ کسی انسان کو غذا دینا بند کر دو تو اس
کی قوت عمل فوراً ختم ہو جائے گی۔ اس کو صحیح غذا دو تو وہ نیک اور وطن پرست بنے گا۔
اسے غلط خوراک دو تو تم اسے بیمار' مجرم' یاس پسند' احمق اور حریت عزم کا علمبردار بنا دو
گے۔ پیدائش سے لے کر موت تک ایک انسان کے اعمال دیکھو۔ یہ یقیناً اس غذا کی طاقت
کے مطابق ہوں گے۔ جو اس نے حاصل کی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ انسان کی ذہنی طاقت اس
کی غذا کی طاقت سے پیدا ہوتی ہے لیکن یہ طاقت آخرکار اس نباتاتی عمل سے پیدا ہوئی
ہے جو زمین اور ہوا کے بے جان مادوں کی رہین منت ہے۔ غیر جانبدار دنیا میں علیت کے
اصول کو مان لینا اسے انسانی زندگی اور فکر کے باریک ترین پہلوؤں کے لئے تسلیم کرنے
کے برابر ہے۔

"پھر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جتنا زیادہ ہم انسانی کردار کو جانتے ہیں اتنی ہی کامیابی سے ہم اس کے متعلق پیش گوئی کر سکتے ہیں۔ غالباً ہم اگر ان تمام حالات سے واقف ہوں۔ جو ہمارے دوستوں کے اعمال پر اثرا انداز ہوتے ہیں تو ہم مکمل صحت کے ساتھ اس کے کردار کے بارے میں اسی طرح پیش گوئی کر سکتے ہیں جس طرح ہم چاند گرہن اور اس کے ادوار کے متعلق کرتے ہیں۔ لیکن اگر جبریت غلط ہوتی' اگر انسانی اعمال قوانین کے تابع نہ ہوتے تو علم کے اضافہ سے انسانی کردار کے متعلق پیش گوئی کرنا ناممکن ہوتا۔

"انسانی کردار' انسان کی شخصیت اور اس ماحول کا نتیجہ ہے جو عمل کے لئے اسے میسر آتا ہے۔ اس کی شخصیت' اس کی وراثت اور اس کے ماحول کا نتیجہ ہے۔ ہم وراثت کی زنجیر کا آخری سرا ہیں۔ ہم کسی چیز کی ابتدا نہیں کرتے' ہم کسی بات کا فیصلہ نہیں کرتے' ہم ان خارجی طاقتوں سے جن پر ہمارا کوئی اثر نہیں مجبور اور متاثر ہوتے ہیں۔ انتخاب فریب نظر ہے۔ یہ محض جبر کی طاقتوں کا امتزاج ہے۔ انسان اپنے آپ کو آزاد سمجھتے ہیں کیونکہ وہ اپنے ارادوں اور اپنی آرزوں کا شعور رکھتے ہیں۔ لیکن ان اسباب سے بے خبر ہوتے ہیں جن سے ان آرزوؤں اور ارادوں کی تخلیق ہوتی ہے۔ درحقیقت ہمارا کردار ان طاقتوں سے بنا ہوتا ہے جو ہمیں معرض وجود میں لاتی ہیں اور ہم پر حاوی ہیں۔ جس طرح ایک پتھر زمان و مکان میں اپنی کمیت' رفتار اور رخ کے مطابق گرتا ہے ان معنوں میں انسان ایک مشین ہے۔"

جبر پرست اپنے فلسفہ کے نتائج پر اگر ذرا دیانت سے غور کرے۔ اگر ہر عمل لازمی طور پر دراصل مادی حالات کا اثر ہے تو ہمیں یہ نتیجہ نکالنا چاہئے کہ جبریت اور میکا کیت حقیقت میں ایک ہی چیز ہے اور یہ کہ مائیکل اینجلو کی پارسائی اور شیکسپیئر کا تخلیقی جذبہ' سقراط کی ناک اور کلوپیٹرا کا تبسم۔ ابتدائی سدیم کی میکانکی اور کیمیاوی ساخت کا اثر ہیں۔ یہ ایک قابل اعتراض مفروضہ ہے۔ حیرت کا مقام ہے کہ ٹین' رینان اور اناطول فرانس جیسے متشککین نے کس طرح جبریت کو ہضم کر لیا۔ لیکن "ایمان کے اس نئے عہد" میں شک کرنے والے بھی مومن ہیں۔ وہ بڑے تفاخر سے ایک نظریہ حیات کو سائنٹیفک طریقہ پر مسترد کرتے ہیں اور اس کے فوراً بعد کسی اور عقیدہ پر "ایمان بالغیب" لے آتے ہیں۔ "میکا کیت پرست" کبھی یہ نہیں سوچتے کہ ان کے باقاعدہ شک کی تہ میں کس قدر بے بنیاد مفروضے ہیں۔

مورخین اسے معجزہ تصور کریں گے کہ اس عظیم سدیم نے کبھی یقین کو ختم نہیں کیا۔

وہ کون سا ایسا جادو تھا جس کی وجہ سے ایک نسل تک ہم نے طبیعات کے ہنگامی تصورات کو اپنی زندگی کے قوانین اور علائم بنائے رکھا؟ ہم میں سے کون درحقیقت یہ مانتا تھا کہ ہم ایک مشین ہوں اور دیانت دارانہ اس مضحکہ خیز مفروضہ پر عمل کرتا تھا؟ کیا ہم خفیہ طور پر یہ جانتے تھے کہ حواس اور ذہن فعال بھی ہیں اور منفعل بھی اور ہم قوتوں کے اس بحر میں خود اختیاری کے چھوٹے چھوٹے مرکز ہیں؟ ہم زندگی کے تنوع اور زرخیزی، اس کے لامتناہی تجربات اور اشکال، اس کی غیر محدود زیرکی اور اس کی مستقل تسخیر مادہ کو کس طرح دیانت داری سے جبریت اور میکانکیت کے اصولوں کے مطابق ڈھال سکتے ہیں؟

یہ حیرت پیدا ہوئی لاک کے اس تصور سے کہ ذہن ایک صاف سلیٹ ہے، جس پر احساسات اپنے نقش چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ ایک موم ہے، جسے خارجی اشیاء اپنی مرضی کے مطابق ڈھالتی رہتی ہیں۔ لیکن آج ہمیں ایک نئی نفسیات کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ لیکن اپنی روح کی تہ میں ہم آرزو کو پاتے ہیں۔ وہ آرزو جو "انسان کی اصلیت ہے۔" ہم اپنے احساسات، مشاہدات، حافظہ اور فکر پر آرزو کا انتخابی اور ترتیبی عمل دیکھتے ہیں۔ زندگی نے اپنی عظیم اشتہا کو جبلتوں اور صلاحیتوں میں تقسیم کیا ہے۔ یہ جبلتیں اور صلاحیتیں ہمارے اعمال، ہمارے رویے اور ہمارے مشاہدے کا انداز کی ترتیب و تنظیم کرتی ہیں۔ ہم ان گنت احساسات سے بے خبر رہتے ہیں، کیونکہ ہم ان احساسات کا انتخاب کرتے ہیں، جو ہماری آرزوؤں کے مطابق ہوں۔ ہم وہ آوازیں سنتے ہیں جن سے ہمیں دلچسپی ہو اور ہزاروں آوازوں کو سامعہ انداز کر دیتے ہیں۔ ہم بظاہر ایک غیر دلچسپ چیز کو دیکھتے ہیں لیکن فوراً ہی اس پر اپنا کوئی مقصد چسپاں کر دیتے ہیں۔ ہمارے مقاصد ہی ہمارے احساسات کو مشاہدے اور فکر میں تبدیل کرتے ہیں۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ چند عددوں کو جمع کرو۔ فوراً ہمارا ذہن ایک خاص رویہ بنا لیتا ہے اور اسی رویہ کی وجہ سے ہم سوال سنتے ہی جواب دے ڈالتے ہیں۔ ۷ اور ۷ سن کر ہم فوراً جواب دیتے ہیں ۱۴ لیکن اگر ہمیں ضرب دینے کو کہا جاتا تو ہم بعینہٖ اسی احساس (یعنی ۷ اور ۷) کا جواب ۴۹ دیتے۔ حالیت اعادہ یا شدت، خیالات کے بندھنوں کی توجیہہ نہیں کر سکتے، فقط مقصد ہی ان کی وضاحت کر سکتا ہے۔ ہم اپنے احساسات کے بے بس شکار نہیں ہیں۔ ہم انتخاب کرتے ہیں۔ وہی مخترعانہ قوت، جس نے ہمارے کارخانوں میں کلیں تیار کی ہیں، اس نظریہ کی عدم صحت کا بہترین ثبوت ہے کہ مخترع کا ذہن اس کے دماغ کی ایک منفعل تخلیق ہے۔

اس تخلیقی ارتقا میں ہمارا ذہن وہ نادر کام کرتا ہے، جنہیں میکانکی کہنا آسان نہیں۔ ہم

کل' کو اجزا' میں تحلیل کرتے ہیں اور اجزا کو نئے مرکبات میں دوبارہ متحد کرتے ہیں۔ ہم مشاہدے میں خیالات کو الگ الگ اور استدلال میں انہیں دوبارہ جوڑتے ہیں۔ ہم مقاصد پر غور کرتے ہیں' اقدار کی پیائش کرتے ہیں۔ نتائج کا تصور کرتے ہیں اور اپنی دلی آرزوؤں کی تسکین کے لئے نئے نئے ذرائع وضع کرتے ہیں۔ ہم پچھلے اعمال کے نتائج کو یاد کرتے ہیں۔ ان حالات میں ان کے مماثل کا تصور کرتے ہیں اور اپنے مقاصد کی روشنی میں ان کا محاکمہ کرتے ہیں۔ علم مختلف طریقہ ہائے عمل کے نتائج کی یادگار ہے۔ جتنا زیادہ ہمارا علم ہو گا اتنے زیادہ ہم دور اندیش ہوں گے جتنے زیادہ ہم دور اندیش ہوں گے اتنی زیادہ ہماری آزادی ہو گی۔ شعور' متخیلہ اعمال کے ریہرسل کے لئے ایک سٹیج ہے۔ ہم حافظہ تخیل اور عقل کے ذریعہ غیر دانشمندانہ اعمال کو کم کر دیتے ہیں اور اپنے آخری نصب العین کا کسی قدر کامیابی کے ساتھ اظہار کرتے ہیں۔ آزادی' عقل کی طرح ایک "دیر آید" عمل ہے' جو ایک مکمل عمل کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ جس طرح عمل کو ملتوی کرنے سے ہم پیچیدہ حالات میں سب متعلقہ محرکات کو ابھارتے ہیں اور پھر تخیل کے ذریعہ ہم ان نامکمل محرکات کو ایک مکمل عمل میں جوڑ دیتے ہیں جو ہماری مکمل اور بالغ شخصیت کا مظہر ہوتا ہے۔

میکا نکیت ایک ثانوی حیثیت رکھتی ہے جو کچھ ہم بنیادی اور فوری طور پر سمجھتے ہیں۔ جو کچھ ہم اپنی روزمرہ زندگی کے حقیقی فلسفہ میں تسلیم کرتے ہیں' یہ ہے کہ ہر ذی حیات اپنی ساخت کی لچک کے مطابق' رہبرانہ قوت کا اور کسی حد تک خود اختیاری عمل کا ایک مرکز ہے۔ زندگی تخلیق ہے۔ اس لئے نہیں کہ وہ عدم میں سے نئی قوت پیدا کرتی ہے بلکہ اس لئے کہ وہ اپنی توانائی خارجی طاقتوں میں شامل کرتی ہے۔ عزم آزاد ہے' محض اس حد تک کہ زندگی جس کی وہ ایک ہیئت ہے' فعال طریقہ پر دنیا کی ازسرنو تشکیل کرتی ہے۔ دنیا کی تشکیل کے لئے زندگی اختراع سے کام لیتی ہے اور ریاضی اور میکا نکیت کی اس لئے تعمیر کرتی ہے کہ وہ خارجی اشیاء سے دوچار ہوں۔ وہ اپنے ذہن اور اپنے عزم کی مخلوقات کا مضحکہ اڑا کر انہیں نظرانداز کر دیتی ہے' جو زندگی کی انہیں تصورات کے ذریعہ گستاخانہ توجیہہ کرتی ہے جو زندگی نے خود پیدا کئے ہیں۔

کیا آزادی کا یہ تصور اہل جبریت کے حملوں کی تاب لا سکتا ہے؟ اگر وہ ہوشیار ہیں تو وہ ہمیں بتائیں گے کہ "عزم" محض اسم مجرد ہے اور وہ دانستہ یہ حقیقت فراموش کر دیں گے کہ "طاقت" بھی ایک اسم مجرو ہے۔ ہم اس کا جواب دیں گے کہ "عزم" سے ہماری مراد کوئی مجرد حقیقت نہیں' بلکہ یہ زندگی کو ابھارنے اور پھیلانے والا کردار ہے۔ زندگی کیا

ہے' یہ ہم بیان کر آئے ہیں لیکن ہمیں ایک حقیقت کو افسانہ تو نہیں بنانا چاہیے۔
یا اہل جبر قوت کی بقا کا ذکر کریں گے۔ ذی حیات اس قوت سے زیادہ دے نہیں سکتا' جو اسے حاصل ہوئی ہے۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ زندگی خود ایک قوت ہے جو اپنے مقابل طاقتوں کو فکر و تدبر کے ذریعہ بدل دیتی ہے تاکہ ماحول کی تسخیر کر سکے اور کبھی کبھی وہ اس ارادے میں کامیاب بھی ہو جاتی ہے۔ جو نتیجہ عمل سے پیدا ہوتا ہے ممکن ہے کہ اس کی مقدار احساس عمل جتنی ہو۔ لیکن وہ صفت میں کتنا مختلف ہے؟ زندگی کی یہ تبدیل کرنے والی طاقت اعلیٰ قسم کی قوت ہے۔ ہمیں اس کا براہ راست علم ہے اور یہی ہماری آزادی کا سرچشمہ اور پیغام ہے۔

اہل جبریہ سمجھتے ہیں کہ آزادی فریب نظر ہے کیونکہ طاقت ور آرزو ہمیشہ کامیاب ہوتی ہے لیکن یہ ایک بے معنی سی بات ہے۔ وہ آرزو جو اتنی طاقتور ہے کہ کامیاب ہو سکے' یقیناً ان آرزوؤں سے زیادہ طاقتور ہے جو ناکام رہتی ہیں۔ لیکن وہ کونسی اور بات تھی جس نے اسے کامیاب بنایا' سوائے عزم تمنا اور روح کی اصلیت کے ساتھ مطابقت کے؟ "پھر بھی کوئی عمل بے سبب نہیں ہو سکتا۔" یقیناً۔ لیکن عزم' سب کا ایک حصہ ہے۔ عمل کے اسباب میں زندگی کی آگے بڑھنے والی قوت بھی شامل ہے۔ ذہن کی ہر کیفیت قدرتی طور پر تمام گذشتہ حقیقت کا نتیجہ ہوتی ہے لیکن اس کیفیت اور اس کیفیت میں زندگی اور عزم کی انقلاب آفریں قوت بھی موجود ہے۔ "ایک سبب کا ہمیشہ ایک ہی اثر ہوتا ہے۔" لیکن سبب کبھی ایک سا نہیں ہوتا۔ کیونکہ شخصیت ہمیشہ بدلتی رہتی ہے اور حالات کبھی یکساں نہیں رہتے۔ "اگر میں تمہارے تمام ماضی اور حال سے واقف ہوں تو بغیر کسی غلطی کے میں تمہارے اعمال کے متعلق پیش گوئی کر سکتا" غالباً اگر تم میرے اندر قوت حیات سے آشنا ہوتے' غالباً اگر تم میکانکی اصولوں کو تج کے اپنے آپ سے یہ سوال کرتے کہ تم یعنی زندگی ان حالات میں کیا کرتے؟ پھر بھی تم غالباً کامیابی سے پیش گوئی نہ کر سکتے۔ غالباً زندگی میں خود اختیاری کا ایک عنصر ہے جو ہمارے تصورات اور ہمارے قوانین کے مطابق نہیں ہے جو ارتقا اور انسانی اعمال کو ایک خاص قسم کا جوش اور کردار بخشتا ہے۔ آیئے ہم دعا کریں کہ ہمیں ایک مکمل طور پر مجبور دنیا میں نہ رہنا پڑے۔ کیا ایسی دنیا کا نقشہ زندگی کے متناقض معلوم نہیں ہوتا؟ جیسا کہ برگساں نے کہا تھا۔ زندگی میں میکا نکیت ایک ہنگامی مذاق ہے۔

"لیکن ہر عمل وراثت اور ماحول کا نتیجہ ہے" یہ بات پوری طرح صحیح نہیں۔ اہل جبر انکسار سے اس محاسبہ میں اپنے وجود کو شمار نہیں کرتے۔ وہ پھر یہی فرض کرتے ہیں کہ

زندگی خارجی طاقتوں کا ایک منفعل نتیجہ ہے۔ وہ زندگی کی قوت اور زندہ دلی کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ہم محض اپنے آباؤ اجداد اور اپنے حالات نہیں ہیں ہم انقلابی طاقت کے سرچشمے ہیں۔ ہم بامقصد قوت اور تخلیقی انتخاب اور فکر کے سمندر کے قطرے ہیں۔ ہمارے آباؤ اجداد بھی اس کے اجزا تھے۔ ہمارے آباؤ اجداد درحقیقت ہم میں زندہ ہیں۔ لیکن وہ عزم اور زندگی جو کبھی ان میں تھی، اب ہم میں سے ہر ایک میں ہے جو میری "خود اختیاری خودی" کی تخلیق کرتی ہے۔ حریت، قدیم تصور آزادی سے زیادہ فراخ بھی ہے اور زیادہ تنگ بھی۔ وہ یقیناً موروثی اور فضائی حالات سے محدود ہے۔ لیکن وہ زندگی کی طرح عمیق اور شعور کی طرح وسیع ہے۔ وہ تجربہ کے تنوع، نقطہ نظر کی وسعت اور فکر کی صفائی کے ساتھ ساتھ طاقت اور احاطہ میں بڑھتی ہے۔ عزم اسی حد تک آزاد ہے جہاں تک کہ زندگی تخلیق کر سکتی ہے۔ عزم اسی حد تک آزاد ہے۔ جس حد تک وہ انتخاب اور عمل کا ایک سبب بن جاتا ہے۔ اس آزادی میں قدرتی قانون کی کوئی مخالفت نہیں ہے کیونکہ زندگی خود ایک قدرتی عنصر و عمل ہے۔ کائنات کی اقلیم سے باہر کوئی طاقت نہیں۔ قدرت وہ زندہ طاقت ہے جس سے تمام چیزیں وجود میں آتی ہیں —— غالباً اس ساری دنیا میں یہ خود اختیاری اور یہی جذبہ نمو موجود ہے جو ہم زندگی میں دیکھتے ہیں ورنہ زندگی کو یہ صفات کیونکر میسر آ سکتی تھیں؟

یہ کہنا کہ ہماری شخصیتیں ہمارے اعمال کی ترتیب کرتی ہیں درست ہے لیکن ہم ہی اپنی شخصیتیں ہیں، ہم انتخاب کرتے ہیں، کھلے کے ہم زبان ہو کر یہ کہنا بھی درست ہے کہ ہم اپنی آرزوؤں پر عمل کرنے میں آزاد ہیں۔ لیکن اپنی آرزو کا انتخاب کرنے میں آزاد نہیں ہیں۔ لیکن یہ کہنا تحصیل حاصل ہے کیونکہ ہم ہی اپنی آرزو میں ہیں اور آرزو زندگی ہے۔ اپنی آرزوؤں کی تکمیل سے ہم اپنی تکمیل کرتے ہیں۔ یہ کہنا کافی نہیں ہے کہ خارجی اور موروثی طاقتیں ہمیں مسخر کرتی ہیں۔ حقیقت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ زندگی خود ایک قوت ہے، جس کا اپنا طریق کار ہے جو محدود اور مجبور ہے۔ لیکن حیرت انگیز حد تک وہ ادنیٰ جانداروں سے مرد دانا کی تنہا رفعتوں تک ابھرتی ہے اور دنیا پر اپنی اشکال اور اپنی فتوحات سے چھا جاتی ہے۔ اگر زندگی ایک فعال قوت نہ ہوتی تو ارتقا ممکن نہیں تھا۔

ہماری رہبرانہ قوت کا احساس ہمیں اپنی ذمہ داری اور اپنی شخصیت سے آگاہی بخشتا ہے اور ہمارے فکر کو ہماری زندگی سے مربوط کرتا ہے کیونکہ جب ہم جبریت کا ذکر کر رہے تھے، ہمیں معلوم تھا کہ یہ فلسفہ غلط ہے۔ ہم نے کبھی اپنے آپ کو یا اپنے بچوں کو مشین

نہیں سمجھا۔ آزادی کے فلسفے بار بار پیدا ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ مشاہدے کو فار...
احساس کو استدلال کے ذریعہ کچلا نہیں جا سکتا۔ درحقیقت میکا کیت ایک بزدلانہ فلسفہ ہے
کیونکہ وہ انسان کے گناہ کو وراثت اور سماج سے منسوب کرتا ہے۔ یہ بہت ممکن ہے کہ
کی شخصیتوں کی ناتوانی اور کمزوری' فلسفہ اور زندگی میں مشین کے تسلط سے متعلق ہو۔
مشین قدرت کو تسخیر کرتی چلی جاتی ہے اور قدیم اور متضاد مقاصد کی تکمیل کے لئے ہماری
قوت بے انتہا بڑھتی جا رہی ہے۔ ہم بادلوں کے اوپر اور سمندروں کی تہ تک پہنچ گئے ہیں۔
ہم کروڑوں اشیا بناتے ہیں جو قیمت اور فن دونوں کے نقطہ نظر سے سستی ہیں۔ آہستہ
آہستہ مشین' استعداد کی' مقدار' صفت کی' صنعت فن کی اور دولت' شخصیت کی جگہ لے
رہی ہے۔ بہت جلدی انسان خود بھی غائب ہو جائے گا اور صرف کل پرزے باقی رہ جائیں
گے۔ تو پھر یہ کون سی حیرت کا مقام ہے کہ ہماری نسل سینما کو تمثیل پر' فلیٹ کو گھر پر' بجلی
کے کھمبے کو مکان پر اور سیاستدانوں کو ارباب سیاست پر ترجیح دیتی ہے۔ ہم نے شخصیت اور
خود اختیاری کو کھو دیا ہے اور مشینوں کا نام پایا ہے۔

میکا کیت پھیلتے ہوئے شہروں اور ظالم جمہوری ریاستوں کے فرد پر تسلط کا بھی اظہار
ہے۔ گروہ یا انتخاب میں شخصیت یا خود اختیاری کو قائم رکھنا مشکل ہے اور سب سے اہم
حقیقت یہ ہے کہ جبریت اس سرمستی کا نام ہے جو طبیعات کو اپنے ظاہری شان و شکوہ سے
حاصل ہوئی۔ اس سرشاری میں اس نے سوچا کہ اپنے خطرناک اور جانبدار اصولوں کے
ذریعہ' ذہن' فن اور محبت کی اقلیم کا احاطہ کر لے۔ آہستہ آہستہ جب ہم مشینری کے عہد
سے تخلیقی ثقافت کے عہد تک پہنچیں گے' ہم دنیا کی سطحی مشینری کے پیچھے زندگی کی رو کو
دیکھ سکیں گے۔ بہت سی غلطیوں اور بہت سے شکوک کے بعد ہم یہ سمجھ جائیں گے کہ ہم
اپنی حقیر بساط کے مطابق دنیا کے اعمال میں شریک ہیں اور اگر ہم چاہیں تو تخیل اور علم کے
ساتھ اس ناقابل فہم تمثیل میں چند سطور لکھ ڈالیں۔

۴۔ حیاتیات کا عہد

آخر میں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ فلسفہ' حیاتیات' نفسیات' بدنیات حتیٰ کہ طبیعات میں
میکانکی طرز توجیہہ ختم ہو رہی ہے۔ لوسیان پوان کارے کہتا ہے کہ آج اس خیال کو بالائے
طاق رکھا جا رہا ہے کہ تمام واقعات کی میکانکی توجیہہ ہو سکتی ہے۔ کیسرر کہتا ہے کہ جدید
طبیعات میں دنیا کے میکانکی تصور کی جگہ برقی فعال تصور لے رہا ہے۔ لے بان کہتا ہے کہ

"ہزاروں محققین کی کوششوں کے باوجود علم الابدان ہمیں ان طاقتوں سے روشناس نہیں کرا سکا، جو زندگی کا باعث بنتی ہیں۔" ان طاقتوں کا ان طاقتوں سے کوئی تعلق نہیں جن کا طبیعات مطالعہ کرتی ہے جس طرح علم کیمیا کو مقدار کے تصور کے علاوہ صفت کے تصور کی ضرورت ہے اور جہاں طبیعات مقدار کے تصور پر قانع ہے، علم الابدان کو صفت اور مقدار کے تصورات کے علاوہ "ذی حیات" اور "کل" کے تصورات کی بھی ضرورت ہے۔ طبیعات اور کیمیا کو ان اجزاء کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔

حیاتیات میں میکا نکیت کی ہر روز تردید ہوتی ہے۔ ڈریشن پیولود اور ہالڈین وہ نام ہیں جو کسی میکا نکیت پرست کے لئے بھی فکر انگیز ہیں۔ نفسیات میں گیشتالٹ تحریک، میکانکی نقطہ نظر کے خلاف احتجاج ہے اور حیاتی نقطہ نظر کی تائید۔

جے۔ ایس۔ ہالڈین کہتا ہے کہ میکانکی تصور کامیاب نہیں رہا۔ شوان کا سادہ میکانکی تصور مدت ہوئی مسترد کر دیا گیا تھا۔ ہم اب یہ جانتے ہیں کہ خلیوں کی تقسیم سے نئے خلیے پیدا ہوتے ہیں اور خلیہ کی نشوونما اور غذا کا مسئلہ ایسا نہیں ہے کہ اس کی توجیہہ میکانکی نظریہ کے مطابق کی جا سکے۔ اخراج اور جذب کے مسائل کچھ ایسے مختلف نہیں۔ تنفس اور دوسرے حیاتیاتی اعمال کے بارے میں سادہ میکانکی نظریئے بھی مٹ چکے ہیں۔ یہ امر واضح ہو گیا ہے کہ بدنی حرکات کے متعلق طبیعاتی، کیمیاوی تصورات کافی نہیں ہیں۔ علم الابدان کی ترقی کے ساتھ ہم کسی میکانکی حل کے امکان سے زیادہ دور ہوتے جا رہے ہیں۔ شیرنگٹن اور دوسرے سائنس دانوں کا کام یہ امر واضح کر رہا ہے کہ ہمیں نظام عصبی میں سادہ اور متعینہ اضطراری حرکات کے تصور کو ترک ہی کرنا پڑے گا۔ ماہر علم الابدان کی حیثیت سے میں اس مفروضہ کو بیکار سمجھتا ہوں کہ زندگی ایک میکانکی عمل ہے۔ یہ مفروضہ میرے کام میں مدد و معاون نہیں ہے اور اب تو میرا خیال ہے کہ یہ علم الابدان کی ترقی کی راہ میں بری طرح حائل ہے۔ اب میکانکی علم الابدان کی طرف لوٹنا، اپنے سیکسن آباؤ اجداد کے اساطیر کی طرف لوٹنے کے مترادف ہے۔

یہ بات اہم ہے کہ شوپنہار اور نیطشے، روایتی دینیات کے مخالف ہو کر بھی میکا نکیت کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ نیطشے نے میکانکی ماہر طبیعات سے کہا:۔

"تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہاری دنیا کی تفسیر کے ذریعہ ہی تحقیق اور تجسس کا کام جاری رہ سکتا ہے۔ وہ تفسیر جو تعدد، پیمائش، وزن، بینائی اور عمل کو ہی ذریعہ علم تصور کرتی ہے اور کسی عمل کو نہیں؟ یہ نظریہ اگر جنون اور دیوانگی نہیں تو بے وقوفی اور درشت فکری تو

ضرور ہے۔ میں اپنے دوستوں' میکا نکیت پرستوں سے (جو فلسفیوں کی صف میں بیٹھتے
اور یہ سمجھتے ہیں کہ علم میکا نکیت وہ بنیادی قوانین بناتا ہے جو تمام حقیقت پر حاوی ہیں)
بات رازدارانہ طور پر پوچھتا ہوں کہ کیا تمہارے نظریہ کی ضد زیادہ قرین قیاس نہیں
وجود کی سطحی اور خارجی صفات پہلے دیکھنے میں آتی ہیں؟ آج حیاتیات تعطل کی حالت
ہے۔ کیونکہ وہ ابھی تک زندگی کا نہیں موت کا مطالعہ کرتی رہی ہے۔ الکحل میں ر
ہوئے نمونے' مردہ تتلیاں' لاشیں' خوردبین پر تیار کیا ہوا جسم یہ ہے اس کی سار
کائنات۔

شاید حیاتیات بھی جلدی ہی طبیعات کے طرز فکر اور تصورات کی مدد سے میکا نکیت
کے تصورات کے خلاف بغاوت کرے گی۔ وہ یہ معلوم کرے گی کہ زندگی جس کے مطالعے
کا اسے فخر حاصل ہے۔ حقیقت کے کہیں زیادہ قریب ہے بہ نسبت طبیعات اور کیمیا کے ما
کے۔ اور جب حیاتیات بالآخر میکانکی طرز فکر کے مردہ ہاتھوں سے آزاد ہو جائے گی تو و
دارالعمل سے نکل کر کھلی دنیا کا رخ کرے گی۔ جس طرح طبیعات نے دنیا کا چہرہ بدل د
ہے' وہ انسانی مقاصد کو تبدیل کرنا شروع کر دے گی اور انسانیت پر مشینری کے ظلم کو ختم
کر دے گی۔ اور پھر فلسفیوں پر بھی جو دو ہزار برس تک ریاضی اور طبیعات کے غلام رہے
ہیں' زندگی کی بامقصد وحدت تخلیقی فراوانی اور عظیم الشان خود اختیاری آشکار ہو جائے گی۔

باب پنجم

ہمارے بدلتے ہوئے اخلاق

ا۔ اخلاق کی اضافیت

اخلاق جو عموماً" بہت آہستہ آہستہ بدلتے ہیں' آج کل ان بادلوں کی طرح بدل رہے ہیں جو تند ہوا کی زد میں آ گئے ہیں۔ وہ رسوم اور وہ ادارے جو قبل از تاریخ زمانہ سے چلے آ رہے ہیں۔ ہماری آنکھوں کے سامنے یوں دم توڑ رہے ہیں جیسے وہ کوئی سطحی عادتیں ہوں جنہیں ہم نے عارضی طور پر اپنا کر ترک کر دیا ہو۔ بہادری جو نیٹشے سے متفق تھی کہ عورتوں کے ساتھ جتنی نرمی برتی جائے کم ہے اور دلاوری جو بدن کے ساتھ ساتھ ذہن کی تہذیب کرتی تھی' عورتوں کی آزادی کے بعد ختم ہو گئی ہے۔ مردوں نے مساوات کا چیلنج قبول کر لیا ہے اور اب ان کے لئے اس جنس کی پرستش کرنا آسان نہیں رہا' جو ان کی بے طرح نقالی کرتی ہے۔ حیا اور عزت' جو عاشق کو کارہائے نمایاں کرنے کی ترغیب دیتیں اور ہر عزم کی قوت کو دوچند کر دیتیں' آج غیر مقبول صفات ہیں اور جوان لڑکیاں' مردوں پر اپنے حسن و جمال کا جادو اس فراخدلی سے بکھیرتی ہیں کہ تجسس تولید کی مدد نہیں کرتی۔ شہری زندگی نے کروڑوں مردوں کو یکجا کر دیا ہے تاکہ وہ اعصابی تحریک کے سوداگروں کا آسان شکار بنیں' ڈرامہ' آج ایام بحالی کی بیباکی کا رقیب ہے اور جدید ادب قدیم پارسائی کی مانند جنسی ہیجانات سے لبریز ہے۔ شادی جو کبھی محض جسمانی وصل کا نام تھا اور جو اوائل عمر میں انسانی زندگی اور کردار کو استحکام بخشتی تھی غیر مقبول ہوتی جا رہی ہے۔ آج کل لوگ یہ سوچنے لگے ہیں کہ شادی کے فوائد اس کے آلام کے بغیر حاصل ہو سکتے ہیں۔ آج کل اس کی ابتدا دیر سے ہوتی ہے اور انتہا جلدی۔ پہلے ہم اسے غیر فطری حد تک ملتوی کرتے رہتے ہیں۔ پھر طلاق کے شور و غوغا میں وہ ختم ہو جاتی ہے۔ خاندان جو کبھی اخلاق کی تربیت گاہ اور سماجی نظام کی بنیاد تھا' شہری صنعت کی ذاتیت میں گم ہو گیا ہے اور ہر نسل کے بعد پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔ اولاد کی عافیت کے لئے جانفشانی سے بنائے ہوئے مکان خاموش اور ویران ہیں۔ بچے' پریشان مقصدوں میں الجھے ہوئے' والدین اپنے اداس گھروں

میں تنہا اور ہر کمرہ آشنا آوازوں کی غیر موجودگی سے گونجتا ہے۔

اب یہ دیکھیں کہ ہمارے اخلاق میں یہ انقلاب کیونکر آیا؟

آج نفسیات کا یہ نازک مسئلہ ہے کہ ہمارے نوجوان گناہوں کی نمائش سے زیادہ لطف اندوز ہوتے ہیں یا ہمارے آباؤ اجداد ان گناہوں کی مذمت سے زیادہ محظوظ ہوتے تھے؟ اخلاقی نقطہ نظر سے زندگی کو دو زمانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے زمانے میں ہم لذت اندوزی کرتے ہیں۔ دوسرے میں ہم نیکی کی تبلیغ کرتے ہیں۔ احتیاط جذبات کے آگے ہتھیار ڈال دیتی ہے۔ آرزو کی عظیم موجیں مٹ جاتی ہیں اور تکلم کی ہوائیں چلنے لگتی ہیں۔ زندگی کی رفتار ست ہو جاتی ہے۔ کیفیت بدل جاتی ہے اور پیری جوانی کو آسانی سے معاف نہیں کر سکتی۔ ان معنوں میں حقیقت عمر کا وظیفہ ہے اور بد اخلاقی دوسرے لوگوں کا کردار۔ ہم میں سے وہ لوگ جو اب نہ جوان ہیں نہ بوڑھے' کسی قدر کامیابی سے یہ کوشش کر سکتے ہیں کہ اپنی اولاد کو سمجھیں۔ اس ضمن میں مناسب طرز فکر تاریخی ہے۔ ہمیں "نیکی" کے تصور کے تنوع اور اخلاق کی اضافی حیثیت پر غور کرنا چاہئے۔ ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ اخلاقی تصورات کا سرچشمہ ارضی اور غیر مکمل ہے اور وہ انسانی زندگی کی بدلتی ہوئی اساس کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔

اخلاق' تاریخی اور لسانی نقطہ نظر سے "رسوم" سے پیدا ہوا ہے۔ ابتدا میں اخلاق ان رسوم سے مطابقت کا نام تھا جو اجتماع کی صحت اور بقا کے لئے لازمی تھیں۔ بعض رسوم۔ محض رواج ہیں۔ جس طرح میز پر چھری کانٹے سے کھانے کی رسم اور ان کا کوئی اخلاقی پہلو نہیں ہوتا۔ اپنے سلاد کو چھری سے کاٹنا' کوئی گناہ نہیں ہے۔ لیکن اس کی سزا کڑی ہے لیکن بعض رسوم مثلاً یک زوجگی اور چند زنی' ازدواج داخلی اور ازدواج خارجی قبیلہ کے اندر قتل سے احتراز اور اس سے باہر قتل پر آمادگی' اجتماعی بہبودی کے لئے اچھے سمجھے جاتے ہیں۔ یہی رسوم مطلق اخلاقی کلئے بن جاتے ہیں اور انہیں پند و نصیحت' پابندیوں اور جلاوطنی کے ذریعہ محفوظ رکھا جاتا ہے۔ رواج وہ رسوم ہیں جن کی تبلیغ کم ہوتی ہے اور ان پر عمل زیادہ ہوتا ہے اور اخلاقی وہ فرائض ہیں جن کی ادائیگی کی توقع ہم اپنے ہمسایوں سے رکھتے ہیں۔

یہ امر حیرت انگیز ہے کہ اخلاقی نظام بدلتے رہتے ہیں۔ سینٹ آگسٹین کو ابراہیم کی بہت سے بیویاں ناگوار تھیں۔ لیکن اس نے یہ درست کہا کہ قدیم یہودیوں کے لئے بہت سی بیویوں کے اخراجات برداشت کرنا کوئی گناہ نہیں تھا کیونکہ یہ اس زمانہ کا رواج تھا اور

اجتماع کے لئے مضرت رساں نہیں سمجھا جاتا تھا۔ یقیناً جنگ کے زمانہ میں کثرت ازدواج ایک رحمت ہے کیونکہ یہ کثرت اولاد کی ضامن ہے۔ اس سے پہلے کہ سماجی نظام قبائلی پیکار کی جگہ لیتا، مردوں کی شرح اموات عورتوں سے کہیں زیادہ تھی اور کثرت ازدواج ان حالات کا منطقی نتیجہ تھا۔ ایک عورت مرد کے بغیر رہنے کی بجائے مرد کے کچھ حصہ پر کفایت کر لیتی تھی۔ یک زوجگی، قبائلی امن کا ایک نتیجہ ہے۔

اخلاقی اضافیت کی چند مثالوں کا تصور کیجئے۔ اہل مشرق سر ڈھانپ کر کسی کا احترام کرتے ہیں۔ اہل مغرب سر کو ننگا کر کے۔ ایک جاپانی عورت (اگرچہ ممکن ہے آج یہ بات صحیح نہ ہو) ایک مزدور کی برہنگی کی طرف توجہ نہیں کرتی۔ لیکن وہ اس کے باوجود شرم و حیا کی دیوی بھی ہو سکتی ہے۔ ایک عرب عورت کے لئے چہرہ سے نقاب اٹھانا، ایک چینی عورت کے لئے پاؤں کو برہنہ کرنا "فحش" کے مترادف تھا۔ ان دونوں حالتوں میں پردہ داری، تخیل اور آرزو کو بھڑکاتی تھی اور نسل انسانی کے لئے مفید تھی۔ میلانیشیا کے باشندے اپنے بیماروں اور بوڑھوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے کیونکہ ان کے نزدیک ان بیکار لوگوں کو ختم کر دینا ہی رحمدلی کا اظہار تھا۔ لباک کہتا ہے۔ چین میں ایک بوڑھے عزیز کے لئے کفن ہی موزوں تحفہ ہوتا تھا بالخصوص جب کہ اس کی صحت گر گئی ہو۔ سمز کہتا ہے نیو برٹین کے جزیرہ میں "انسانی گوشت اس طرح فروخت ہوتا ہے جس طرح ہمارے قصابوں کے ہاں حیوانوں کا گوشت۔ کم از کم چند جزائر سلمان میں انسان (بالخصوص عورتیں) سوروں کی طرح کسی ضیافت کے لئے پالی جاتی ہیں۔" اس قسم کی سینکڑوں مثالیں آسانی سے جمع کی جا سکتی ہیں، جن میں وہ باتیں جو ہمارے ہاں "بداخلاقی" تصور کی جاتی ہیں۔ کسی اور عہد یا سرزمین میں سراسر اخلاق ہیں۔ "اگر" ایک قدیم یونانی مفکر نے کہا تھا تم کسی جگہ کی مقدس اور اخلاقی رسوم کو جمع کرو اور ان میں سے وہ رسوم نکال لو، جو کسی اور سماج کے لئے غیر مقدس اور غیر اخلاقی ہوں تو باقی کچھ بھی نہیں بچے گا۔

۲۔ زراعتی نظام اخلاق

اخلاقی نظام بدلتے رہتے ہیں۔ وہ کونسی طاقت ہے جو انہیں بدلتی رہتی ہے؟ کیا وجہ ہے کہ وہ اعمال جنہیں کسی ایک زمانہ یا جگہ میں اچھا سمجھا جاتا ہے۔ کسی دوسرے عہد یا مقام پر برا خیال کیا جاتا ہے؟

غالباً زندگی کی اقتصادی بنیادوں کی تبدیلی سے اخلاقی تصورات میں تبدیلی آتی ہے۔

تاریخ میں اس قسم کے دو اہم انقلاب آئے ہیں۔ ایک شکاری طرز زندگی سے زرعی طرز زندگی اور دوسرے زرعی طرز زندگی سے صنعتی طرز زندگی کی نمود انسانی ارتقا میں یہ دو اہم اور مرکزی واقعات ہیں' جن پر دوسرے بنیادی واقعات کا انحصار ہے اور ان میں سے ہر ایک عہد میں وہ اخلاقی نظام جو قدیم طرز زندگی میں اجتماعی فلاح و بہبود کا امین تھا ناسازگار سمجھا گیا۔ اور نئے عہد میں آہنگی اور بے ربطی سے بدلتا گیا۔

تقریباً تمام انسانی نسلیں کبھی وحشی جانوروں کا شکار کر کے زندہ رہتی تھیں کیونکہ اقتصادی فراوانی اور تحفظ کے معنوں میں تہذیب ابھی وجود میں نہیں آئی تھی اور حرص بقائے نسل کے لئے لازمی تھی۔ وحشی انسان آج کل کے کتوں کی طرح کھاتا تھا کیونکہ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کو پھر کھانا کب ملے گا؟ خطرہ حرص کی ماں ہے۔ جس طرح ظلم خوف کی اولاد ہے۔ ہمارا ظلم اور ہماری حرص' ہمارا تشدد اور جنگ کے لئے اشتیاق' انسانی زندگی کے شکاری عہد کے آثار ہیں۔

ہر گناہ کبھی نیکی تھا اور شاید پھر کبھی قابل احترام عمل بن جائے۔ جس طرح نفرت جنگ میں قابل احترام جذبہ بن جاتی ہے۔ ظلم اور حرص جہد للبقا کے لئے کبھی لازمی تھے اور اب وہ مضحکہ خیز طور پر غیر ضروری متصور ہوتے ہیں۔ انسان کے گناہ۔ اس کے ہبوط کا نتیجہ نہیں ہیں۔ وہ اس کے صعود کے آثار ہیں۔ والدین' ہمسائے' اور مبلغ ہم پر مدح و مذمت کی بوچھاڑ اس لئے کرتے ہیں کہ ہم زمانے کے تقاضوں کے مطابق اپنی محرکات کا انتخاب کریں۔ جس طرح ہم شکر اور تازیانے کے ذریعہ کتوں کو سدھاتے ہیں ہماری شخصیت کی ان صفات کا دل بڑھایا جاتا ہے جنہیں ودیعت کرنے میں فطرت نے فراخدلی سے کام نہیں لیا اور ان چند صفات کی قطع و برید کرنے کا سلسلہ مدرسہ کی مار سے لے کر پھانسی تک چلتا ہے۔ کوئی عمل آج کل مدح یا مذمت کا سزاوار ہے۔ اگر شدت میں کم یا ضرورت سے زیادہ ہو جائے تو مدح یا مذمت' ہمت افزائی یا تشنیع میں بدل جاتی ہے۔ جب تک امریکہ کو داخلی تصرف کی ضرورت تھی اور خارجی حملہ کا خوف نہیں تھا وہ توسیع ملکیت کی محرکات کی ہمت بڑھاتا رہا اور فوجی صفات کی مذمت کرتا رہا۔ اب توسیع ملکیت کی ضرورت کم ہے اور (کہتے ہیں کہ) خارجی طاقتوں سے حفاظت درکار ہے۔ اب کروڑپتی کی پہلی سی عزت نہیں رہی۔ اور ہمارے امراء البحر شان و شوکت سے اٹھلائے پھرتے ہیں۔ اشیا کی طرح' اخلاق میں بھی طلب و رسد کا معاملہ ہے۔ اگر طلب ایک میدان میں دوسرے میدان سے زیادہ ست رفتاری سے رسد کی تخلیق کرتی ہے تو وہ اس لئے کہ انسانی

روح زمین سے زیادہ زیرک اور ناقابل تسخیر ہے۔ لیکن اس میں بھی مختلف انواع کے بیج بوئے جائیں گے اور یہ بھی میٹھے یا کڑوے پھل پیدا کرے گی۔

ہم نہیں جانتے کہ کب اور کس طرح زندگی ارتقا کی منزلیں طے کر کے شکاری عہد سے زرعی عہد تک پہنچی؟ لیکن ہمیں یہ یقین ہے کہ اس عظیم انقلاب نے نئے اخلاق کے لئے طلب پیدا کی اور بہت سی قدیم خوبیاں کھیت کی پرامن زندگی میں برائیاں بن گئیں۔ محنت' بہادری سے زیادہ اہم۔ کفائت شعاری' تشدد سے زیادہ عزیز اور امن' جنگ سے زیادہ مفید بن گیا اور سب سے اہم بات یہ کہ عورتوں کی سماجی حیثیت بدل گئی۔ شکار سے زیادہ کھیت پر مفید ثابت ہوئی کیونکہ وہ گھر کے سینکڑوں کام کر کے روزی کمانے میں شریک ہو گئی۔ ان مختلف کاموں کے لئے کسی عورت کو ملازم رکھنا مہنگا پڑتا تھا۔ شادی کرنا سستا سودا تھا۔ مزید برآں ہر بچہ اپنی غذا اور لباس کے اخراجات کی نسبت سے کہیں زیادہ جلدی ہی خاندانی روزی کمانے میں مدد کرنے لگتا تھا۔ بچے بلوغت کے عہد تک کھیتوں پر اپنے والدین کے ساتھ مل کر کام کرتے تھے۔ ان کی تعلیم پر کچھ خرچ نہیں ہوتا تھا حتی کہ لڑکیاں بھی کسی حد تک مفید ثابت ہوتی تھیں' اس لئے مامتا مقدس تھی۔ ضبط تولید غیر اخلاقی اور بڑے خاندان خدا کو پسند تھے۔

اس دیہاتی فضا میں ہمارے موروثی اخلاقی نظام نے نشوونما پائی کیونکہ ایک کھیت پر ایک مرد جلدی ہی ذہنی اور اقتصادی طور پر سن بلوغت تک پہنچ جاتا تھا۔ بیس برس میں وہ زندگی کے امور کو اس طرح سمجھنے لگتا تھا جس طرح کہ موجودہ زمانہ میں چالیس برس کا آدمی۔ اس کو فقط ضرورت تھی۔ ایک ہل اور ایک مددگار کی اور موسموں کے نشیب و فراز کو جانچنے کے لئے حساسیت کی۔ اس لئے جونہی فطرت اشارہ کرتی وہ شادی رچا لیتا۔ وہ زیادہ دیر ان پابندیوں پر جھنجلاتا نہیں تھا' جو اخلاقی نظام نے ناجائز جنسی تعلقات پر عاید کی تھیں۔ ناجائز جنسی تعلقات پر پابندی کو وہ معقول سمجھتا تھا' اس وقت بھی جب کہ وہ اس پابندی سے انحراف کرتا تھا۔ جہاں تک عورتوں کا تعلق ہے' ان کے لئے پاکیزگی لازمی تھی کیونکہ پاکیزگی کے نہ ہونے سے مامتا خطرہ کی زد میں آتی تھی۔ اور جب مسیحیت کی تعلیم نے پوری یک زوجگی اور طلاق کی ممانعت کی پابندی عائد کی لوگوں نے اسے بھی معقول سمجھا' کیونکہ کسان کی بیوی بچے جنتی تھے اور یہ مناسب تھا کہ جب تک بچے بالغ نہ ہو جائیں ماں اور باپ اکٹھے رہیں۔ جب کہ آخری بچہ بڑا ہوتا' جسم کے ڈھلنے اور دو روحوں کے اتفاق کی وجہ سے تنوع کی خواہش مدھم پڑ جاتی۔ کھیتی پر عیسائیوں کا سخت گیر اخلاقی

نظام قابل عمل اور مفید ثابت ہوا۔ اس نے ایک صدی کے اندر وہ مضبوط اور محکم نسل پیدا کی جس نے ایک پورے براعظم کو تسخیر کر لیا۔ اخلاق نے ہمیشہ اپنی توقعات سے زیادہ مطالبات کئے ہیں تاکہ جس چیز کی اسے ضرورت ہو وہ حاصل ہو جائے۔

پندرہ سو برس تک پاکیزگی' بچوں کی شادی' طلاق بغیر یک زوجگی اور کثرت اولاد کا یہ زرعی اخلاقی نظام یورپ اور یورپ کی نوآبادیات میں قائم رہا۔ وہ زیادہ آسانی سے قائم رہ سکتا تھا کیونکہ کھیت پر خاندان۔ پیداوار کی اکائی تھی۔ خاندان کے افراد مل کر زمین پر ہل چلاتے اور اس کی پیداوار کھاتے یہاں تک کہ جب صنعت پیدا ہوئی شروع ہوئی تو وہ گھریلو صنعت تھی جس نے گھر کو نیا شعور اور نئی مصروفیتیں' نئے وظائف اور نئی اہمیت عطا کی اور جب دن کا کام ختم ہو جاتا تو یہ خودمختار گروہ شام کو ایک میز یا الاؤ کے گرد جمع ہوتا۔ کھیل کھیلتا' یا دور دراز ممالک کے متعلق کتابیں پڑھتا۔ ہر کام' ہر واقعہ' بھائی بھائی' ماں' بچہ' شوہر' بیوی کے درمیان ربط و محبت کے رشتے استوار کرنے کی مقدس سازش میں شریک تھا ——— مسیحی تہذیب کی خوبیاں۔

۳۔ صنعتی نظام اخلاق

یکایک کارخانے نمودار ہوئے اور مردوں عورتوں اور بچوں نے گھر' خاندان' اتفاق اور خاندانی روایات کو چھوڑ کر' انفرادی طور پر کام شروع کیا۔ ان کچی عمارتوں میں جو انسانوں کے سر ڈھانپنے کے لئے نہیں بلکہ مشینوں کو محفوظ رکھنے کے لئے بنی تھیں شہر پھیلنے لگے کھیتوں میں بیج بونے اور فصلیں کاٹنے کی بجائے لوگوں نے کارخانوں میں تقابل کی جان توڑ جدوجہد میں شرکت شروع کی۔ ایجادات اور اختراعات کی مقدار' مزدور طبقہ کی طرح بڑھتی گئی۔ ہر سال نئی مشینیں ایجاد ہوتیں اور زندگی کو زیادہ پیچیدہ اور زیادہ ناقابل فہم بنا دیتیں۔ ذہنی بلوغت اب اس سے کہیں زیادہ دیر میں حاصل ہونے لگی جتنی دیر میں زراعتی زندگی میں حاصل ہوتی تھی۔ اس پیچیدہ اور بدلتی ہوئی دنیا میں بیس برس کے جوان کی حالت بھی ایک طفل نوخیز کی سی تھی۔ مردوں عورتوں اور قوموں کے بارے میں وہ اس عمر میں حق فریبوں کا شکار ہوتا انہیں دور کرنے کے لئے اسے ابھی مزید دس برس کی ضرورت ہوتی۔ شاید چالیس برس کی عمر میں (اسے) ذہنی پختگی حاصل ہوتی۔ عنفوان شباب کا زمانہ طویل تر ہو گیا اور تعلیم کا ایک طویل عہد لازمہ حیات بن گیا تاکہ ذہن موجودہ زندگی کے نئے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکے۔

زراعت سے صنعت تک انتقال، انسانوں کے اخلاقی کردار پر اثر انداز ہونے لگا۔ اقتصادی بلوغت بھی قریب قریب ذہنی بلوغت کے ساتھ ساتھ حاصل ہوتی۔ صرف ہاتھوں سے کام کرنے والے مزدور۔ اکیس برس کی عمر میں اپنے پاؤں پر آپ کھڑے ہو سکتے اور شادی کے قابل ہوتے۔ ان مراتب سے اوپر خود کفالتی۔ ہر آرام اور جگہ کے ارتفاع کے ساتھ دور ہوتی گئی۔ عہدوں میں بالخصوص۔ مال پختگی ملتوی ہوتی گئی۔ تجارت اور صنعت میں ہزاروں ایسے نئے عناصر پیدا ہوئے جو انفرادی تصرف سے باہر تھے اور انسانوں کے کام پر اثر انداز ہوتے تھے اور کسی وقت بھی اس سے کام چھڑوا سکتے تھے۔

اور آدمی نے جو پہلے کبھی زندگی کے تقاضوں اور اس کی دشواریوں سے دوچار نہیں ہوا تھا۔ کارخانوں کی نشوونما کے بعد پہلی مرتبہ عورت کو اپنے پرانے اسلوب زندگی کو ترک کرتے دیکھا۔ اگر وہ شادی کرتا تو زرعی نظام اخلاقی کی روایات سے مجبور ہو کر وہ اپنی بیوی کو گھر کی چار دیواری میں مقید رکھتا۔ لیکن اب گھر کی وہ اہمیت نہیں رہی تھی۔ گھریلو عورت اب ایک حسین حاشیہ بردار، ایک اندرونی زینت کی حیثیت رکھتی تھی اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ وہ کام جو وہ پہلے گھر میں کرتی تھی۔ اب کارخانوں میں کئے جاتے تھے اور ان کا معاوضہ مرد کی کمائی سے ادا ہوتا تھا۔ اگر بے کاری سے نجات پانے کے لئے عورت ماں بن جاتی تو مشکلات میں اضافہ ہو جاتا کیونکہ اب زچگی میں ڈاکٹروں، نرسوں، ہسپتالوں اور اوزاروں کی ضرورت پڑتی ہے اور یہ کافی مہنگا سودا ہے اور جدید عورت اپنی بڑی بوڑھیوں کی طرح آسانی سے بچے نہیں جن سکتی۔ اگر اسے زیادہ بچے جننے پڑتے تو اور بھی دشواری ہوتی۔ ان میں سے ہر بچہ وبال جان بن جاتا۔ انہیں خاصی عمر تک تعلیم دینا پڑتی۔ مکان کا کرایہ اور سفر کا خرچ بڑھ جاتا۔ وہ تھیٹر اور رقص گاہوں میں والدین کی تفریح میں مخل ہوتے۔ انہیں تازہ ترین فیشن کے لباسوں کی ضرورت ہوتی تاکہ وہ دوسرے بچوں سے کم تر نظر نہ آئیں۔ جب وہ کچھ کمانے لگتے تو غیر ذمہ دار انفرادی زندگی بسر کرنے کی خاطر والدین کی نگرانی سے بھاگ جاتے اور اگر وہ اپنی مرضی سے بھی بھاگیں تو ملازمت کے تقاضے کارخانوں اور تجارتی مرکزوں کا انتقال گھروں سے ان کا رشتہ یوں توڑ دیتا جس طرح کسی پھٹتے ہوئے بم سے ذرات علیحدہ ہوتے ہیں۔ اس لئے شہروں میں ماں بننا۔ ایک قسم کی غلامی اختیار کرنے کے مترادف سمجھا جانے لگا۔ نسل کی خاطر ایک ایسی قربانی جو ایک ہوشیار عورت ملتوی کرتی رہتی اور کبھی تو اس کی نوبت ہی نہ آنے دیتی۔ ضبط تولید کا وقار جلدی ہی قائم ہو گیا اور آلات ضبط تولید فلسفہ کا ایک مسئلہ بن گئے۔

آلات ضبط تولید کی عمومیت۔ ہمارے بدلتے ہوئے اخلاق کا ایک فوری سبب بن گئے۔ پرانے اخلاقی نظام کی رو سے جنسی تعلقات فقط شادی تک ہی محدود تھے کیونکہ جنسی تعلقات ولدیت سے الگ نہیں کئے جا سکتے تھے اور ولدیت کو صرف شادی کے ذریعہ ہی ذمہ داری دی جا سکتی تھی۔ لیکن آج جنس اور تناسل کی علیحدگی سے ایسے حالات پیدا ہو گئے ہیں جو ہمارے آباؤ اجداد کے خواب و خیال میں بھی نہیں آ سکتے تھے مرد و زن کے باہمی تعلقات محض ایک اسی عنصر کی وجہ سے بدل رہے ہیں۔ مستقبل کے اخلاقی نظام کو ان سہولتوں کا جائزہ لینا ہو گا۔ جو نئی اختراعات نے قدیم آرزوؤں کی تسکین کے لئے مہیا کی ہیں۔

ان تمام حالات سے ہمارے اخلاق کے بدلنے کا بڑا سبب پیدا ہوا یعنی شادی کا التوا۔ ۱۹۱۲ء میں پیرس میں شادی کی اوسط عمر تیس برس تھی۔ انگلستان میں چھبیس برس تھی۔ غالباً پچھلے سترہ برس میں انگلستان میں شادی کی اوسط عمر بڑھ گئی اور باقی صنعتی ممالک بھی اسی راہ کی طرف گام زن نظر آتے ہیں۔ کیونکہ فیشنوں کی طرح ہمارے اخلاق بھی پیرس سے آتے ہیں۔ شہری سماج کے اعلیٰ طبقہ میں شادی کے التوا کا منظر زیادہ دیکھنے میں آتا ہے حالانکہ یہی لوگ ہیں جو بچوں کو بہترین ذہنی اور جسمانی تربیت دینے کے سب سے زیادہ اہل ہیں۔ بہت سے لوگ کبھی شادی کرتے ہی نہیں۔ ۱۹۱۱ء میں انگلستان اور ویلز کی آبادی تین کروڑ ساٹھ لاکھ تھی۔ ان میں دو کروڑ بالغ افراد تھے۔ ان دو کروڑ بالغ افراد میں سے ستر لاکھ ایسے تھے جو شادی کے بندھنوں سے آزاد تھے جوں جوں دیہات کم اور شہر زیادہ ہو رہے ہیں، شادی کی عمر بڑھ رہی ہے اور طوائف کی ہدایت کاری کی مدت طویل تر ہو رہی ہے اور بالغ مرد محبت کی اہلیت سے بعد حاصل کرتے جا رہے ہیں۔

متوسط طبقہ کا مرد شادی کو ایک مصیبت سمجھنے لگا ہے۔ اس کی جسمانی تسکین کے لئے ہزاروں عورتیں اس کی راہ تک رہی ہیں اور آج کل جبکہ بچے ایک وبال ہیں اور گھر فلیٹوں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ شادی اس سے زیادہ اور دیتی بھی کیا ہے؟ غیر شادی شدہ مرد اپنے شادی شدہ احباب کی مشقت کی رفتار کو دیکھتے ہیں جو وہ اپنی بیویوں کو عشرت آفریں اور شرآموز بیکاری میں بحال رکھنے کے لئے کرتے ہیں کیونکہ بیکاری ان کے مرتبہ کا تقاضا ہے۔ وہ حیران ہوتے ہیں کہ آخر ان مردوں کو کس بات نے یہ غلامی قبول کرنے پر مجبور کیا ہے؟ وہ دیکھتے ہیں کہ متوسط طبقہ کے والدین اپنی لڑکیوں کو زندگی اور شرافت کے اعلیٰ معیار کے مطابق تربیت دیتے ہیں تاکہ ان کی شادی کسی امیر گھرانے میں کی جا سکے۔ وہ حیران ہوتے

ہیں کہ اپنی محدود آمدنی کے ساتھ وہ کس طرح ایک مستند خاندان کی برابری کر سکتے ہیں- وہ اپنی جیب دیکھتے ہیں اور کچھ دیر اور آزادی کی زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کر لیتے ہیں-

شہر میں شادی سے اجتناب کرنے کی ہر تحریص اور جنس کی تحریک اور تسکین کے سے بہ آسانی موجود ہے- جنسی بلوغت پہلے کی طرح اب بھی جلدی رونما ہوتی ہے لیکن اقتصادی بلوغت کے حصول میں اب دیر لگتی ہے- آرزو پہ جو پابندیاں زرعی اخلاقی نظام میں معقول اور مفید معلوم ہوتی تھیں- صنعتی نظام میں مشکل اور غیر فطری معلوم ہوتی ہیں کیونکہ مرد اب تیس برس کی عمر تک شادی نہیں کر سکتے- لازمی طور پر جسم بغاوت کرتا ہے اور ضبط نفس کی باگیں ڈھیلی پڑ جاتی ہیں- عفت جو کبھی ایک اخلاقی خوبی سمجھی جاتی تھی، اب ایک مضحکہ خیز صفت بن گئی ہے- حیا جو حسن کو زیادہ حسین بنا دیتی تھی ختم ہو گئی ہے- مرد اپنے گناہوں کے تنوع پر ناز کرتے ہیں- اور عورتیں ایک واحد معیار کا مطالبہ کرتی ہیں، جس کی رو سے ہر زن و مرد کو غیر محدود جنسی آزادی حاصل ہو- شادی سے پہلے جنسی تجربہ ایک عام چیز ہے- پیشہ ور جنسی تحریک زنان بازاری سے چھٹ گئی ہے- پولیس کی لاٹھی سے نہیں بلکہ غیر پیشہ ور عورتوں کے تقابل سے- پرانا زرعی اخلاقی نظام پارہ پارہ ہو گیا ہے اور صنعتی دنیا اعمال کو اس کے معیار سے نہیں پرکھتی-

لابنز کی یہ رائے تھی کہ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے کہ کسی مرد کو شادی کرنی چاہئے یا نہیں- ایک پوری زندگی درکار ہے اور ہمارے نوجوان مرد اس سے اتفاق کرتے ہیں کچھ لوگ بہت دیر تک غور و خوض کرتے رہتے ہیں اور غیر شادی شدہ زندگی کی اکتاہٹ سے وابستہ رہتے ہیں- انہیں پارکوں میں دیکھئے- اخباروں کے ذریعہ وہ زندگی کو دوسروں کی نظر سے دیکھتے ہیں- یا کیرے میں دیکھیے بے جان- اپنی ٹانگوں کے جنجال سے تھکے ہوئے ہر رقاصہ کو ایک سا پاتے ہیں اور آخر گناہوں سے بھی اکتا جاتے ہیں- ایک عام غیر شادی شدہ مرد کی بے کیف زندگی کے مقابلہ میں شادی کی مصیبتیں صفر معلوم ہوتی ہیں- غیر مکمل ہونے کے بڑھتے ہوئے احساس اور تنہا سڑتے ہوئے بانجھ عضو سے تو ہزار درجہ بہتر ہیں وہ ذمہ داریاں اور وہ مسائل جن کے الجھاؤ میں شخصیت کے پھیلاؤ کے اسرار مضمر ہیں-

یہ معلوم نہیں کہ "سماجی خرابیاں" کہاں تک شادی کے التواء سے منسوب کی جا سکتی ہیں- ان میں سے کچھ یقیناً ہماری حرص تنوع کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں- فطرت نے ہماری تخلیق یک زوجگی کے لئے نہیں کی- ان میں سے کچھ خامیوں کی ذمہ داری ان شادی شدہ مردوں کے کندھوں پر ہے جو ایک تسخیر شدہ قلعہ کے مسلسل محاصرہ پر جنسی تنوع کو ترجیح

مطالبے معقول تھے۔ ہم زیادہ دیر یہ اخلاقی مطالبے نہیں کر سکتے۔ وقت آگیا ہے کہ ہم اس مسئلہ سے دوچار ہوں۔ یا ہم شادی سے پہلے کے جنسی تعلقات کی مکمل آزادی دے دیں۔ یا ہم شادی سے فطری عمر پر لوٹ آنے کو کہیں۔

۴۔ ہمارے بداخلاق بزرگ

جنسی تلون کو جوانی کے ساتھ وابستہ کرنا ایک عام رسم ہے۔ لیکن یہ تمام عمروں میں جو ابھی تک بالکل بے جان نہیں ہوئیں موجود ہے۔ شادی کے التوا سے ہمارے شہر ان مردوں اور عورتوں سے بھر گئے ہیں۔ جو تنوع کی خارجی تحریک کو ودیعت اور گھر کی بھرپور ذمہ داریوں کی جگہ دے رہے ہیں۔ یہ اکثر و بیشتر یہی قسم ہوتی ہے جو ان نائٹ کلبوں میں جاتے ہیں' جہاں تنہا لوگ شراب سے اپنے آپ کو بدمست کر دیتے ہیں' تاکہ وہ حسین آدم خور جن میں وہ محبت کا بدل ڈھونڈنے آئے تھے۔ انہیں لوٹ لیں۔ اس گروہ کی عادتیں بہت جلدی ہر گروہ میں سرایت کر رہی ہیں۔ جنسی تلون ایک فیشن بن گیا ہے۔ اور کوئی مرد یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ وہ اپنی بیوی سے وفادار ہے یا وہ شعور کو سرمستی پر ترجیح دیتا ہے۔ رومانی نوجوان نہیں۔ بلکہ متوسط عمر کا جنسی طور پر متلون آدمی ہمارے موجودہ مزاج کا ذمہ دار ہے۔

جیسا کہ ہم نے دیکھا ہمارے اخلاقی انقلاب کا ماخذ جدید اجتماعی نظاموں میں شادی کا التوا ہے اور یہاں بھی جہاں تک شخصی اثرات کا تعلق ہے۔ جوان نسلوں پر نہیں بلکہ والدین کے کندھوں پر اس کی ذمہ داری ڈالنی چاہئے۔ جوانوں کی آرزوئیں صحت مند ہیں اور جلدی ہی اسے کامیابی اور بلوغت کی طرف لے جا سکتی ہیں صرف حاسد اور محتاط ماں باپ غصہ میں لڑکے سے پوچھتے ہیں کہ تم کیا کماتے ہو' جو محبت کے جنون میں گرفتار ہونے کی جسارت کر رہے ہو؟ حکمت زراندوزی متوسط عمر والدین کا بنیادی فلسفہ ہے۔ وہ اپنی قدیم سرمستیاں فراموش کر دیتے ہیں۔ اور کبھی یہ نہیں سوچتے کہ جوان دل میں شاید وہ تمنائیں موجزن ہوں جنہیں ایک بوڑھا دماغ نہیں سمجھ سکتا۔ یہ بوڑھی نسل ہے جو بنیادی طور پر بداخلاق ہے۔ یہی لوگ قوم یا نسل کے مفاد سے بے نیاز فطرت کے معقول تقاضوں کی تسکین نہیں ہونے دیتے اور درحقیقت جنسی تلون کی تلقین کرتے ہیں جو کامیاب شادی اور تندرست اولاد کے لئے تیاری کی منزل سمجھی جاتی ہے۔ وہ والدین جن کا نظریہ حیات وسیع تر ہے' یہ جانتے ہیں کہ انفرادی اور اجتماعی راحت اور صحت کے مقابلے میں مال و

دولت کی کوئی وقعت نہیں۔ وہ فطرت سے تعاون کرتے ہیں اور اپنی اولاد کی اوائل شباب میں شادی کو ممکن بنانے کے لئے ایثار سے کام لیتے ہیں۔ جب تک یہ زاویہ نظر پیدا نہیں ہوتا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جوانوں کی بداخلاقی کی وجہ متوسط عمر کے لوگوں کی کاروباری ذہنیت ہے۔

یہ کون کہہ سکتا ہے کہ جوانوں کی جنسی بے راہ روی متوسط عمر کے لوگوں کی غیر محکم شادیوں سے زیادہ قبیح ہے؟ طلاق آہستہ آہستہ شادی کو تسخیر کر رہی ہے۔ ۱۹۲۱ء میں ڈینور میں' علیحدگیوں' کی تعداد شادیوں کے برابر تھی۔ اس سے پہلے چار سالوں میں طلاق اور شادی کی نسبت ۲۵ فی صد سے ۵۰ فی صد تک پہنچ گئی تھی۔ ۱۹۲۲ء شکاگو میں ۳۹۰۰۰ شادیاں ہوئیں اور ۱۳۰۰۰ طلاقیں دی گئیں۔ ۱۹۲۴ء میں نیویارک کی ریاست میں شادیاں ۱۹۲۳ء سے ۴ء۶ فی صد کم ہو گئیں۔ طلاق ۲ء۸ فی صد بڑھ گیا۔

عدالتوں نے شادی کے اس قتل عام کو جن اسباب سے منسوب کیا ہے وہ نہایت سطحی ہیں۔ مثلاً فرار' ظلم' بے پروائی' بدمستی وغیرہ۔ جیسے طلاق کی عمومیت سے پہلے یہ افعال سرزد نہیں ہوتے تھے۔ ان سطحی اسباب کی تہہ میں ولدیت سے تنفر پایا جاتا ہے۔ اور وہ ذوق تنوع جو اگرچہ آدم کی طرح قدیم ہے' جدید طرز زندگی کی ذاتیت شہری زندگی میں جنسی محرکات کی فراوانی اور جنسی تسکین کے کاروباری ذرائع سے دس گنا زیادہ شدید ہو گیا ہے۔

عورت کی جاذبیت اب فقط حسن رہ گئی ہے۔ مرد فقط حسن کا انتخاب کرتا ہے کیونکہ کبھی حسن صحت مند ولدیت کی ضمانت تھا۔ لیکن شادی ایک مستقل ربط ہے اور حسن فانی ہے۔ ایک حسین عورت اپنے شوہر کے لئے مستقبل خوشی کا باعث نہیں ہو سکتی۔ مرد کی جاذبیت اس کی شخصیت اور توانائی ہے' لیکن ایک ذہین ترین شخصیت اور بے پناہ توانائی بھی مجبور رفاقت اور وفا کے چند برسوں بعد مرجھا جاتی ہے۔ مرد روزانہ غیر حاضری سے اپنے آپ کو محفوظ کرتا ہے۔ عورت ولدیت کے التوا سے اپنے حسن کو قائم رکھتی ہے۔ اور اپنی جلد کے تحفظ کے لئے وہ کیمیاوی مرکبات کا امتزاج استعمال کرتی ہے جس کے سامنے سائنٹیفک زراعت ایک طفلانہ حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ شادی کی بقاء کے لئے عورت کو جنسی جاذبیت کی اس قدر ضرورت نہیں جتنی بچے جننے کی اہلیت کی۔ اس اہلیت سے اس میں وہ نادر محاسن پیدا ہوتے ہیں' جو مرد کے خواب و خیال میں بھی نہ آئے ہوں۔ وہ بدل جاتی ہے' پھلتی پھولتی ہے اور ایک نئی شخصیت بن جاتی ہے۔ اور وہ قدیم معجزہ بچہ۔ اسے ایک نئے حسن اور کشش میں مزین کر دیتا ہے۔ بچہ نہ ہو تو گھر فقط ایک

مکان ہے- جس کی دیواریں محبت کی لاش کی حفاظت کرتی ہیں اور جلدی ہی جہاں ایک خاندان ہونا چاہئے تھا وہاں بکھرے ہوئے افراد نظر آتے ہیں-

۵- خاندان

خاندان اجتماعی اداروں میں سب سے زیادہ فطری ادارہ ہے- جو نہ صرف جنسی اختلاط کے' بلکہ بچے پیدا کرنے کے قدرتی میلانات پر مبنی ہے- یہ ادارہ اتنی بنیادی حیثیت رکھتا ہے کہ اگر حالات صحت مند ہوں تو اسے اخلاقی حکم کا موضوع نہیں بنایا جا سکتا- "جبلت تناسل" رجحانات' محرکات اور خواہشات کا ایک گورکھ دھندا ہے- اور شاید جنسی آرزو تناسل کی ان آرزوؤں سے ممتاز ہے جو بچے پیدا کرنے اور ان کی دیکھ بھال کرنے سے متعلق ہیں' اگرچہ چند عورتیں اور بہت سے مرد اپنے آپ کو بچے پیدا کرنے کی خواہش سے بے نیاز سمجھتے ہیں' بہت کم مرد اور عورتیں ایسی ہوں گی جو ایک تکلیف دہ بچہ کو بھی ایک قابل تحسین و محبت مخلوق نہ پائیں- ایک سرد مہر مفکر بھی اپنے بچہ سے پیار کرتا ہے- اگر بچہ بیمار رہتا ہے تو اس کی تیمارداری سے محبت میں اضافہ ہوتا ہے- جس طرح ایک فن کار اس تصویر سے محبت کرتا ہے جو اس کے ہاتھوں میں بنتی ہے- اگر بچہ بدصورت ہے تو رحم دل فطرت والدین کو اندھا کر دیتی ہے اور تخیل کو حواس پر حاوی کر دیتی ہے- "خدا مرض کے ساتھ علاج بھی بھیجتا ہے-" یہ رحم دل فطرت کی بخشش ہے کہ اس نے ہمیں یہ اہلیت نہیں دی کہ ہم دوسروں کی آنکھوں سے اپنے آپ کو دیکھ سکیں-

بچے والدین کے لئے زندہ نہیں رہتے بلکہ والدین بچوں کے لئے زندہ رہتے ہیں اور بچہ کی بے بسی ہی خاندان کی اساس اور اہمیت ہے- خاندان ان رسوم اور فنون' روایات اور اخلاق کو محفوظ کرنے والا ادارہ ہے' جو انسانی وراثت کی جان اور اجتماعی تنظیم کی نفسیاتی بنیاد ہیں- بچہ ایک نراجی مخلوق ہے- وہ کسی قانون یا رسم کا احترام نہیں کرتا- اور وہ فطری طور پر پابندیوں اور ممنوعات کی مخالفت کرتا ہے لیکن خاندان دوسرے بچوں اور والدین کے ذریعے اس ننھے انفرادیت پسند کو رشوتوں اور مار دھاڑ سے مٹھائیوں اور احکام سے ایک اجتماعی فرد بنا دیتا ہے جو تعاون پر آمادہ ہے اور کچھ عرصے کے لئے ایک اشتراکی کی طرح تقسیم کرنے پر راضی ہو جاتا ہے- خاندان پہلی اجتماعی اکائی ہے- بچہ جس کی اطاعت کرتا ہے- اور اس کے اخلاقی نشوونما کا راز اس بات میں مضمر ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ وسیع اداروں سے وفا کا ربط قائم کرے- حتیٰ کہ اس کے وطن کی حدود بھی اس کی روح کو تنگ

معلوم ہونے لگیں۔ لیکن گھر کی محفوظ اور مستحکم بنیادوں کو چھوڑ کر جب نوجوان قابل کے طوفان میں کودتے ہیں تو تھوڑے عرصے کے بعد اس تعاون کے جذبہ کو کھو دیتے ہیں' جس کی گھر میں آبیاری کی گئی تھی۔ بعض متوسط عمر کے لوگ جو خوش حال ہیں مگر ناخوش' کبھی کبھی آرام اور سکون پانے کے لئے پرانے گھر کا رخ کرتے ہیں جو اس نفسا نفسی کے سمندر میں ایک اشتراکی جزیرہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

خاندان ایک اخلاقی اور اجتماعی مرکز اس لئے بنا کہ وہ انسانیت کی ایک خلاق اکائی تھا۔ تمام دنیا جانتی ہے کہ خاندان کی یہ مرکزی حیثیت ختم ہو گئی ہے اور ہماری صنعتی آبادیاں اس غیر مامون دور میں سے گزر رہی ہیں جو اخلاقی بنیادوں کو خاندان سے جدا کر رہی ہیں' کیونکہ وہ اپنا سیاسی اور اقتصادی مقام کھو بیٹھا ہے۔ صنعت گھر اور کھیت سے نکلی اور کارخانہ اور راہ گزر پر آکر رکی۔ فرد کی زندگی میں جا بجا بھٹکانے والا پیشہ معرض وجود میں آیا۔ سرمایہ کے بہاؤ یا قدرتی ذخائر کے ظہور سے مزدوری کا مقام غیر مستقل ہو گیا۔ ان سب اسباب کی بنا پر باپ اور بیٹے کے وہ تعلقات منقطع ہو گئے جو گھر کے اتحاد میں پروان چڑھے تھے۔ وسیع پیمانہ پر صنعت اور ریاست کی کڑی مرکزیت سے گھر کا تانا بانا ٹوٹ گیا اور اس کا الزام محض نظریوں کے سر تھوپا گیا ہے۔ خاندانی وفا اور محبت کے سر چشمے خشک ہو رہے ہیں۔ اور ان کی جذباتی دولت وطن پرستی میں سما رہی ہے۔ جس طرح والدین کا اختیار ہر سال ریاست کے وسیع اور اعلیٰ وظائف کے سامنے ختم ہو رہا ہے۔ ہر جگہ فطری انسانی تعاون کے رشتے ٹوٹ رہے ہیں اور ان کی جگہ امن و قانون' تبلیغ و جبر کے خارجی اور مصنوعی بندھن لے رہے ہیں' بالآخر یہ اقتصادی اور سیاسی فردیت ایک ایسی اخلاقی نفسا نفسی میں ظاہر ہو رہی ہے جس کا نفع کی جنگ میں کوئی مقابلہ نہیں اور جو ان زمانوں میں رونما ہوتی ہے' جب بڑی بڑی تہذیبیں فنا ہو جاتی ہیں۔

۶۔ اسباب

جس طرح یہ تجدید علم کے عہد کی دولت تھی جو اس کی آزادی' اس کی بے راہ روی اور اس کے فن کا موجب بنی' اسی طرح یہ ہمارے زمانہ کی دولت ہے (کوئی ادبی بغاوت نہیں) جس نے مذہب کے سخت گیر اخلاقی نظام کی جگہ ایک آزاد روح کی آزاد لذتوں کو دے دی ہے۔ ہماری تعطیل کا دن جو اب آرام و سکون اور عبادت کا دن نہیں رہا' بلکہ آوارگی اور لامحدود فطری لذتوں کا دن بن گیا ہے' ہمارے بدلتے ہوئے اخلاق اور ہماری

آزاد خیال زندگانی کی ایک واضح علامت ہے۔ مفلسی میں نیک بننا آسان ہے' اس لئے کہ انسان کبھی کبھی تحریص و ترغیب پر قابو پا لیتا ہے' اگر اس کی تسکین پر زیادہ خرچ آئے۔ لیکن ہماری جیبیں دولت سے پر ہوں تو جہاں ہجوم میں تنہائی ہمیں دوسروں کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھے گی' ہم وہاں ہر حسین چہرہ میں خود فراموشی کی تلاش کریں گے اور اپنے دلوں کو جو خود اعتمادی سے محروم ہیں' اپنی مردانگی کے ثبوت بہم پہنچائیں گے۔ آرائش اور مزاج کے اس جدید تعیش کے مقابلہ میں ہمارے مدرسین اخلاق کا وعظ بے کار ہے' کیونکہ یہ تعیش ازلی اور ابدی محرکات پر مبنی ہے اور اب انہیں تسکین کے غیر معمولی مواقع میسر آ گئے ہیں۔ جب تک اقتصادی حالات نہیں بدلتے نتیجہ یہی ہو گا۔ جب تک مشینری لمحات فرصت کو فراواں کرتی رہے گی اور ذہنی مصروفیتیں عضلاتی کاموں کی جگہ لیتی رہیں گی' وہ قوتیں جو کبھی جسمانی مشقت میں صرف ہو جاتی تھیں' لہو کو اسی طرح گرماتی' اور جنسی محرکات کو یوں ہی غیر معمولی طور پر اکساتی رہیں گی۔

شاید اس احیائے لذت' نے ڈارون کی تردید مذہب کے ساتھ غیر متوقع طور پر تعاون کیا ہے۔ جب جوانوں نے' جنہیں دولت کی بے باکی میسر تھی' یہ دیکھا کہ مذہب ان کی لذت اندوزی کی مذمت کرتا ہے' تو انہوں نے سائنس میں مذہب کی مذمت کے لئے ہزاروں دلائل تلاش کر لئے۔ پارسائی نے جنس کو پس پردہ رکھا اور اسے برا بھلا کہتی رہی' لیکن نفسیات اور ادب نے اب جنس کو ساری زندگی پر پھیلا دیا۔ قدیم مفکرین مذہب یہ بحث کرتے تھے کہ آیا کسی لڑکی کا ہاتھ ہاتھ میں لینا گناہ ہے؟ آج ہم یہ سوچتے ہیں کہ ایسا لذیذ موقع ہاتھ سے دینا تو گناہ نہیں؟ لوگ ایمان کی دولت سے محروم ہیں اور بے باک تجربیت کو قدیم حزم و احتیاط پر ترجیح دیتے ہیں۔ اور یہ واجب سزا ہے اس جرم کی کہ ہمارا اخلاق مافوق الفطرت عقائد کے ساتھ وابستہ رہا ہے۔ قدیم اخلاقی نظام سزا اور جہنم کے خوف پر مبنی تھا۔ لیکن علم خوف کے لئے مہلک ہے اور علم پھلتا پھولتا ہے۔ تعلیم کی توسیع کے سامنے پرانا اخلاقی نظام نہ پنپ سکا۔ ہماری غیر معتدل زندگیاں ایک نئے نصاب اخلاق کی متمنی ہیں۔ وہ نصاب جس کی بنیادیں ہماری فطرت اور اس دنیا کی قدروں پر رکھی جائیں تاکہ وہ تہذیب جو خداؤں کے فرار کے بعد کروٹیں لے رہی ہے پھر کوئی راہ نجات حاصل کر سکے۔

زراعت اور مذہب کے انحطاط میں اینگلو سیکسن نسل کے انحطاط کا اضافہ کیجئے مذہب پیورٹین فطری آرزوؤں پر کڑی پابندیاں عائد کرنے کی وجہ سے تنزل پذیر نہیں ہوا' بلکہ

اس لئے بھی کہ جو نسلی گروہ قدیم نظام کو اپنی حمایت اور عمل سے اپنا چکے تھے، ہمارے شہروں میں ایک غیر اہم اقلیت بن چکے ہیں۔ ہجرت اور شرح پیدائش میں انقلابات نے غریبوں کو اعلیٰ اور ارفع کر دیا اور اصحاب ثروت سے جاہ و ثروت چھین لی۔ آئرلینڈ، روس اور جنوبی یورپ کے غیر نارڈی لوگ ہی ہمارے بڑے بڑے شہروں کی سیاست پر حاوی ہیں اور ادب اور زندگی میں اپنے بے ربط اخلاقی نظام کی روح پھونک رہے ہیں۔ زندہ دل آئرش، گرم جوش اطالوی اور آرام طلب سلیو کو اینگلو سیکسن نسل کے نجی اوصاف پسند نہیں آتے۔ جس طرح ہمارے ادب میں نیو انگلینڈ عہد ختم ہو گیا ہے اور بعد کے مہاجر اپنے حقیقت پسند اور یاس آفرین فلسفہ کے لئے نئی ہیئت اور نئے اسالیب وضع کرنے کے تجربے کر رہے ہیں، اس طرح ہمارے اخلاق انتشار کی حالت میں ہیں اور چند مظلوم اقلیتیں ہمارے ادب، تھیٹر، کلیسا اور ریاست پر قابض ہیں۔ امریکہ کے اخلاق نے اپنی نسلی اور اقتصادی بنیادیں بدل دی ہیں۔

اس انقلاب کا آخری سبب پہلی جنگ عظیم تھا۔ اس جنگ نے تعاون اور امن کی وہ روایات توڑ دیں، جو صنعت اور تجارت کے زیر سایہ پھلی پھولی تھیں۔ اس جنگ نے لوگوں کو بربریت اور آوارگی کا خوگر بنا دیا اور ہزاروں سپاہی جب وطن لوٹے، تو وہ اخلاقی امراض کا منبع بن چکے تھے۔ اس جنگ نے لوگوں کے قتل عام سے زندگی کی قدر و اہمیت کو کم کر دیا۔ اور جرائم پیشہ گروہوں کی نفسیات کو مرتب کیا۔ اس نے ایک مشفق تقدیر میں ایمان کو تباہ و برباد کر دیا اور ضمیر سے مذہبی عقیدہ کی پشت پناہی چھین لی۔ ایک مایوس نسل کلیت، ذاتیت اور بے باک بداخلاقی میں مبتلا ہو گئی۔ ریاستیں ایک دوسرے کی دشمن ہو گئیں طبقاتی جنگ از سر نو بیدار ہو گئی۔ صنعتوں نے اجتماعی افادہ کو ذاتی منافع پر قربان کرنا شروع کر دیا۔ مرد شادی کی ذمہ داری سے جی چرانے لگے۔ عورتیں اخلاق کش غلامی میں جھونک دی گئیں، اور جوان نئی آزادیوں سے مزین سائنسی اختراع کی مدد سے جنسی تعلقات کے نتائج و عواقب سے محفوظ ہو کر فن اور زندگی کی لاکھوں جنسی ترغیبات میں محصور کر دیئے گئے۔

یہ ہیں ہمارے اخلاقی انقلاب کے مختلف اسباب۔ گھروں اور کھیتوں سے کارخانوں اور شہروں تک کے انتقال کے تصور کے ذریعے ہی ہم اس پر خروش نسل کو سمجھ سکتے ہیں، جو ہماری جگہ لے رہی ہے۔ ان کی زندگیاں اور ان کے مسائل نئے اور مختلف ہیں۔ صنعتی انقلاب نے انہیں شکنجہ میں کس رکھا ہے اور ان کے رسم و رواج لباس، کام، مذہب اور اخلاق کو بدل رہا ہے۔ انہیں پرانے اخلاقی نظام کے نقطہ نظر سے جانچنا اور پرکھنا، اسی طرح

غیر تاریخی اور غیر منصفانہ امر ہے' جس طرح انہیں قدیم زمانہ کا لباس پہنا دینا۔ اخلاق اور بداخلاقی' یہ الفاظ اپنا مفہوم بدل رہے ہیں۔ ان کے پرانے مرکز مٹ چکے ہیں اور نئے مراکز ابھی بنے نہیں۔ کوئی یہ نہیں جانتا کہ ان کا کیا مطلب ہونا چاہئے یا انہیں کس طرح نئے مطالب دینے چاہئیں' کہ ہم ایک صنعتی اور شہری عہد میں انسانی کردار کو سمجھ سکیں۔

ہم دو عہدوں کے درمیان معلق ہیں۔ ایک ختم ہو چکا ہے اور دوسرے نے ابھی تک پوری طرح جنم نہیں لیا۔ اور ہماری تقدیر ایک نسل کے لئے انتشار ہے۔ ہم سقراط اور کنفیوشس کی طرح اس بات کا شعور رکھتے ہیں کہ ضبط اور خوف کے اخلاق کا جادو ٹوٹ چکا ہے اور ہم ایک فطری اخلاقی نظام پیدا کرنا چاہتے ہیں جس کی بنیاد خوف نہیں' ذہانت ہو اور ہم اس کے ذریعے تعلیم یافتہ لوگوں کو بھی قائل کر سکیں۔ ہم میں سے جن لوگوں کے بچے ہیں انہیں اخلاق اور نفسیات کے ہزاروں مسائل درپیش ہیں' جنہیں سلجھانے کے لئے کوئی پرانا نسخہ کارگر نہیں ہو سکتا۔ ہم مجبور ہیں کہ ہم فکر کریں' اپنی عادات اور اپنے مفروضوں پر نکتہ چینی کریں اور اپنے لئے زندگی اور فکر کا ایک ہم آہنگ نظام تعمیر کریں' جو ہمارے عہد کے تقاضوں کے مطابق ہو۔ ہم تقدیر کے موڑ پر اس طرح برہنہ کھڑے ہیں کہ ہمارے جسم مافوق الفطرت عقاید اور موروثی اخلاقی نظام سے عاری ہیں۔ ہر چیز کی از سرنو تعمیر ہونی چاہئے۔ چاہے ہمیں پھر وحشت کے عہد میں ہی کیوں نہ لوٹا دیا جائے اور ہم تہذیب کی تعمیر پر پھر مجبور ہو جائیں۔

ہم ایک ایسا اخلاقی نظام کہاں سے لائیں جو نئے حالات کے مطابق ہو۔ اور ہمیں پھر اعلیٰ اقدار زندگی یعنی شرافت' نجابت' حیا' نیکی' عزت' دلاوری اور محبت کی طرف ابھارے۔ جس طرح قدیم اخلاقی نظام لوگوں کو ارفع منازل پر پہنچاتا تھا۔ ایسا اخلاقی نظام جو ایسی نئی اقدار کی طرف لے جائے' جو اسی قدر مشفق ہوں' جس قدر کہ یہ ہیں؟ ہم نیکی کو از سرنو کیا مفہوم دے سکتے ہیں؟ ہم اعلیٰ سماج کی اخلاقی بنیادیں آخر کس نہج پر رکھیں؟

اخلاق اور بد اخلاقی

ا۔ اخلاق ذہانت کی حیثیت سے

آیئے اب ہم چند لمحوں کے لئے فلسفیوں کے ان اقوال پر غور کریں جو اخلاق سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ اقوال ہمارے فکر کو اور زیادہ پریشان کریں گے۔ لیکن حالات کے تمام پہلوؤں پر غور کر کے ہی ہم ایسے نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں جو ہمارے مسئلہ کو پیچیدگیوں پر حاوی ہو۔

یورپی اخلاق کے بانیوں یعنی سوفسطائیوں نے ہمیں ابتدا ہی میں اخلاقی الجھنوں کے خار دار مرکز سے دوچار کر دیا ہے۔ کیونکہ ان کا فکر اور تجزیہ اس قدر گہرا ہے کہ اس کے سامنے نیٹشے کا فلسفہ ثانوی اور بے جان معلوم ہوتا ہے۔ سوفسطائیوں نے دو ہزار برس پہلے نیٹشے کے فلسفے کا آدھا خروش چرا لیا تھا۔ افلاطون کے گورجیاز میں کیلیکلیز کہتا ہے کہ کمزور لوگوں نے طاقت وروں کو نیچا دکھانے کے لئے ایک اختراع کی ہے۔ اس اختراع کا نام "اخلاق" ہے۔ اس "اخلاق" کا مقصد یہ ہے کہ "مرد دانا" کو ایک عام انسان کی پابندیوں میں جکڑا رہنے دیا جائے۔ دانا انسان "نیکی" اور "بدی" کے بارے میں غیر جانب داری برتے گا۔ اس کے مقاصد جلیل ہوں گے اور وہ ان کی تکمیل کے لئے توانائی' جرات اور استعداد حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ اور یہی اس کے لئے بہترین اوصاف ہوں گے۔ اور "ریاست" میں "تھریسی میکس" کہتا ہے کہ طاقت نیکی ہے۔ اور انصاف محض طاقت وروں کا مفاد' غیر منصف انصاف پسندوں کا آقا ہے۔ اور انصاف پسند ہمیشہ گھاٹے میں رہتا ہے۔ وہ ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ میں وسیع پیمانے پر ناانصافی کا ذکر کر رہا ہوں۔ "ناانصافی غالباً ناکام رہتی ہے جو اعلیٰ پیمانے پر نہ کی جائے۔

یہ امر غور طلب ہے کہ "نیکی" پر یہ تنقید کتنی پرانی ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ نیٹشے کا فلسفہ۔ فکر کی پختگی کا نہیں بلکہ اس کے شباب کا زمانہ ہے۔ سوفسطائیت آزادی کی اس سرمستی کی علامت ہے جو یونانی فلسفے کو اس وقت میسر آئی جب اس نے متعدد معبودوں اور

روایات کی زنجیروں کو توڑ دیا تھا۔ یونانیوں کا قدیم اخلاقی نظام مذہبی بنیادوں پر کسی قدر غیر محفوظ انداز میں قائم تھا' اس انسان کی طرح جس کی ٹانگیں ہوا میں لہرا رہی ہوں۔ اس انکشاف نے کہ اخلاق کی بنیادیں کمزور ہیں' اخلاق کو صدمہ پہنچایا۔ اس عدم اخلاق کی حیثیت' دہریت مادیت اور جبریت کی طرح جوانی کی ہنگامی بغاوت سے زیادہ تھی۔ یہی حال ہمارا ہے۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے بچپن کا ظالم خدا کوئی حقیقی خدا نہیں' بلکہ ایک اختراع فکر ہے' جس کا مقصد یہ ہے کہ ہمیں چیزیں چرانے اور اپنے استادوں کو سولی پر چڑھانے سے روکا جائے تو ہم وقتی طور پر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ چونکہ یہ ظالم خدا ہے ہی نہیں اس لئے ہر وہ چیز جو اس نے ممنوع قرار دی تھی جائز ہے' اور چوری' قتل اور اغوا' معزز اوصاف ہیں' بشرطیکہ ان کی صحیح پیمانے پر اور پولیس کی رائے کا احترام کرتے ہوئے تربیت کی جائے۔ جس طرح دوستوفسکی کے ایوان نے کہا تھا کہ اگر خدا نہیں ہے تو ہر چیز کی اجازت ہے۔ صرف محتاط رہنا لازمی ہے۔ اخلاقیات کا مسئلہ یہ ہے کہ آیا نیک بننا اور محتاط رہنا بہتر ہے۔ اگر ہے تو انسانوں کو کس طرح اس "نیکی" کی طرف مائل کیا جا سکتا ہے؟

سوفسطائیت کے پس منظر ہی میں ہم سقراط کے اس اعلیٰ مرتبہ کا اندازہ لگا سکتے ہیں جو اسے فلسفہ اخلاق میں حاصل ہے۔ کیونکہ سقراط نے ایتھنز کو دو خطروں کے درمیان معلق پایا۔ جمہوری اکثریت کا پرانے عقائد کی طرف میلان اور وہ بے باک ذاتیت' جو پرانے مذہب سے مایوسی کی بنیادوں پر استوار تھی' جس نے انتشار زدہ ایتھنز کو سپارٹا کی منظم اشرافیت کا بے بس شکار بنا دیا۔ سقراط نے بتایا کہ فلسفہ کا اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ الہیاتی اخلاق کی جگہ (جسے فلسفہ ختم کر چکا تھا) فطری اخلاق کو کیونکر دی جائے۔ اگر ایک ایسا اخلاق مرتب کیا جائے جو مذہبی عقاید سے مستغنی ہو' تو یہ مذہبی عقاید آتے جاتے رہیں' لیکن وہ اخلاقی رشتے نہ ٹوٹنے پائیں جو مختلف افراد کو ایک پرامن دنیا کے شہری بناتے ہیں۔ مثلاً اگر نیکی کا مطلب ذہانت اور دانش ہو اور اگر انسانوں کو ان کے صحیح مفاد سے آگاہ کیا جائے اور انہیں اپنے اعمال کے دور رس نتائج کو دیکھنے اور اپنی منتشر آرزوؤں کو ایک مربوط نظام میں ڈھالنے کی تعلیم دی جائے تو شاید اس طرح ایک مہذب انسان کو وہ اخلاقی میسر آ جائے جو کہ جہلا کے لئے محض الہیاتی پابندیاں اور حکومت کے احکام ہیں۔ شاید گناہ جہالت ہے' نظر کی خامی ہے؟ کیا تربیت یافتہ ذہانت نیکی نہیں' جو سماجی نظام کو قائم رکھنے کے لئے کافی ہے؟

اس نظریہ میں ایک چالاک ذاتیت مضمر ہے جو اشرافی سیاسی فلسفہ کا لازمی ... سقراط کا خیال تھا کہ ایک نسل کی تربیت سے ایک باوقار اعلیٰ طبقہ قائم کیا جا سکتا ہے۔ اس نے کبھی اس مسئلہ کا حل نہیں بتایا کہ ذہانت ایک بدفطرت انسان کو زیادہ شاطر بد ذاتی سکھا سکتی ہے۔ اس طرح پرانا مسئلہ جوں کا توں قائم رہا کہ ذہانت کو سماج پر حاوی کیا جائے یا اخلاق کو ذہانت اور عقل کے علاوہ کسی اساس پر استوار کیا جائے۔ افلاطون نے اول الذکر حل پسند کیا۔ اس نے کہا کہ ذہانت محض علم ہی پر حاوی نہیں یہ انسانی فطرت کے مختلف عناصر کی فنکارانہ ترتیب اور نظام کا نام ہے۔ اور سب سے اعلیٰ نیکی شورخ و شنگ فکر یا عدم اخلاق نہیں' بلکہ فرد اور ریاست میں اجزا کی کل میں ترتیب ہے۔ یہ تھی ایک محکم بنیاد' جس پر مزید اخلاقی تجسس کی عمارت تعمیر کی جا سکتی تھی۔ لیکن فلسفہ نے اسے نظر انداز کر دیا اور اپنے معلمین اخلاق کے باوجود یونان کا شیرازہ بکھر گیا۔ اور جب مسیحیت کا دور دورہ ہوا تو تمام دنیا ایک ایسے اخلاقی نظام کے لئے تیار تھی جو حیات بعد ممات کے خطروں اور امیدوں سے نیکی اور راست بازی کی کیسوں کو پورا کرتا تھا۔ ایک ایسے اخلاقی نظام کے قیام کا مسئلہ جو مذہبی عقائد سے بے نیاز ہو' جوں کو توں رہا۔

۲۔ فطری اخلاق

یہاں بھی' جیسے کئی اور مسائل کے ضمن میں سر فرانسس بیکن نے ایک حل سمجھایا۔ "ترقی علم" میں ایک ایسا فقرہ نظر آتا ہے جو ایک غیر مذہبی اخلاق کی بنیاد بن سکتا ہے۔ بیکن نے کہا کہ تمام چیزوں میں دو طرح کی نیکی کے رجحانات موجود ہیں۔ ایک اپنی ذات کو قائم رکھنے کے رجحان دوسرے اپنی ذات کو ایک وسیع کل میں مربوط کرنے کا رجحان۔ اور یہ رجحان پہلے رجحان سے زیادہ قابل احترام اور قوی ہے' کیونکہ اس کا مقصد ایک زیادہ وسیع کل کی بقا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بداخلاقی کی طرح اخلاق بھی انسانی فطرت کا ایک جزو ہے۔ ہمارے اندر خودی اور اجتماع دونوں کو قائم رکھنے کی جبلتیں موجود ہیں۔ بیکن کہتا ہے کہ اجتماعی جبلتیں خودی کی جبلتوں سے زیادہ قوی ہیں۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو دلچسپ ہے اور ہمیں فطری اخلاق کی بنیادیں تلاش کرنے کے لئے اسی راہ پر چلنا ہو گا۔

ڈارون کے زمانے میں بیکن کی سمجھائی ہوئی راہ کو سائنٹیفک جواز میسر آ گیا۔ پہلے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ڈارون کے فلسفے کے اخلاقی مطالب نیٹشے کے فلسفے کے حامی ہیں۔ اگر ارتقا جہد للبقا اور بقائے ارفع کا نام ہے تو بظاہر شعبہ زندگی میں حتیٰ کہ اخلاق میں بھی برتری

کی دلیل ہے۔ کامیاب انسان ہی نیک ہے اور طاقت واحد نیکی ہے۔ ہکسلے نظریہ ارتقا کے ان نتائج سے خوف زدہ ہوا۔ اسے ٹینی سن سے اتفاق تھا کہ فطرت خون آشام اور تمام اخلاقی اقدار کی دشمن ہے۔ بظاہر ارتقا کا یہی مطلب تھا کہ طاقت ور کمزوروں کو ختم کر دیں۔ لیکن اخلاق کا تو یہ مطلب ہے کہ طاقت ور کمزوروں کی مدد کریں۔ ارتقا کا یہ مطلب تھا کہ جس طرح ہو سکے۔ ہر ممکن طریقہ سے کامیاب بنو۔ اخلاق کہتا تھا کہ ضرور کامیاب بنو' لیکن انسانیت اور شرافت کی حدود میں رہ کر۔ اخلاق کا نصب العین امن ہے۔ بقا کی آزمائش جنگ ہے۔ ہکسلے اس نتیجہ پر پہنچا کہ سماج کی اخلاقی ترقی کا انحصار قانون قدرت کی نقالی پر نہیں' بلکہ اس کے خلاف جنگ کرنے پر ہے۔

یہ ایک خطرناک نظریہ تھا' کیونکہ اگر اخلاق فطرت کے خلاف ہے تو اس کا انجام موت ہے۔ ہکسلے نے خود یہ محسوس کیا تھا کہ اس نظریہ کا نتیجہ یہی ہو گا۔ وہ کہتا ہے' ہماری فطرت جو بہت حد تک ہماری بقا کے لئے لازمی ہے' لاکھوں سالوں کی کڑی تربیت کا نتیجہ ہے اور یہ تصور کرنا حماقت ہو گا کہ چند صدیوں میں ہم اس کی شدت اور انانیت کو اخلاقی مقاصد کے تابع کر سکیں گے' اور اخلاقی مسئلہ' یعنی طاقت اور واہمے کے استعمال کے بغیر انسانی خلق پیدا کرنے کا مسئلہ لاینحل ہے' اگر اخلاق اور فطرت دو متضاد حقیقتیں ہیں۔

ڈارون نے اس مسئلہ کو حل کر دیا۔ فلسفیوں نے یہ نہیں دیکھا تھا جب تک کہ کروپوٹکن نے انہیں یہ بات نہیں سمجھائی کہ "ارتقائے آدم" کے چوتھے باب میں ڈارون نے ایک اخلاقی نظام کی طرح ڈالی تھی' جس کی نوعیت مذہبی عقاید نہیں بلکہ حیاتیاتی واقعات تھے۔ ارسطو اور بیکن ٹھیک کہتے تھے۔ انسان فطری طور پر اجتماعی شعور رکھتا ہے' کیونکہ سماج انسان سے پہلے موجود تھا۔ اور انسانیت نے اجتماعی شعور ورثہ میں حاصل کیا ہے۔ حیوانی زندگی کے ادنیٰ مراتب میں بھی اجتماعی تنظیم کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً چیونٹیوں اور شہد کی مکھیوں میں وہ باہمی تعاون نظر آتا ہے جو انسانوں میں موجود نہیں۔ اجتماع کے ارتقا میں خارجی خطرہ کے پیش نظر داخلی استحکام کی خاطر انفرادی تقابل پر پابندیاں عاید کر دی گئیں۔ قدرتی انتخاب فرد کی جگہ اجتماع کی زندگی کا قانون بنتا گیا۔ کمزور افراد اپنے ہم عصروں کے اجتماعی رجحانات کی وجہ سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ لیکن ہسپانیہ کی طرح کمزور اقوام' تسمانیوں کی طرح کمزور نسلیں اور بھینسوں کی طرح کمزور اجناس جنگوں یا جماعتوں کے تقابل میں مٹ جاتی ہیں۔ ارتقا کی محض مادی نوعیت ختم ہو گئی۔ اب اسے اجتماعی حیثیت حاصل ہو گئی۔ بقا۔ محض انفرادی طاقت کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ اجتماعی ربط اور استعداد

تھی جو نیو کا۔ اجتماعی تنظیم کی وجہ سے اس گراں دفاعی جسمانی نظام کی ضرورت نہیں رہی تھی جو غیر اجتماعی حیوانوں کو میسر تھا کیونکہ انہیں فقط اپنی انفرادی طاقت اور چالاکی کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ چیونٹیوں اور شہد کی مکھیوں میں جن میں اجتماعی تنظیم درجہ کمال تک پہنچ گئی تھی۔ انفرادی اسلحہ' دانت' پنجے اور دبیز جلدیں مٹ چکی تھیں۔ خارجی خطرے اور تقابل کے ارتقا نے ایک اجتماع کے افراد میں ہمدردی' دوستی اور امداد باہمی کی صفات پیدا کر دیں۔ یہ ساری خوبیاں جنہیں اجتماع دشمن نیٹشے نسائی صفات سمجھتا تھا۔ دراصل بقائے اجتماع کے لئے لازمی اوصاف تھے۔ گروہوں کے درمیان تقابل اور پیکار باہمی تعاون اور داخلی امن کا باعث بنے۔ جنگ یا جنگ کے امکان نے اخلاق کی طرح ڈالی۔

یہ امر واضح ہے کہ حیاتیاتی نقطہ نظر سے اخلاق کی فطری اور لابدی بنیاد یہ ہے کہ جزو کل سے تعاون کرے۔ یہ وہ جامع نظریہ ہے جس کی رو سے ہر آرزو' آرزوؤں کے نظام سے ہر فرد' خاندان سے' ہر خاندان' ریاست سے' ہر ریاست انسانیت سے اور انسانیت زندگی کے ارتقا سے تعاون کرے۔ جوانی میں ہم "اخلاق" کو باغی فرد کی بغاوت سے تعبیر کرتے ہیں۔ ہم "ذہانت" کو دیوتا بنا لیتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ عقل آرزو کی ادنیٰ لونڈی بھی بن سکتی ہے' جو ہر معیوب عمل کے لئے دلائل تلاش کرنے کے کام پر مامور ہے۔ ہم خود اعتمادی' بغاوت اور جرات کو اچھا سمجھتے ہیں۔ ہم تنہا انسان کی مدح میں گیت گاتے ہیں۔ اور ابلسن کی طرح یہ کہتے ہیں کہ مضبوط ترین انسان وہ ہے جو تنہا ہے۔ یہ رویہ خاندان کے اجتماعی اثر کے خلاف ایک صحت مند بغاوت ہے' اور یہ ایک لڑکے کے سن بلوغ پر پہنچنے کا بہترین اعلان ہے۔ بعد میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اجتماع جسے ہم فرد کی ضد سمجھتے تھے' افراد ہی کا مجموعہ ہے' جس میں ہر فرد ہماری ہی طرح اہم ہے۔ آخر ہم یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ اخلاق کو "فرد" کی انفرادیت ہی میں نہیں ڈھالا جا سکتا' اور یہ کہ ہمیں کل کی فلاح و بہبود کو وہ قطعی کسوٹی بنانا پڑے گا' جس کے ذریعے ہم جزو کے کردار کو پرکھ سکتے ہیں۔

جس طرح بہترین حکومت وہ ہے جو کم سے کم حکومت کرتی ہے۔ اسی طرح بہترین اخلاق وہ ہے جو کم سے کم ممانعت کرتا ہے۔ زندگی کی آزادی ایک ایسی نعمت ہے کہ جو لوگ اپنے ہمسایوں کے لئے اخلاق تجویز کرتے ہیں' صحیح طور پر انسانی نسل کے دشمن سمجھے جاتے ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہر اخلاقی حکم کتنا خطرناک ہوتا ہے؟ کس طرح ایک "بداخلاقی" دراصل ایک اخلاقی نظام سے دوسرے اخلاقی نظام تک کے انتقال کی ایک منزل

ہو سکتی ہے؟ ان لوگوں کے بارے میں اخلاقی حکم لگانے سے ہمیں بالخصوص احتراز کرنا چاہئے۔ جو دماغی اور فنی خصوصیات میں دوسرے لوگوں سے ممتاز ہیں۔ قدرت ان لوگوں کو علیحدہ کر دیتی ہے تاکہ وہ عمل' احساس اور فکر کے لئے اسالیب سے تجربہ کریں اور اپنے روزمرہ کے اجتماعی اخلاق کو ان پر عاید کرنا ان کے پیدائش کے مقصد کو برباد کرنا ہے۔ جب پاپائے پولوس سوم کو یہ مشورہ دیا گیا کہ سلینی کو اس کے قاتلانہ عزائم کی بنا پر قید کر دیا جائے تو اس نے جواب دیا "تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ بینونو جیسے انسان جو اپنے فن میں یکتا ہیں قانون سے بالاتر ہیں۔" ہمیں وہ مراعات جو ہم اپنے کرو‌ڑ پتیوں کو دیتے ہیں اپنے فن کاروں کو بھی دینی چاہئیں۔

ہم ایک ٹیڑھے راستے سے اس پرانے نتیجہ پر پہنچ گئے ہیں کہ اخلاق کی کسوٹی اجتماعی فلاح و بہبود ہے۔ لیکن اس حیاتیاتی تصور سے ہمیں یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہئے کہ ہماری جبلتیں عقل و خرد کے مطابق ہیں۔ قدرت کسی اجتماع کو تسلیم نہیں کرتی سوائے بھڑوں کے چھتوں اور خاندانوں اور شکاری دستوں کے۔ بیکن' ڈارون اور کروپوٹکن یہ سمجھنے میں ضرورت سے زیادہ امید آفرینی سے کام لے رہے تھے کہ اجتماعی جبلتیں خود حفاظتی کی جبلتوں سے زیادہ مستحکم ہوتی ہیں۔ یہ امر شاید خاندان کے معاملے میں صحیح ہو' جہاں دوسروں کے لئے ایثار سے کام لینے کے لئے محبت اور تعریف کے علاوہ کسی اور خارجی محرک کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن خاندان کے احاطہ سے باہر آیئے تو انفرادی جبلتوں کا دور دورہ ہوتا ہے۔ اور شجاعت اور تہور اپنی ندرت کی وجہ سے قابل داد صفات بن جاتی ہیں۔ اسی لئے اجتماع' اجتماعی جبلتوں کو مذہب' تعلیم' اخبار اور بازاروں میں اصنام نصب کر کے مستحکم اور قوی بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ ہم سب سے زیادہ اجتماعی جنس بھی نہیں ہیں۔ ہم جنگل کی ذاتیت اور چیونٹیوں کی اجتماع پرستی کے درمیان کھڑے ہیں اور بس یہی کہہ سکتے ہیں کہ اجتماعی جبلتیں آہستہ آہستہ تعاون کی قدر بقا بڑھنے سے مضبوط ہو رہی ہیں۔ شاید ایک زمانے کے بعد وہ لوگ جو ذاتی ملکیت اور طاقت کے بھوکے ہیں ان لوگوں کی بدولت ختم ہو جائیں گے جنہوں نے دوسروں کے ساتھ ربط اور ہم آہنگی میں کام کرنا سیکھا ہے' لیکن ہم شاید وہ زمانہ نہ دیکھ پائیں۔

اگر رجعت پسند اس اخلاقی اصول سے خوش ہے تو اسے اس کے چند نتائج پر غور کرنا چاہئے۔ کوئی فعل غیر اخلاقی نہیں ہے جب تک کہ وہ دوسرے لوگوں کے لئے اذیت کا باعث نہ بنے۔ اس لئے بعض حالات میں خودکشی کوئی گناہ نہیں۔ اگر کسی شخص کو یہ یقین

ہو کہ موت ایک نعمت ہے اگر اس نے اپنی نسل کے فرائض ادا کر دیئے ہیں' اگر اس نے کسی بھی ذی حیات کو محتاج یا مظلوم نہیں بنایا تو اس کی اپنی زندگی اپنی ہے۔ اس سے جو وہ جو چاہے کرے' پھر اگر جبلت یا خوشی ہمیں پکارے تو ہم اس کی صدا پر لبیک کہہ کر کسی گناہ کے مرتکب نہیں ہوں گے؟ بشرطیکہ اس سے کوئی اور انسان مغموم نہ ہو۔ اور ہم کوئی ذہنی یا جسمانی نقصان نہ اٹھائیں جس سے نسل کو صدمہ پہنچے۔ گناہ کا تصور نسل کے افادہ کے تصور کے بغیر لایعنی ہے۔

آخر میں ہمیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ وہ تعاون جو اخلاق کی جان ہے۔ روح کی نشوونما سے اتنا نہیں جتنا اقتصادی زندگی کے لوازم سے پیدا ہوتا ہے۔ پھول زمین سے پیدا ہوتا ہے۔ اخلاق اجتماعی اور اقتصادی اکائیوں کی افراط سے پھیلتا ہے۔ وہ کل جس کے ساتھ اجزاء کو بقا کی خاطر تعاون کرنا ہے' ریلوں اور ہوائی جہازوں کے توسط سے وسعت پکڑتا ہے۔ کبھی تجارت اور کاروبار نے قبیلوں کو قوموں میں منسلک کر دیا تھا اور قبائلی اخلاق' بدمعاشوں کی آخری آماجگاہ بن گیا تھا۔ آہستہ آہستہ تجارت اور مشترکہ مفاد قوموں کو بین الاقوامی رشتوں میں جوڑ دیتا ہے اور بین الاقوامی مفاد کی طرح ڈالتا ہے۔ جلدی ہی ساری دنیا اس بات پر متفق ہو گی کہ قوم پرستی کافی نہیں ہے۔

۳۔ اخلاق کی کسوٹی

تو یہ ہے ہمارے اخلاق کی کسوٹی' جو ہر جگہ اور ہر وقت کے لئے صحیح ہے۔ لیکن ہر حل نئے مسائل پیدا کرتا ہے اور اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم کس اجتماع سے تعاون کریں۔ خاندان کے ساتھ' ریاست کے ساتھ' یا انسانیت اور زندگی کے ساتھ' اور اگر ہمارے مختلف "تعاون" آپس میں ٹکرا جائیں تو؟

جب ایک آدمی چالیس برس کا ہوتا ہے تو اس کے نزدیک اخلاق کا مطلب ہوتا ہے اپنے خاندان سے محبت۔ یہ نہیں کہ وہ اس تصور پر عمل بھی کرتا ہے۔ اگر وہ کرتا' تو جیسے کنفیوشس نے کہا تھا اسے کسی اور اخلاق کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ ریاست کے اختیارات بڑھنے سے والدین کے اختیارات کم ہو گئے ہیں اور صنعت کی ذاتیت نے والدین کے اختیارات کا شیرازہ بکھیر کر خاندان کو اپنے قدیم وظائف سے محروم کر دیا ہے۔ جب ہر خاندان اپنے پاؤں پر آپ کھڑا ہو سکتا تھا' اپنی غذا خود پیدا کرتا تھا' اپنے کپڑے خود بنتا تھا' اور شاذو نادر ہی دوسرے خاندانوں سے اس کی مڈبھیڑ ہوتی تھی' تب اخلاق کا یہ تصور کافی

تھا۔ اگر والدین شفیق تھے اور بچے فرمانبردار، تو ریاست ایک ایسی حقیر حقیقت تھی جسے نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ لیکن آج جبکہ خاندان کا ربط منتشر ہو چکا ہے، اور ہر فرد ریاست کے دوسرے افراد کے ساتھ اقتصادی اور اخلاقی روابط میں منسلک ہو چکا ہے، اور ہر فرد ریاست کے دوسرے افراد کے ساتھ اقتصادی اور اخلاقی روابط میں منسلک ہو چکا ہے تو قدیم فطری اخلاق کیونکر پنپ سکتا ہے؟ ایک شخص اپنے بچوں کے لئے فیاض ہے تو ان ملازموں کے ساتھ بے رحم، جنہیں اس نے شاید کبھی دیکھا بھی نہیں۔ ایک شخص اپنے ملک کو کوڑیوں کے دام فروخت کر دیتا ہے لیکن ایک اچھے شوہر اور اچھے باپ کی حیثیت سے اس کا شہرہ ہے۔ ایک شخص اپنی بیوی کو خوش کرنے کے لئے مالی معاملات میں فریب سے کام لیتا ہے لیکن کلیسا میں اسے بنظر احترام دیکھا جاتا ہے۔ ان حالات میں خاندانی اخلاق کافی نہیں ہے۔

تو کیا ہم ہمہ گیر ریاست کی اطاعت کریں؟ سیاست دان تو یہ کہتے ہیں کہ ریاست کے ارباب حل و عقد کی فرمانبرداری کرو۔ اور یہ جواب اتنا غیر معقول بھی نہیں۔ کیونکہ جب تک ایک بین الاقوامی نظام قائم نہیں ہوتا اور ہر فرد، تمام انسانیت کا جزو نہیں بنتا تب تک جو نظام موجود ہے، اس کی حفاظت کرنی چاہئے۔ اس سیارہ پر جہاں آبادی بے طرح بڑھتی اور پھیلتی جا رہی ہے، اور ہر سمت سے روزینہ کے اعلیٰ معیار کی طرف رخ کر رہی ہے اور جہاں افلاس ایک معمہ ہے، جو کسی طرح حل نہیں ہو پاتا، یہ اچھی بات ہے کہ زیادہ منظم اجتماع ایک کم منظم اجتماع کے مقابلہ میں محفوظ رہے، جس طرح انسان اپنے آپ کو حیوان کے مقابلہ میں محفوظ رکھتا ہے، کیونکہ ارتقا کے لئے یہ لازمی ہے کہ دنیا میں کہیں تو ایسا اعلیٰ طرز زندگی ہو کہ دوسرے لوگ اس تک پہنچنا چاہیں۔ جب تک صنعت کوئی بین الاقوامی ادارہ قائم نہیں کرتی تب تک ریاست کی اطاعت کرنا فرد کا اخلاقی فرض ہے۔

لیکن اس اجتماع کے اندر بھی ہمارا ضمیر ابھی تک ناپختہ ہے۔ ہمارے ہاں صنعت اور سیاست کا ایک اخلاق ہے تو محبت اور شادی کا ایک اور۔ اور جو لوگ جنسی بے راہ روی کی مذمت کرتے ہیں ممکن ہے وہی لوگ منافع باز اور غدار ہوں۔ ہم ایک بداخلاق دوشیزہ کو دیکھ کر کانپ اٹھتے ہیں، لیکن جو لوگ ہمارے اخلاق کی خرابی کے ذمہ دار ہیں انہیں ہم جیل نہیں بھیجتے۔ ہم کتابوں کو سنسر کرتے ہیں، لیکن اسلحہ سازوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو جنگوں کا باعث بنتے ہیں۔ تمام غیر جنسی مسائل میں سے جو مسئلہ ہمارے ذہن پر حاوی ہے شراب حاصل کرنے کا مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ اہم ہے لیکن یہ ہماری ناپختگی ہے کہ ہماری گفتگو

اور ہماری منصوبہ بندی شراب سے تعلق رکھنے والے دلائل سے لبریز ہو' لیکن زیادہ اہم معاملات ہماری عدم توجہی سے بگڑ جائیں۔

ہمارا نظام تاریخ میں پہلا عظیم ترین صنعتی نظام ہے۔ لیکن کیا اس کی تنظیم! اس کی صنعتی' تجارتی اور مالی منصوبہ بندی' ملک اور قوم اور انسانیت کے مفاد کے مطابق ہے؟ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ کاروبار پر اخلاقی حکم عاید نہیں ہوتا' تو کیا ہمارا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ہمارا صنعتی نظام بے رحم اور فرد کش ہے؟ ایک مشین ہے جو سستے داموں خرید کر مہنگے داموں بیچتی ہے' مدرسوں کو کارندے اور سپاہی بنانے کے کارخانوں میں بدل دیتی ہے۔ جو ملازمت کے لئے عورتوں کو مردوں پر اور بچوں کو عورتوں پر ترجیح دیتی ہے' جو لوگوں کی جسمانی اور اخلاقی صحت کر برباد کرتی ہے اور نفع حاصل کرتی ہے۔ اقتصادی زندگی کا یہ تصور مزدوروں میں بھی ہے اور سرمایہ داروں میں بھی۔ مزدور بھی اپنا اور اپنی جماعت کا فائدہ سوچتا ہے' ساری قوم کا فائدہ نہیں سوچتا۔ ہر جماعت کا اپنا نصب العین ہے۔ سیاست اور تجارت میں نصب العین محض دبی ہوئی آرزوؤں کا معقول لباس ہوتا ہے۔ اور ہمارے اکثر نظام اخلاق یہ بتاتے ہیں کہ دوسرے لوگوں کا کردار کس طرح کا ہونا چاہیے۔

نسو سنیر نے کہا تھا کہ اقتصادیات دولت کا علم ہے' فلاح و بہبود کا نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صنعت کا مقصد زیادہ سے زیادہ مقدار میں اشیاء پیدا کرنا ہے' چاہے سرمایہ دار اور خریدار کے لئے اس کے نتائج کچھ ہی ہوں۔ قدیم علم اس علم سے بہتر تھا' اگرچہ کارلائل کے لئے وہ ناخوشگوار تھا۔ اسے "سیاسی اقتصادیات" کہتے تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس زمانہ میں اس حقیقت کو تسلیم کیا جاتا تھا کہ اقتصادیات کا سیاست سے کچھ تعلق ہے۔ کبھی ہمیں یہ اجازت تھی کہ ہم انسانی۔ حقوق کا ذکر کریں۔ اگرچہ یہ لفظ آج بدنام ہے' اس میں یہ حقیقت مضمر تھی کہ فرد' اجتماع سے کچھ مطالبے کر سکتا ہے۔ اگر وہ پورے ہو جائیں تو ساری قوم کو فائدہ پہنچتا ہے۔ اگر کسی ملک کے لئے زراعت لازمی ہے تو کسانوں کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ حکومت سے امداد طلب کریں۔ انگلستان میں یہ شعور پیدا ہو رہا ہے کہ اگر کیمیاوی صنعت مزدوروں کی صحت کے لئے مضرت رساں ہے تو مزدوروں کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ حکومت سے اپنی حفاظت کے سامان طلب کریں۔ اگر اپنے پیشوں کی نوعیت کی وجہ سے عورتیں بانجھ ہو جاتی ہیں' تو یہ عین اخلاق ہے کہ حکومت ان عورتوں کی حفاظت کرے' جو مائیں بننا چاہتی ہیں۔ اگر سرمایہ دار ایسے اسالیب اختیار کریں' جن سے دوسرے ممالک امریکہ کے دشمن بن جائیں' تو ہمارا یہ حق ہے کہ ہم ان پر پابندیاں عائد

کریں- ہر قدم پر اقتصادی حالات- قوم کی تقدیر اور اخلاق پر اثر انداز ہوتے ہیں-

لیکن افسوس کہ صنعت پر پابندیاں عاید کرنے کا ہمارے پاس ایک ہی آلہ ہے' اور وہ ہے حکومت- اور حکومت کوئی اخلاقی ادارہ نہیں ہے- وہ تو لوگوں کے نمائندوں کا ایک ایسا مرکب ہے جس کی ترکیب ہمیشہ بدلتی رہتی ہے- لیکن یہ بہتر ہے کہ لوگ حکومت کی مدد کے بغیر تعاون اور امداد باہمی کی صفات سے آراستہ ہو جائیں- شاید سرمایہ دار اور مزدوروں کے درمیان فاصلہ کو عبور کرنے کی جو کوشش ہو رہی ہے' اسی میں نئے عہد کی امید پوشیدہ ہو' شاید لوگ ذاتیت کو ترک کر کے اکٹھے کام کرنے لگیں' مل کر کارندوں اور منتظموں کی تقرری کی ذمہ داری لیں- نفع نقصان میں برابر کے شریک ہوں- یہ تصویر اتنی ہی غیر حقیقی معلوم ہوتی ہے' جتنی کہ موجودہ اجارہ داری' اس وقت معلوم ہوتی تھی جب صنعت ابتدائی مراحل میں سے گزر رہی تھی-

ہماری جبلتیں خود غرض ہیں' لیکن اجتماعی لوازم ہمیں تعاون کی طرف مائل کرتے ہیں- آج کل کی صنعت' اس صنعتی نظام سے زیادہ رحم دل ہے جو سو برس پہلے رائج تھا- صنعت کا سرمایہ اپنے نفع کا ایک معقول حصہ ہسپتالوں' کالجوں' کتب خانوں اور سائنسی تحقیق پر صرف کرتا ہے- پارسا لوگ اب بھی ہم میں پیدا ہوتے ہیں- رحم دل لوگ اب بھی ہر قدم پر ہمیں ملتے ہیں- باحیا لڑکیاں اگر ہم ان کی جستجو کریں تو اب بھی مل جاتی ہیں- ہزاروں گھروں میں صابر مائیں بھی نظر آئیں گی- اور اخباروں میں جرائم کی خبروں کے ساتھ ساتھ ہمیں نیکی اور شجاعت کی مثالیں بھی دکھائی دیتی ہیں- سیلاب آتا ہے تو ہزاروں لوگ سیلاب زدوں کی مدد کے لئے جا پہنچتے ہیں- لاکھوں مالی معاونت کرتے ہیں- ایک قوم فاقہ زدہ ہے تو اس کے دشمن اسے خوراک بہم پہنچاتے ہیں- سیاح کھو جاتے ہیں تو دوسرے سیاح انہیں بچانے کی خاطر جانیں دے دیتے ہیں- ابھی تک انسان میں نیکی کی جو ممکنات مضمر ہیں' ان کا اندازہ کسی نے نہیں لگایا- ہمارے انتشار اور ہمارے جرائم کی تہ میں انسانی روح کی فطری خوبیاں موجود ہیں- جب یہ انتشار ختم ہو گا- اور ایک نیا اخلاقی نظام جنم لے گا تو ہماری فطرت کے محاسن درخشاں ہوں گے-

ہمہ عالمگیر اخلاق

غالباً اس وقت جب کہ ہم کشاکش حیات سے علیحدہ ہو کر خوردہ گیری کر رہے ہیں' ایک بین الاقوامی نظام زندگی کی تہوں میں سے ابھر رہا ہے- نیا سرمایہ اور نیا مالی نظام اسے

بنا رہا ہے' کیونکہ اب وہ چاہتا ہے کہ خریدار متمول اور خوش حال رہیں۔ اب مز... بیز... بلکہ سرمایہ دار جنگ کے خلاف ہیں۔

دنیا اسی دن کی منتظر تھی۔ تجارتی مبادلہ اور مالیات' جس نے ریاستوں و استعمارت... میں متحد کیا تھا۔ اب ایک بین الاقوامی اقتصادی نظام قائم کر رہی ہے۔ جس طرح ذور... اعلیٰ جذبات صحیح جسمانی بنیاد کے بغیر غیر مستحکم رہتے ہیں' اسی طرح اخلاقی اور سیاسی نصب العین فقط مستحکم اقتصادی بنیادوں پر ہی استوار ہو سکتے ہیں۔ جب ہم ایک بین الاقوامی اقتصادی نظام قائم کر لیں گے تو ہم بین الاقوامی سیاسی نظام بھی قائم کر سکیں گے اور یہ سیاسی نظام عالمگیر اخلاق کا پیش خیمہ ہو گا۔ ضمیر حکومت کی پیروی کرتا ہے۔ وہ ضبط و نظم میں ابھرتا ہے اور اس سے خوگر ہو کر پھلتا پھولتا ہے۔ آج ایک بین الاقوامی نظام پیدا ہو رہا ہے۔ اس لئے آج جب قومی مفاد انسانیت کے مفاد سے ٹکرائے تو ہمیں ہر حالت میں انسانیت کی حمایت کرنی چاہئے کیونکہ یہی نیک زندگی کا راز ہے۔ حکمت کا رہبر اور حقیقت کا سرچشمہ ہے۔

اس لئے عالمگیر نظام کو حاصل کرنے کی خاطر ہمیں یہ تجربہ کی پشت پناہی کرنی چاہئے۔ سائنس کو ملکی حدود کو نظر انداز کر کے پھیلنا چاہئے۔ مزدوروں کو جنگ کے خلاف متحد ہو جانا چاہئے۔ آیئے ہم اپنی بے نیازی کو ختم کر دیں۔ میرابو نے کیا خوب کہا تھا کہ "ادنیٰ اخلاق اعلیٰ اخلاق کا دشمن ہوتا ہے۔" جب تک جنگ کا خطرہ موجود ہے ہم اپنے بچوں میں عالمگیر ضمیر کی تربیت نہیں کر سکتے۔ لیکن ہم آزاد خیال لوگوں کو کون سی چیز اس بات سے روکتی ہے کہ ہم عالمگیر اخلاق کو قبول کریں اور زندگی سے وفا کا پیمان باندھیں؟

لیکن آزاد خیال لوگوں کی ذاتیت انہیں متحد نہیں ہونے دیتی۔ امریکہ کا بہترین وکیل کلیرنس ڈیرو ڈرتا ہے کہ عالمگیر نظام بھی ایک آمریت میں تبدیل ہو جائے گا۔ وہ کہتا ہے کہ ملکوں کی علیحدگی اور کبھی کبھار کی جنگ ہزار درجہ بہتر ہے اس آمریت سے جو لوگوں کے خیالات اور اعمال پر مکمل طور پر حاوی ہو جائے۔ یہ اندیشہ بجا ہے لیکن جس طرح ہم نے یہ خطرہ نو آبادیات کو متحد کرنے میں اٹھایا تھا اسی طرح ہمیں قوموں کو متحد کرنے میں بھی اٹھانا پڑے گا' کیونکہ فقط ایک دن کی جنگ میں ہی سائنس فوجوں شہروں اور زندگی کو برباد کر دے گی اور نظام' آزادی اور فکر سب کو بربریت کے درجہ پر لے آئے گی۔ کمزور حکومتوں میں نہیں بلکہ مستحکم حکومتوں میں آزادی کا خطرہ مضمر ہے۔ جب ایک ریاست مخدوش حالت میں ہوتی ہے تو وہ آزادی کو ختم کر دیتی ہے۔

۵۔ جنس اور اخلاق

ذاتیت پسند افراد کو اخلاق کی یہ بدنیاتی تعریف پسند نہیں آئے گی کہ اخلاق جزو کے کل سے ربط کا نام ہے۔ وہ احتجاجاً" کہے گا کہ اخلاق ذہانت ہے اور یا شاید وہ اناطول فرانس کی طرح یہ کہے کہ حفظان صحت واحد اخلاق ہے۔ لیکن ایک مجرم ہر طرح صاف رہ کر بھی منشیات فروخت کر کے دولت جمع کر سکتا ہے۔ صحت مند بدمعاشی شادی کی جگہ تعیش' بچوں کی جگہ کتوں اور قومی طاقت کی جگہ قومی انحطاط کو دے سکتی ہے۔ ذہانت جبھی کافی ہو سکتی ہے جب وہ مکمل ہو اور حکمت بن سکے۔ لیکن ہم اس کی تکمیل کا کب تک انتظار کریں؟ لوگ فلسفی بننے سے پہلے ہی چوری کر کے' قتل کر کے مر جاتے ہیں۔ نہیں۔ ہمیں جوانوں سے ابتدا کرنا ہو گی اور انہیں تعاون کا سبق دینا ہو گا۔ ہمیں نوجوانوں کی عادات میں تعاون کو راسخ کرنا ہو گا۔ ہمیں ذہین نوجوانوں کو بھی "کل" کا سبق سکھانا ہو گا۔ غالباً' بالاخر اس کا نتیجہ بھی ذہانت سے مختلف نہیں ہو گا۔ فکر اجتماع کو احاطہ میں لے گا اور سوجھ بوجھ سے کل کے ساتھ وفاداری کا احساس پیدا ہو گا۔

نوجوان سمجھ جائیں گے کہ اجتماع کی نوعیت' نسل کی خصوصیات اور بچوں کی تربیت پر منحصر ہے۔ اور ہماری جنسی آرزوؤں کو اخلاقی پابندیاں سہنی پڑیں گی۔ ہم اپنی بداخلاقی کو برداشت کر سکتے ہیں۔ ہم امرد پرستی' حیوانوں کی جنسی زندگی میں دلچسپی لے سکتے ہیں' اور انہیں ایک نئے اخلاقی نظام کے تجسس اور جستجو کی ایک منزل سمجھ کر نظرانداز کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ اخلاق جو اجتماع سے بے نیاز ہے' ہمارے دلوں میں کبھی راہ نہیں کر سکتا۔ ہم ہر اجتماع دشمن فعل کے بعد ایک پاکیزہ اور مستحکم اخلاقی نظام کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ ہم وہ زندگی چاہتے ہیں جس میں جسمانی لذتوں کے علاوہ رفاقت اور تعاون کی خاموش تسکین بھی ہو۔ ہم صحت مند حیوان بننا چاہتے ہیں' لیکن ہم اس کے ساتھ اچھے شہری بھی بننا چاہتے ہیں۔

کیا ہمارے اخلاقی انتشار اور بے راہ روی کو ضبط و نظم اور ذمہ داری میں تبدیل کرنے کوئی سبیل موجود ہے؟ ہمیں خیالات کے اثر کے بیان میں مبالغہ نہیں کرنا چاہئے۔ جنسی تعلقات کی نوعیت میں یہ تبدیلیاں ہمارے فکر کی پیدا کی ہوئی نہیں ہیں اور نہ یہ ہمارے استدلال سے دور ہوں گی۔ ہم اقتصادی انقلاب کے غیرذاتی عمل سے دوچار ہیں' جو ہماری اخلاقی زندگی کو متاثر کر رہا ہے اور اگر ہمارا فکر ان اسباب تاریخ کے مطابق نہیں ہو گا تو

ہم اپنی نیک نیتی کے باوجود تغیر کے اس سیلاب میں تن تنہا اور بے اثر کھڑے رہ جائیں گے۔

لیکن چیزوں کی تھاہ پانے کی تمنا ہمیں کب چین لینے دیتی ہے؟ ہمیں اس اخلاقی انقلاب کے اسباب و نتائج کا تجزیہ کرنا چاہئے۔ ہم اس امید کو ترک نہیں کر سکتے کہ اس شعبہ زندگی میں بھی علم طاقت ہے۔ آیئے! ہم ابتدا سے شروع کریں اور شعلہ عشق کو سمجھنے کی کوشش کریں جو فرد کی فنا اور نسل کی بقا کا باعث بنتا ہے۔ آیئے! ہم جنس کا مطالعہ کریں کہ مرد اور عورت کے درمیان محبت اور نفرت کے جذبات کس طرح اخلاقی مسائل پیدا کرتے ہیں۔ آیئے! ہم آزاد منش عورت کو دیکھیں کہ اس کی آزادی نے ہمارے زمانہ کے اخلاق اور نسل انسانی کے مستقبل کو کس طرح متاثر کیا ہے؟ تب ہم شادی کی ناکامی کے مسئلہ پر غور کر سکیں گے اور اسے انسانی مسرت اور اجتماعی فلاح کے مطابق بنانے کے متعلق چند تجویزیں پیش کر سکیں گے۔ آخر میں ہم اخلاق کو زمین پر لا کر بچوں کی تربیت اور شخصیت کے نشوونما پر غور کریں گے۔ اس طرح یہ مہم پایہ تکمیل تک پہنچے گی۔

باب ہفتم

عشق

ا۔ ہم عشق کیوں کرتے ہیں؟

عشق کو ہر ایک نے متفقہ طور پر انسانی تجربہ کا دلچسپ ترین پہلو تسلیم کیا ہے۔ اس کے باوجود یہ بات تعجب خیز ہے کہ بہت کم لوگوں نے اس کے ماخذ اور اس کے ارتقا کا مطالعہ کرنے کی طرف توجہ کی ہے۔ یہ موضوع ہر ادب کی جان ہے اور تقریباً ہر شخص نے اس پر خامہ فرسائی کی ہے۔ شعر' افسانہ' تمثیل' یہ ہر صنف ادب کا موضوع ہے۔ لیکن اس موضوع کا معروضی مطالعہ بہت کم کیا گیا ہے کہ فطرت میں اس کا سرچشمہ کیا ہے اور ابتدائی حیوان کے سادہ وصال سے لے کر ڈانٹے کی سپردگی' پٹراک کی سرمستی اور ہیلویز کی ایبی' لارڈ سے وفاداری تک اس نے ارتقا کی منزلیں کیوں کر طے کیں۔

ہاں' مرد' عورتوں کی آرزو کرتے ہیں اور محبت۔ "جو سورج اور دوسرے سیاروں کی محرک ہے۔" ہر روح کو موت سے پہلے ایک ہنگامی سرور سے آشنا کرتی ہے لیکن کیوں؟ شاعری نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ محبت ہر سینہ میں بیدار ہوتی ہے لیکن اس کے شباب کا پوشیدہ سرچشمہ کہاں ہے؟ ایک نوجوان ان زلفوں سے کیوں متاثر ہوتا ہے جو نوکیلی آنکھوں پر لہراتی ہیں یا کسی دوشیزہ کے لمس سے کیوں چونکتا ہے؟ اس لئے کہ دوشیزہ حسین ہے؟ لیکن کیا محبت حسن پیدا نہیں کرتی' جس طرح حسن محبت پیدا کرتا ہے؟ نوجوان محبت کیوں کرتا ہے؟

انسانی زندگی میں اس سے زیادہ کوئی عجیب بات نہیں ہے کہ مرد بڑھاپے سے پہلے عورتوں کے پیچھے بھاگنے پر مائل رہتے ہیں۔ یا یہ کہ عورتیں' موت سے پہلے پیچھا کروانے پر مائل رہتی ہیں۔ انسانی کردار میں اس سے زیادہ کوئی مستقل صفت نہیں کہ مرد کی نگاہ ہر لحہ عورت پر پڑتی رہتی ہے۔ اس عیار حیوان' مرد کو دیکھو کہ بظاہر تو اخبار پڑھ رہا ہے لیکن اس کی نظر اپنے شکار پر ہے۔ اس کی باتیں سنو۔ وہ اس دائمی تجسس کے محور کے گرد گھومتی ہیں۔ اس کے تخیل کا تصور کرو۔ کتنی بے تابی سے وہ اس مقناطیسی شعلہ کا طواف

کرتا ہے۔ کیوں؟ یہ سب کیونکر ہوا؟ اس شدید آرزو کا آغاز کیا ہے اور کن منازل کو طے کر کے یہ اپنی موجودہ سربلندی اور دیوانگی تک پہنچی ہے؟

آیئے ہم جرات رندانہ کے ساتھ ان سوالوں کے جواب دریافت کریں' جنہیں محبت کرنے والے کبھی نہیں پوچھتے۔ آیئے ہم۔ شینڈ ہال' ایلس' مول' بولش' ڈی گورمون' فرائیڈ اور شیلے ہال کے خیالات جمع کر کے دیکھیں کہ وہ کوئی مربوط خاکہ بناتے ہیں یا نہیں۔ ایک ایسا خاکہ' جس میں محبت کا وظیفہ اور اہمیت واضح ہو جائے۔ آیئے ہم اس گزرگاہ پر دوبارہ چلیں۔ جسے طے کر کے محبت ہم تک پہنچی ہے۔

۲۔ ایک حیاتیاتی نظریہ

جس طرح بھوک اور محبت ایک فرد کی زندگی میں یکے بعد دیگرے پیدا ہوتی ہیں۔ اسی طرح زندگی کی گردش دو محوروں' یعنی غذا اور تناسل کے گرد ہوتی ہے۔ ہم غذا کھاتے ہیں تاکہ ہم زندہ رہیں' بلوغت حاصل کریں اور ولدیت کے ذریعہ زندگی کی تکمیل کریں۔ اور تناسل میں ہم اپنے فانی جسم سے نئی زندگی کی تخلیق کرتے ہیں' تاکہ وہ پھلے پھولے اور ہم سے بہتر زندگی بسر کرے۔

غالباً یہ نشوونما کا جذبہ ہے جو ایک سادہ ترین خلیہ کو دو حصوں میں بٹ جانے پر مجبور کرتا ہے۔ خلیہ کا جثہ اس سطح سے زیادہ جلدی پھلتا پھولتا ہے' جس کے ذریعہ اسے غذا میسر آتی ہے۔ اس تناسب کو بحال کرنے کے لئے وہ دو حصوں میں منقسم ہو جاتا ہے اور سطح تقسیم کے ذریعہ پھر جثہ کے مطابق ہو جاتی ہے۔ یہ توجیہہ ایک نظریہ ہے' لیکن تقسیم ایک حقیقت ہے۔ جراثیم' جو کہ حقیر ترین حیوان ہیں' اس سرعت سے اپنے آپ کو تقسیم کرتے ہیں کہ انسانی ذہن اس کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔ ایک بدلو بھی پراسرار طریقہ سے دو بدلو بن جاتے ہیں۔ یہ تناسل تو ہے لیکن اس منزل پر جنسی تفریق عمل میں نہیں آئی اور غالباً ابھی محبت کا آغاز نہیں ہوا۔

حیوانوں کی دو میں تقسیم ہی کے ذریعہ' قدرت' زندگی کو قائم رکھتی ہے اور اگرچہ وہ اس اصول میں ہزاروں پیچیدگیاں پیدا کرتی ہے' وہ اسے پوری طرح ترک نہیں کرتی۔ ابتدائی حیوانوں میں یہی اصول کار فرما ہے۔ غنچے اسی اصول کے مطابق کھلتے ہیں۔ ایک ننھا پھول ایک پرانی شاخ سے پھوٹتا ہے اور پودے کی زندگی سے زندگی حاصل کرتا ہے۔ جب وہ بالغ ہوتا ہے تو اسی پودے کے مقابل میں غذا کی طرف جھپٹتا ہے جس کی شاخ پر وہ پھلا

پھولا ہے۔ آخر وہ شاخ سے علیحدہ ہو جاتا ہے اور کسی اور جگہ نئی جڑیں پکڑتا ہے۔

کبھی کبھی ابتدائی حیوانوں کے خلیے ایک جلاٹینی مادہ میں دبے رہتے ہیں اور ایک نوآبادی قائم کرتے ہیں اور پھر ایک نہایت عجیب و غریب تقسیم کار رونما ہوتی ہے۔ خارجی خلیے غذا حاصل کرنے میں اور داخلی خلیے تناسل کے عمل میں معروف رہتے ہیں۔ نوآبادی ایک اجتماعی تنظیم بن جاتی ہے، جس میں مختلف حصے ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں۔ زندگی کے آغاز ہی میں ہمیں "مادۂ حیات کی علیحدگی" کی مثال ملتی ہے جس پر وائیزمن نے اپنے نظریہ وراثت کی بنیاد رکھی۔

اگرچہ تقسیم عالمگیر ہے، وہ کافی نہیں ہے۔ ایک وقت ایسا آتا ہے جب کئی نسلوں کے بعد وہ ابتدائی حیوان جس کی کئی بار تقسیم ہو چکی ہو، اس طاقت سے محروم ہو جاتا ہے، جو نئے حیوانات پیدا کرتے ہیں۔ اس منزل پر ایک نیا واقعہ رونما ہوتا ہے۔ ایک ہی قسم کے دو کمزور ابتدائی حیوان آپس میں ملتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک مادہ حیات بہاتا ہے جو دوسرے میں جذب ہو جاتا ہے۔ پھر وہ علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ اس اتصال کے بعد وہ پھر تومند اور طاقتور ہو جاتے ہیں اور پھر وہی تقسیم کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ابتدائی حیوان بھی انسانوں کی طرح اور انسانوں کے اجتماعوں کی طرح زندہ رہتے ہیں۔ جب مرد شادی کرتا ہے وہ مضبوط ہو جاتا ہے۔ جب نسلیں ملتی ہیں تو وہ زندہ تر ہو جاتی ہیں۔

یہ معمولی اتحاد چاہے کتنا ہی اہم ہو۔ یہ مختلف افراد کے اس وصال سے بہت مختلف ہے جو شجر محبت کی جڑ ہے۔ کیا ہم حقیر ترین حیوانوں میں اس کا مماثل پا سکتے ہیں؟ پینڈورینا میں اس کا مماثل ملتا ہے جو کہ سولہ خلیوں کا جانور ہے۔ ہر خلیہ دو مختار خلیوں میں تقسیم نہیں ہوتا بلکہ ایک مہین ذروں میں تقسیم ہوتا ہے جو ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں اور جب ان ذروں میں سے دو ذرے آپس میں ملتے ہیں تو ایک نیا حیوان وجود میں آتا ہے ایک اور ابتدائی حیوان یوڈورینا کی طرف توجہ کیجئے۔ اس نسل میں ہر خلیہ دو غیر مماثل ذروں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ کچھ ان میں سے بڑے اور خاموش ہوتے ہیں اور کچھ چھوٹے اور چست ہوتے ہیں اور جب تک چھوٹا ذرہ بڑے ذرے سے نہ ملے ایک نیا حیوان وجود میں نہیں آتا۔ یوڈورینا میں قدرت جنس کو دریافت کرتی ہے۔

کچھ وقت کے لئے وہ جھجکتی رہی اور وول ووکس میں ہمیں تناسل کے پرانے طریقے اور نئے طریقے کا امتزاج ملتا ہے ایک نسل میں نوآبادی کے خلیے روایتی تقسیم کے ذریعہ بنتے ہیں لیکن دوسری نسل کے خلیے یوڈورینا کی طرح غیر مماثل حصوں میں تقسیم ہو جاتے

ہیں اور اس نسل کے دو غیر مماثل حصے مل کر تیسری نسل پیدا کرتے ہیں۔ نئی تہذیبیں جب تک قدیم سانچوں میں ڈھالی نہ جائیں، مستقبل طور پر قائم نہیں ہو سکتیں۔ (ہمارے نوجوان یہ سبق اس وقت سیکھتے ہیں جب وہ جوانی کھو چکے ہوں) اس طرح قدرت نے ارتقاء کی مختلف منازل میں دو جنسوں کو علیحدہ کیا اور ان کے وصال کے لئے جذبہ محبت تخلیق کیا۔

اس حیاتیاتی نظریہ کی رو سے مسئلہ محبت کو کیا اہمیت حاصل ہے؟ افلاطون کا "اریسٹو فینز" سِمپوزیم میں مزاحاً" کہتا ہے "ایک زمانہ وہ تھا جب دونوں جنسیں ایک تھیں لیکن مردوں کی بدطینتی کی وجہ سے خدا نے انہیں دو حصوں میں کاٹ دیا۔ اس کچے سیب کی طرح جسے اچار کے لئے دو حصوں میں کاٹا جاتا ہے یا اس انڈے کی طرح جسے ایک بال کے ذریعہ دو ٹکڑوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ہم میں سے ہر شخص اس مرد کا نصف ہے اور ہمیشہ دوسرے نصف کی تلاش میں سرگرم ہے۔ تکمیل کی آرزو اور تجسس کا نام محبت ہے۔" یہ ایک جامع تعریف ہے اور اس عظیم تمثیل نگار کی اس تمثیل کی ایک عالمانہ توجیہہ کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک زمانہ وہ بھی تھا۔ جب دونوں جنسیں ایک ہی جسم میں آباد تھیں۔ پھر فطرت نے انہیں دو حصوں میں تقسیم کر دیا اور آج ہر حصہ اپنے آپ کو نصف محسوس کرتا ہے اور وصال اور تکمیل کا آرزومند ہے۔

لیکن یہ "محبت کیا ہے؟" کا ایک تصوف آمیز جواب ہے۔ یہ جواب ایک حقیر ترین حیوان میں ایک اعلیٰ حکیمانہ شعور کے وجود کو فرض کر لیتا ہے۔ غالباً جب ایک علیحدہ حیوان میں تذکیری صفات پیدا ہوئیں تو بہت کم حیوان دوسرے نصف کی تلاش کرتے تھے اور وہ حیوان جو دوسرے نصف کی تلاش کرتے اور اس تلاش میں کامیاب رہتے۔ نئی نسلوں کی تخلیق کے ذمہ دار بنتے اور ہر نسل میں فقط عشاق۔ یعنی وہ افراد جو اپنے بہتر نصف سے ربط کے ساتھ تکمیل حاصل کرتے تھے۔ زندگی کے سرچشمہ میں اپنے جذبہ وحدت کو سمو دیتے۔ وہ حیوان جو اپنے اندر یہ نادر تحریک محسوس نہ کرتے یا تھوڑی شدت سے کرتے بغیر اولاد کے فنا ہو جاتے اس لئے یہ تحریک ہر نئی نسل کے ساتھ شدید تر ہوتی گئی اور آہستہ آہستہ موت سے زیادہ قوی جذبہ غالب بنتی گئی۔ یہ جذبہ اپنے تنوع پسند تسلسل کے ساتھ موت کو بھی فریب دیتا رہتا ہے۔ غالباً ––– غالباً ––– یہی وہ راہ تھی جس کے ذریعے محبت ہم تک پہنچی۔

۳۔ بدنیاتی بنیاد

یہ تو رہا سلسلہ حیات میں محبت کا ارتقاء۔ اب ہم فرد کی زندگی میں اس کی نشوونما[۲]

مطالعہ کریں گے۔ ارسطو نے کہا تھا اگر تمہیں کسی چیز کو سمجھنا ہو تو اس کی ابتدا اور نشوونما کا مشاہدہ کرو۔

کیا بچوں میں کوئی ایسی تحریک ہے جو جوانوں کے جذبہ محبت سے ملتی جلتی ہے؟ فرائیڈ نے اس سوال کا جواب حتمی طور پر اثبات میں دیا ہے اور انگوٹھا چوسنے اور ماں کے سینے لگ کر دودھ پینے کے جنسی امکانات پر ذہنی امراض کے عجیب و غریب محلات تعمیر کئے۔ لیکن جب حقائق کو نظریوں سے الگ کیا جائے تو حقائق کی مقدار آٹے میں نمک کے برابر رہ جاتی ہے۔ واٹسن اور اس کے رفقا نے سینکڑوں بچوں کو خاصی مدت کے لئے زیر مشاہدہ رکھا لیکن انہیں ان میں کسی قسم کا جنسی کردار نظر نہیں آیا۔

لیکن تھوڑے عرصہ کے بعد ہی بچہ جنس مخالف میں دلچسپی کا اظہار کرتا ہے۔ وہ جنس مخالف کی جسمانی خصوصیات معلوم کرنے کی کس قدر خواہش رکھتا ہے اور وہ خواہش پردہ پوشی سے شدید تر ہو جاتی ہے۔ ہر جنس دوسری جنس کے لئے طلسم بن جاتی ہے اور ایک حجاب آمیز کشش کا باعث بنتی ہے۔ غالباً اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوتا اور اگر محبت عنفوان شباب سے پہلے پیدا ہو جائے تو وہ ایڈی پس الجھن کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ لڑکا ماں سے محبت کرنے لگتا ہے اور لڑکی باپ سے لیکن یہ محبت وہ ہولناک چیز نہیں جو فرائیڈ کے ذہن میں تھی۔ یہ کوئی الجھن نہیں ہے اس لئے کہ نہ یہ غیر شعوری ہے اور نہ ایک مریضانہ کیفیت۔ قدرت اس طریقے سے بچے کو صحت مند محبت کے لئے تیار کرتی ہے۔ اگر یہ تعلق غلط ہو جائے یعنی لڑکا باپ سے محبت کرنے لگے، یا لڑکی ماں سے، تو اس حالت میں ماہرین امراض ذہنی واقعی تشویش میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔

عنفوان شباب میں محبت اپنا پہلا واضح گیت گاتی ہے۔ عنفوان شباب میں مرد کے جسم پر بال اگتے ہیں۔ بالخصوص اس کے سینے پر جن پر وہ وحشیوں کی طرح ناز کرتا ہے۔ بالوں کی نوعیت اور ان کی مقدار، تناسل کی طاقت کے ساتھ گھٹتی بڑھتی ہے اور جسمانی طاقت کے عروج کے زمانے میں یہ کمال حاصل کرتی ہے۔ عنفوان شباب میں بالوں کے وفود کے ساتھ مرد کی آواز میں گہرائی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ ان صفات کو ہم ثانوی جنسی صفات کہہ سکتے ہیں۔ برعکس اس کے نوجوان لڑکی کو فطرت جسم کا وہ نرم اور گداز زیر و بم عطا کرتی ہے، جو ہر نظر کو مسحور کرتا ہے۔ اس عمر میں لڑکی کے کولھے بھر جاتے ہیں تاکہ اسے بچے جننے میں سہولت ہو۔ سینہ ابھر آتا ہے تاکہ بچے اس سے اپنی غذا حاصل کریں۔

ان ثانوی صفات کا سبب کیا ہے؟ کوئی نہیں جانتا لیکن پروفیسر اسٹارلنگ کا یہ خیال

قابل قبول ہے کہ عنفوان شباب میں خون میں ایک ایسا مادہ پیدا ہوتا ہے جو جسمانی اور ذہنی انقلاب کا باعث بنتا ہے۔ اس زمانے میں محض جسم ہی کو نئی طاقتیں میسر نہیں آتیں بلکہ ذہن اور شخصیت بھی ہزار طریقے سے متاثر ہوتی ہے۔ رومین رولاں نے کہا تھا کہ "زندگی میں بعض منازل ایسی آتی ہیں جب مرد کے اندر ایک خاموش جسمانی انقلاب رونما ہوتا ہے۔" یہی حالت عورت کی ہے۔ عنفوان شباب اہم ترین انقلاب ہے۔

نئے احساسات جسم اور روح میں موجزن ہوتے ہیں۔ تجسس ذہن کو آگے لے جاتا ہے اور حیا اسے پیچھے کھینچتی ہے۔ نوجوان لڑکے لڑکیوں کی محفل میں شرماتے ہیں اور لڑکی کے چہرے پر حجاب کی سرخی دوڑنے لگتی ہے۔ بیوقوف بچے یکایک شوخ بن جاتے ہیں۔ وہ بچے جو پہلے فرمانبردار ہوتے ہیں' یکایک بغاوت پر آمادہ ہیں۔ خود نگری کے دور آتے ہیں اور تفکر اور خوابوں کی کیفیتیں امڈتی ہیں' تخیل میں پھول کھلتے ہیں اور شعر و شاعری کا چرچا ہوتا ہے۔ اس عمر میں ہر نوجوان گویا ایک فنکار ہو جاتا ہے اور غیر فانی شہرت کے خواب دیکھتا ہے۔ ذہن کی ہر طاقت بیدار ہوتی ہے اور عقل از سر نو کائنات کے مسائل پر یلغار کرتی ہے۔ اگر عقل اپنی جستجو جاری رکھے تو فرد ایک سائنس دان یا فلسفی بن جاتا ہے۔ اگر وہ یہ جستجو ترک کر دے تو وہ ایک کامیاب انسان بن جاتا ہے۔ اس وقت ممکن ہے کہ وہ کوئی اعلیٰ منصب حاصل کر سکے۔

یہی وہ زمانہ ہے جب محبت کی سرشاری فن اور اجتماعی سپردگی کی آبیاری کرتی ہے۔ محبت حسن کا تصور کرتی ہے' حسن کی جستجو کرتی ہے اور کبھی کبھی حسن کی تخلیق کرتی ہے۔ محبت نیکی کا تصور کرتی ہے۔ نیکی کی جستجو کرتی ہے اور نیکی کی تخلیق میں عزم بالجزم سے کام لیتی ہے۔ اگر اس وقت مذہب اپنے فرسودہ عقائد پیش کرے تو بہت ممکن ہے کہ نوجوانوں کا جوش استدلال ان کو پارہ پارہ کر دے۔ اگر مذہب اپنے آپ کو نیکی کی جستجو کے روپ میں ڈھالے تو وہ ایک نوجوان روح کی عینیت کو متاثر کرتا ہے اور شخصیت کا جزو لاینفک بن جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ عنفوان شباب ایک شاندار زمانہ ہے۔ یہ عقل کا عہد ہے اور اس کے ساتھ ساتھ جذبات کا زمانہ ہے۔ ذہن اور قلب کی نئی دولتیں ہر طرف خیالات کے چھینٹے اور محبت کا دفور بکھیرتی ہیں۔ فقط اسی عہد میں دنیا اجنبی مگر حسین اور بعید مگر قابل تسخیر معلوم ہوتی ہے۔ اس زمانے کے بعد ہر زمانہ اس زریں عہد کو یاد کرتا ہے۔ یہ ہر طاقت کا عہد بہار ہے اور ہر ارتقا کا عہد تخم ریزی۔ اس زمانے میں تمام اعلیٰ جذبات تربیت

پاتے ہیں- یہ احیائے حیات ہے-

وہ کونسی غیر مرئی طاقت ہے جو لڑکے کو ہراساں مگر کشاں کشاں لڑکی کی طرف لے جاتی ہے اور لڑکی کو طلب اور کشش کے باوجود لڑکے سے دور رہنے پر مجبور کرتی ہے ہمارے گوشت پوست کے نہاں خانوں میں وہ کونسا طلسم کار فرما ہے جو ہماری زندگی کے حسین ترین پھول کی تخلیق کرتا ہے- یعنی مرد اور عورت کی محبت-

بدن کا ریشہ ریشہ توانائی سے ابلا پڑتا ہے- تمام جسم رکی ہوئی نشوونما کی خلش اور زندگی کی بے تاب وسعت پسندی کو محسوس کرتا ہے اور دل ایک شیریں مگر گراں اداسی سے معمور ہے- غالبًا وہ اپنے نامکمل ہونے کے احساس کے تلے دبا ہوا ہے اور تکمیل کا آرزو مند ہے- اس خلش کی حالت میں نوجوان ان ہزاروں چیزوں کے متعلق حساسیت رکھتا ہے جنہیں وہ پہلے نظر انداز کر دیتا تھا- کچھ آوازیں اسے متاثر کرتی ہیں- نغمہ اور موسیقی اسے بے حد مسحور کرتے ہیں اور آواز میں ایک نئی نرمی اور نزاکت پیدا ہو جاتی ہے- جو عاشق کے لئے باعث نشاط بنتی ہے- چند خوشبوئیں بھی دل کو لبھاتی ہیں- پھلتے پھولتے جسم کی حلاوت' صفائی کی مہک' عطر کی جوش آفریں تندی یہ سب محبت کے نشے کو تیز کرتی ہیں- چند حرکات دل کو موہ لیتی ہیں- رقص کا ترنم اور شدت' کھلاڑیوں کی پر اعتماد حرکات کا بہاؤ' دوشیزاؤں کی پر کیف ادائیں' اور سب سے زیادہ چند منظر دل پہ نقش ہو جاتے ہیں- محبت کے عہد میں رنگ طوفان لاتے ہیں- اور سرخ رنگ طلب اور ہوس کو شدید تر کرتا ہے- نوجوان محبت کے عہد میں اپنے جسم کو آراستہ کرتا ہے- جس طرح پرندے اور حیوان عہد محبت میں حسین اور رنگین بن جاتے ہیں- وحشی انسان اپنے جسموں پر رنگ ملتے اور انہیں مجروح کرتے ہیں تاکہ اپنے حواس کو برانگیختہ کریں اور جنس مخالف کی توجہ اپنی طرف جذب کریں- لباس محض افادی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ اس زمانے میں ایک سامان ترمیع' ایک کنایہ اور ایک محرک احساس بن جاتا ہے- شجاعت و تہور کے کارنامے نازک دلوں کو بھاتے ہیں اور ہر گداز جسم کی خمیدہ لہریں آرزو کو تڑپاتی ہیں- خوشبو' آواز' لمس' دید' نغمہ' رقص' اور متنوع نمائش کے یہ نئے تجربات جوانوں کے خیالات میں ملتے ہیں اور محبت کی تحریک کرتے ہیں-

یکایک یہ تمام تجربات اور کیفیات یک جا ہو جاتی ہیں- نسل کی ضروریات جسم اور روح کی پیاس میں ظاہر ہوتی ہیں' اور محبت جنم لیتی ہے- محبت دل میں یوں ابھرتی ہے جیسے صبح کے وقت آسمان پر روشنی اور ہر شخص کو حرارت اور نور سے مالا مال کرتی ہے- اور لیو

کرسٹس یہ گیت گاتا ہے۔

"اے وینس! اے حسن کی دیوی، تو فطرت عالم کی ملکہ ہے۔ تیرے بغیر کوئی شے زندگی کے کبریائی ایوانوں تک نہیں پہنچ سکتی۔ تیرے بغیر کوئی جاندار حسین اور شادماں نہیں بن سکتا۔ کوہساروں اور سمندروں، سرکش دریاؤں اور پرندوں کی برگ آلود آماجگاہوں، خمیدہ پودوں کے وسیع و عریض میدانوں میں، تو ہر سینے میں محبت کو بیدار کرتی ہے اور جنس میں سرگرم آرزو پیدا کر کے افزائش نسل کا باعث بنتی ہے۔ کیونکہ جونہی تو نمود درخشاں کرتی ہے تو وحشی گلے حسین مرغزاروں پر اچھلنے کودنے لگتے ہیں اور تند و تیز ندیوں میں تیرتے ہیں۔ ان میں ہر فرد تیرے حسن کا اسیر ہے، اور محبت سے تیری قیادت قبول کرتا ہے۔"

۴۔ روحانی ارتقاء

اس مستحکم اور فطری بنیاد پر وہ محبت استوار ہوتی ہے جو جان سخن اور غذائے روح ہے۔ اس زندگی کے جذبہ تناسل سے عاشق و معشوق کے درمیان وفا کا رشتہ قائم ہوتا ہے۔ جسم کی یہ بھوک ایک روح کا دوسری روح سے حسین ربط پیدا کرتی ہے۔ غار میں وحشی کے جذبہ شہوت سے آخرکار شاعر کی سپردگی رونما ہوتی ہے۔

وحشی لوگوں میں جذبہ محبت بہت کم نظر آتا ہے۔ ان کی زبان میں اس جذبہ کے لئے کوئی لفظ نہیں تھا۔ جب وہ شادی کرتے تو ان کا مقصد بچے پیدا کرنا اور خوراک کا باقاعدہ انتظام کرنا ہوتا۔ لیوک کہتا ہے کہ یوروبا میں وحشی لوگ نہایت بے اعتنائی سے شادی کرتے ہیں۔ کوئی مرد بیوی حاصل کرنے کے متعلق اس قدر کم سوچتا ہے جس قدر کہ جوار کے بھٹے کو کاٹنے کے بارے میں۔ محبت بالکل عنقا ہے۔ نیطشے کا یہ خیال تھا کہ رومان پروونس کے شاعروں کی اختراع ہے۔ لیکن یہ یقینی امر ہے کہ جہاں کہیں تہذیب ابھری جذبہ تناسل میں ایک روحانی عنصر داخل ہوتا گیا۔ یونانی رومان سے آشنا تھے۔ اگرچہ ان کا رومان مرد پرستی تک محدود تھا۔ الف لیلیٰ اس امر کا ثبوت ہے کہ محبت زمانہ وسطیٰ کے نغموں سے پہلے معرض وجود میں آ چکی تھی۔ لیکن کلیساء نے جنسی پاکیزگی کے احترام سے عورت کو ناقابل حصول بنا کر محبت کی شاعری کو تقویت بخشی۔ روشفوکو کہتا ہے "کہ اس قسم کی محبت کا محبت کرنے والے سے وہی تعلق ہے جو روح کا اس جسم سے ہے جس کے اندر وہ زندگی بسر کرتی ہے۔" ڈی فوے کہتا ہے۔ "کہ تمام مرد جھوٹے، غدار، بیہودہ گو، منافق اور متکبر

ہوتے ہیں۔ تمام عورتیں خود پسند، تصنع پرست اور بے وفا ہوتی ہیں۔ لیکن دنیا میں فقط ایک ہی چیز مقدس ہے اور وہ ہے ان دو نامکمل ہستیوں کا وصال۔" اور نیٹشے بت شکنی کے بعد محبت کا یوں احترام کرتا ہے "میں نے اس سے زیادہ مقدس بات کبھی نہیں سنی کہ سچی محبت میں روح جسم سے بغل گیر ہوتی ہے۔"

ہم جسمانی آرزو سے رومانوی محبت تک ارتقا کی کیونکر توجیہہ کر سکتے ہیں۔ یہ کیونکر ہوا کہ شہوت نرم دلی میں تبدیل ہو گئی، اور جسم کی بے تابی روح کا گداز بن گئی۔ کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ تہذیب نے وصال کی عمر کو ملتوی کر دیا اور جسم میں ناکام آرزو کی خلش پہنچنے دی۔ یہ خلش تصورات میں تبدیل ہو گئی۔ اس نے محبوب کو بیش رنگوں میں ملبوس کیا۔ وہ چیز جس کی ہم تلاش کرتے ہیں مگر پا نہیں سکتے، زیادہ قیمتی بن جاتی ہے۔ کسی چیز کا حسن ہماری آرزو کی توانائی میں مضمر ہے اور آرزو تکمیل سے کمزور اور ناکامی سے مستحکم ہوتی ہے۔ اس لئے محبت فرد کی جوانی اور تہذیب کی پختگی میں سب سے زیادہ روحانی کیفیت کی حامل ہوتی ہے۔ کیونکہ اسی حالت میں آرزوئیں دبائی جاتی ہیں اور یہ دباؤ جسمانی آرزو کو نغمے اور شاعری میں تبدیل کر دیتا ہے۔

ذرا محبت کے نفسیاتی ارتقا پر غور کیجئے۔ اکثر و بیشتر اس کی ابتدا لڑکی کے باپ سے تعلق خاطر اور لڑکے کے ماں سے خاص تعلق خاطر سے ہوتی ہے۔ پھر یہ کسی اور شخص سے جو کہ عمر میں عاشق کے قریب ہوتا ہے شدید التفات کی صورت اختیار کرتی ہے۔ مدرسہ کی ہر جماعت میں ایسے بہت سے بچے ہوتے ہیں جو جنس مخالف کے استادوں کی محبت میں مبتلا رہتے ہیں۔ گوئٹے نے اپنی ایک محبت کی بنیاد پر ایک لافانی افسانہ لکھا ہے کہ ایک عورت نے اسے "میرا بچہ" کہہ کر اس کا دل توڑ دیا۔ ان ہنگامی محبتوں میں بھی رومانوی آرائش تخیل کمال پر ہوتی ہے۔ پھلتے پھولتے بدن میں تخیل بیتاب ہو جاتا ہے۔ یہ تخیل حسین تصورات بناتا ہے اور اپنے منظور نظر کو اپنے تصورات کے دلکش رنگ عطا کرتا ہے۔ اس عمر میں جسمانی عنصر شعوری طور پر ظاہر نہیں ہوتا۔ گوئٹے کہتا ہے کہ "ایک بے داغ جوان میں محبت کی پہلی تحریک ہمیشہ روحانی مقاصد لئے ہوتی ہے۔"

اس کے فوراً بعد عنفوان شباب کی محبت کا آفاقی تجربہ شروع ہوتا ہے یہ محبت بالعموم خفیہ رکھی جاتی ہے اور اس کا اظہار نہیں کیا جاتا۔ حتیٰ کہ وہ چھوٹے چھوٹے تحفے جو اس کے نام پر بھیجے جاتے ہیں گمنام ہوتے ہیں۔ اس منزل پہ لڑکیاں اکثر لڑکوں سے زیادہ جرات کا مظاہرہ کرتی ہیں اور اگرچہ بظاہر اپنی پختگی کے زمانہ میں وہ اپنی جرات کسی قدر کھو دیتی

ہیں' وہ آخر تک محبت کے فن میں مردوں سے زیادہ ہنرمند رہتی ہیں۔ لڑکا شرمایا رہتا ہے لیکن لڑکی خود اعتمادی کے ساتھ اس کیفیت پر غالب رہتی ہے۔ لڑکا کبھی کبھی ضرورت سے زیادہ کوشش کر کے اپنی محبوبہ سے کنارہ کشی کرتا ہے۔ وہ رات کی تاریکی میں تنہا لیے گزارتا ہے یا دن کو پہروں آوارہ و سرگرداں پھرتا ہے۔ محبوبہ کے حضور میں جو نازیبا حرکات اس سے سرزد ہوئیں یا ناروا کلمے اس کی زبان سے نکلے۔ ان کی تلخ یادیں اسے ستاتی ہیں۔ کچھ نوجوان جنہیں ماں کی شفقت اور تحفظ ضرورت سے زیادہ حاصل ہوا ہو' انہیں یہ حساسیت ہمیشہ کے لئے جنسی طور پر مفلوج بنا سکتی ہے۔ بعض لڑکوں میں نمائش کی آرزو تسکین پاتی ہے۔ جب ان کے خوابوں کی دیوی قریب ہو تو وہ کھیلوں میں اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں تاکہ محبوبہ کے قدموں میں اپنی فتح کے پھول بکھیر سکیں۔ کھیل کے میدانوں میں نوجوان ان خونی جنگوں کا اعادہ کرتے ہیں جو نر حیوان مادہ کی تسخیر کے لئے کیا کرتے تھے۔ یہ جنگیں پیش خیمہ ہیں اس اقتصادی مبارزہ کا جو کہ پختہ عمر لوگ ایک حسینہ کی محبت حاصل کرنے کے لئے برپا کرتے ہیں۔

ان ابتدائی مظاہروں سے جو عنفوان شباب کے وفور کے فوراً بعد رونما ہوتے ہیں' محبت مختلف مراحل میں سے گزرتی ہے جو اگر ہنگامی ہیں تو صحت مند ہیں اور اگر مستقل ہیں تو غیر صحت مند۔ جنسی بے راہ روی کسی قدیم طرز عمل کی طرف مراجعت کا نام ہے۔ جس کی موجودہ زمانہ میں کوئی ضرورت نہیں۔ ایک صحت مند انسان ان ہنگامی مراحل سے گزر جاتا ہے۔ وہ اس تجربہ سے اپنی روح میں گہرائی اور عمق پیدا کرتا ہے اور پھر پختہ اور صحت مند محبت کی منزل تک پہنچ جاتا ہے۔

پھر کورٹ شپ کا دور آتا ہے جو انسانی تقدیر کا حسین ترین دور ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ کورٹ شپ بلوغت سے پہلے موجود نہیں ہوتی ہمارے بچپن کے بہت سے کھیل محبت کے کھیل ہوتے ہیں اور ایک پانچ برس کی لڑکی ہنرمندی کے ساتھ ایک لڑکے سے چہلیں کر سکتی ہے۔ کورٹ شپ اہم مقاصد کی تکمیل کرتی ہے۔ یہ محبت میں دفور اور شدت پیدا کرتی ہے اور اس انتخاب احسن کے لئے مہلت دیتی ہے جو زندگی کے معیار کو بلند کرتا ہے۔ بالغوں میں کورٹ شپ اکثر یہ صورت اختیار کرتی ہے کہ مرد تسخیر کے لئے آگے بڑھتا ہے اور عورت دلربائی کے ساتھ پیچھے ہٹتی ہے۔ اس اصول میں کبھی کبھی استثناء بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ نیوگنی میں لڑکیاں لڑکوں کو کورٹ کرتی ہیں اور انہیں تحفے تحائف پیش کرتی ہیں۔ لیکن یہ "قابل تعریف" رسم ابھی ہمارے ملک میں پیدا نہیں ہوئی اور کبھی

کبھار کوئی لڑکی مرد کا پیچھا کرتی ہے۔ کم سے کم برنارڈشا کی تمثیلوں میں بالعموم مرد ہی اظہار محبت میں پہل کرتا ہے کیونکہ وہ فطرتاً" جانباز صیاد ہے۔ عورت اس کے لئے ایک شکار کی حیثیت رکھتی ہے جس کی اسے تسخیر کرنا ہے۔ تمام کورٹ شپ ایک جنگ ہے اور تناسل ایک معرکہ تسخیر۔

سٹینلے ہال کہتا ہے کہ "اکثر حیوانوں کی زندگی میں جنگ کا زمانہ محبت کا عہد ہوتا ہے۔" انسانوں میں جنگ تجارتی تقابل اور نمائش کی صورت اختیار کرتی ہے۔ ہم دانتوں میں نہیں بلکہ سرمایہ کے ذریعے جنگ لڑتے ہیں اور کاروباری خوش خلقی کے پردے میں پنجے تیز کرتے ہیں۔

عقلمند عورتیں' حیا اور فرار سے مسلح ہو کر جنگ کرتی ہیں۔ حیا ایک شاطرانہ پسپائی ہے جو خوف اور صفائی پسندی سے پیدا ہوتی ہے اور نرم دلی اور درایت سے پھلتی پھولتی ہے۔ یہ انسانوں کی نسل ہی کا خاصہ نہیں۔ اس کی ایک واضح مثال اور ماخذ یہ ہے کہ مادہ حیوان موسم کے علاوہ مجامعت کرنے سے گریز کرتی ہے۔ مہذب لوگوں میں حیا محبت کی ایک حسین ترین نفسیاتی صفت ہے۔ یہ صفت ایک لاثانی عظمت حاصل کر سکتی ہے اور بعض اوقات روح کی بنیادی محرکات پر قابو پا لیتی ہے۔ قدیم مالیشیا میں جب عورتوں کی خودکشی کی وبا پھیلی تو عقلمند آئین سازوں نے یہ فرمان جاری کر کے اسے روکا کہ جو عورتیں اپنی جان لیں گی ان کی لاشیں گلیوں میں برہنہ لے جائی جائیں گی۔

ولیم جیمز کا یہ خیال تھا کہ حیا فطری نہیں بلکہ اکتسابی جذبہ ہے۔ عورتوں نے جب یہ دیکھا کہ سخاوت سے حقارت پیدا ہوتی ہے تو انہوں نے اپنا یہ انکشاف اپنی بہو بیٹیوں تک پہنچا دیا۔ ڈرو ایک قدم اور پیچھے گیا اور اس نے حیا کی یہ توجیہہ کی کہ حاسد شوہروں نے اپنی ملکیت قائم رکھنے کے لئے اپنی بیویوں میں جبراً حیا کا جذبہ پیدا کیا۔ بہت سے قبائل میں فقط شادی شدہ عورتیں ہی کپڑے پہنتی تھیں۔ ان کے شوہر یہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح ان کے حقوق ملکیت محفوظ رہتے ہیں۔ جب شادی تسخیر کی بجائے کاروباری معاہدہ بن گئی اور والدین نے دیکھا کہ پاکیزہ دوشیزاؤں کے زیادہ دام ملتے ہیں تو انہوں نے لڑکیوں میں حیا کی پرورش شروع کر دی۔ ان مختلف سرچشموں سے حیا ابھری اور عورت کا دلفریب حسن بن گئی۔ بے حیا عورتیں مردانہ قسم کے مردوں کے لئے فقط' ہنگامی کشش رکھتی ہیں' نمائش میں احتیاط اور حسن و خوبی کے اظہار میں اختصار اس صید کے بہترین اسلحے ہیں۔ جب بدن کے مخصوص جزئیات کے بارے میں عام لوگ گلیوں میں بات چیت کرتے ہیں تو ہماری توجہ

تو مائل ہوتی ہے لیکن جذبات بہت کم متحرک ہوتے ہیں۔ جوان آدمی جھکی ہوئی نگاہوں کی طرف کھنچتا ہے اور غیر شعوری طور پر یہ جانتا ہے کہ اس حیا میں وہ روحانی پہلو مضمر ہے جو عورت کی ایک بلند صفت ہے۔ حیا اپنے انعامات میں کسی قدر بخل سے کام لیتی ہے اور مرد کی ہمت اور جرات کو آزماتی ہے۔ اسے نادر کارناموں کی ترغیب دیتی ہے اور ان پوشیدہ صلاحیتوں کو ابھارتی ہے جو عام لوگوں کی زندگی کی تہہ میں چھپی رہتی ہیں۔ یہ بات عین ممکن ہے کہ مردوں کے تعمیری کارنامے پرندوں کی رنگین شوکت کی طرح جنسی تقاضا اور نمائش کی وجہ سے ظہور میں آئے ہوں۔

محبت اپنے آپ کو ولدیت کی صورت میں مکمل کرتی ہے۔ غالباً ہم میں بچے پیدا کرنے کی کوئی جبلت نہیں۔ فقط جنس اور والدانہ شفقت کی جبلتیں ہیں۔ فطرت براہ راست کبھی اپنے مقاصد پورے نہیں کرتی اور انسان اس کی بہترین تخلیق ہے۔ ہسپتالوں میں چلاتی ہوئی عورتوں کی صدائیں اور بچوں کی چیخیں سنیے۔ لیکن کس سادہ ہنرمندی کے ساتھ بچہ ماں کے درد کو سرور میں تبدیل کر دیتا ہے اور باپ میں وہ جذبہ تفاخر پیدا کرتا ہے جو خوشی خوشی بچے کی نگہداشت اور تربیت کے کڑے اخراجات برداشت کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو والدین کے درمیان محبت عود کر آتی ہے لیکن یہ محبت اس شعلے سے خاصی مختلف ہوتی ہے جو پہلے دلوں میں مشتعل رہتا تھا۔ درحقیقت اس ہنگامہ پرور زمانہ میں یہ شعلہ اس وقت تک قریب قریب بجھ چکا ہوتا ہے اور وہ محبت جس نے ماں باپ کو ہنگامی طور پر ایک کر دیا تھا اس کا بیشتر حصہ اب بچے کو میسر آتا ہے۔ ماں بچے کی محبت میں باپ کو اکثر نظرانداز کر دیتی ہے اور باپ اگر بچہ لڑکی ہے تو اپنی محبت لڑکی کی نذر کرتا ہے لیکن آخر میں ہنگامی کیفیتیں اپنی کشش کھو دیتی ہیں اور میاں بیوی پھر سے ایک دوسرے کو چاہنے لگتے ہیں۔

وقت آخر دو روحوں کے درمیان مکمل شادی کا باعث بنتا ہے کیونکہ ولدیت کے اس عہد میں کتنی ہی آزمائشیں ہوتی ہوں گی، تقدیر کے کتنے نشیب و فراز سے گزرنا پڑتا ہو گا اور جسم کی کتنی اذیتیں اور روح کے کتنے آلام برداشت کرنے پڑتے ہوں گے۔ مرض بے وفا تخیل میں ایک گہرائی اور متانت پیدا کر دیتا ہے اور محبت موت کے قرب کی وجہ سے ایک نئی زندگی حاصل کرتی ہے۔ مل کر منصوبے بنانا اور ان پر عمل کرنا، فتح و شکست میں اشتراک، دو ہم آہنگ ذہنوں کو اس طرح ایک روحانی یگانگت میں منسلک کرتا ہے کہ گویا دو شخصیتیں ایک ہو گئی ہیں حتیٰ کہ ان کی شکلیں بھی ایک جیسی ہو جاتی ہیں۔ مل کر بچوں کی

نگہداشت کرنا، انہیں پھلتے پھولتے دیکھنا اور پھر با دل ناخواستہ انہیں ایک نوجوان عاشق کے سپرد کر دینا، شخصیتوں کے مکمل اتحاد کی صورتیں ہیں۔

جب وہ گھر جو کبھی بچوں کے قہقہوں سے جگمگا اٹھتا تھا۔ ان قہقہوں کی خاموش یادگار بن جاتا ہے تو محبت ان کئی سالوں کے ساتھیوں کو پھر اپنی دولت سے مالا مال کرتی ہے۔ یہ دور پورا نہیں ہوتا جب تک کہ محبت بڑھاپے کی تنہائی اور موت کے قرب میں دلوں کو حرارت نہ بخشے۔ جو لوگ محبت کو فقط آرزو سمجھتے تھے وہ فقط اس کے گوشت پوست اور جڑوں سے آشنا تھے۔ آج جبکہ ہر جسمانی عنصر راکھ ہو چکا ہے، فقط اس کی روح باقی ہے۔ بوڑھے دلوں کے اس تازہ وصال میں ہی جسمانی بھوک سے روحانی محبت تک ارتقا مکمل ہوتا ہے۔

یہ ہے محبت کا چکر۔ اس پر پھر ایک نظر ڈالیے۔ حقیر ترین حیوان کی جسمانی ساخت میں، درندے کے تند جذبے میں، وحشی کی شہوت میں، نوجوانوں کی متفکر اور گداز نگاہوں میں، شعرا کے نغموں میں اور داستان گویوں کے افسانوں میں اسی محبت کی جلوہ گری ہے۔ اس بڑھے جوڑے میں بھی محبت موجود ہے جو خوشی سے لرز جاتا ہے جب اس کے بیٹے پوتے اور نواسے پچاس سالہ محبت کے اعزاز میں یک جا ہوتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر کائنات میں اور کیا معجزہ ہو گا کہ عناصر کی باہمی کشش، محبت اور وفا کی شاعری کا روپ دھارتی ہے۔ پھر ہمیں ستیانہ کے وہ دلفریب الفاظ یاد آتے ہیں کہ "ہر عین فطری بنیادوں پر استوار ہوتا ہے اور قدرت کی ہر چیز عینی نشوونما پاتی ہے۔" محبت کو اپنی حقیر ابتدا پر شرمسار نہیں ہونا چاہئے۔ وہ آرزو قابل نفرت ہے جو روحانی سپردگی میں اپنا کمال نہیں ڈھونڈتی۔

حکیم محبت افلاطون نے کہا تھا "وہ جسے محبت نے نہیں چھوا تاریکی میں سرگرداں رہتا ہے۔" مرتے وقت لے پلیس نے اپنے ان دوستوں کو برا بھلا کہا جو اس کے انکشافات اور تصنیفات کی شہرت کا ذکر کر رہے تھے۔ اس نے کہا کہ "یہ زندگی کی اہم چیزیں نہیں ہیں۔" انہوں نے پوچھا تو کیا چیز اہم ہے؟ تو اس سائنس دان نے آخری سانس لیتے ہوئے کہا "محبت!"

ہر شے فانی ہے فقط محبت کو بقا حاصل ہے۔ محبت موت کے خلاء کو تناسل کے ذریعے معمور کرتی ہے۔ ناکامی کی تلخی میں یہ کس قدر مختصر معلوم ہوتی ہے۔ لیکن انسانیت کے نقطہ نظر سے اسے دوام حاصل ہے۔ آخر میں یہ ہمارے ایک حصے کو انحطاط سے بچا لیتی ہے اور

ہماری زندگی کو از سرنو بچے کی توانائی اور زندگی میں محفوظ کر دیتی ہے۔ ہماری [illegible]
تکان ہے اور ہماری حکمت ایک مختصر اور سرد روشنی۔ لیکن محبت ہمارے [illegible]
ناقابل بیان سکون سے گرماتی ہے۔ وہ سکون' محبت حاصل کرنے سے اتنا نہیں' بلکہ محبت
دینے سے بڑھتا ہے۔

باب ہشتم

مرد اور عورت

۱۔ محبت کی جنگ

گورکی اور چیخوف کرا لیمیا میں ٹہل رہے تھے۔ چلتے چلتے وہ ساحل پر پہنچے جہاں ٹالسٹائے فکر و تدبر میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔ وہ اس کے پاس بیٹھ گئے اور عورتوں کی باتیں کرنے لگے۔ ٹالسٹائے خاصی دیر تک ان کی باتیں خاموشی سے سنتا رہا اور پھر کہنے لگا: "اور میں عورتوں کی حقیقت اس وقت بتاؤں گا جب میرا ایک پاؤں قبر میں ہو گا۔ میں حقیقت بتا کر فوراً اپنے کفن میں کود جاؤں گا اور اسے بند کر کے کہوں گا' اب میرا جو کچھ بگاڑنا ہے بگاڑ لو۔" جب کونٹ کیسرلنگ نے اپنی "کتاب شادی" کے لئے برنارڈشا کو ایک مضمون لکھنے کی دعوت دی تو اس نے انکار کر دیا اور کہا کہ "کوئی مرد جب تک کہ اس کی بیوی زندہ ہے شادی کی حقیقت بیان نہیں کر سکتا۔" تاہم ہم اس موضوع پر گفتگو کریں گے' لیکن اپنی گفتگو اور تجزیہ کو روایتی اور معمولی قسم کی مثالوں تک محدود رکھیں گے۔

اس موضوع کے متعلق دنیا کا ادب نہایت دلچسپ مگر حد درجہ ناقابل اعتبار ہے۔ دلچسپ اس لئے کہ اس کا تعلق براہ راست ہماری ذات سے ہے۔ سوائے اس صورت کے جب وہ انسانوں کی خامیاں بیان کرتا ہے۔ یہ اس لئے ناقابل اعتبار ہے کہ اکثر و بیشتر یہ آپ بیتیوں پر مشتمل ہے اور آپ بیتی افسانہ ہوتی ہے۔ یہ بالعموم انتقام کی آواز ہوتی ہے اور شکست خوردہ سپاہی اسے بلند کرتے ہیں۔ جب کوئی مرد عورتوں کے متعلق کوئی کتاب لکھتا ہے تو یہ اس کے دل کے زخموں کی صدا ہوتی ہے اور جب کوئی مرد کسی عورت کے دل پر فتح پاتا ہے (اگر وہ طبعاً "شریف ہے) تو اپنی فتح کو شادی کے سانچے میں ڈھالتا ہے۔ اس کے بعد وہ ایک حکیمانہ خاموشی اختیار کر لیتا ہے۔ اس لئے دو شخص ایک ساتھ نہیں بول سکتے۔ اگر وہ ناکام رہتا ہے تو کتابیں لکھتا ہے۔ جنس مخالف کے بارے میں شوپن ہار' نیٹشے' وائنگر اور دوسرے ناکام مردوں نے جو کتابیں لکھی ہیں ان سے کہیں زیادہ دلچسپ مردوں کا وہ تجزیہ ہو سکتا ہے جو عورتیں مردوں کے متعلق کریں۔ اس لئے کہ وہ فطرت

انسانی کو مرد کے مقابلے میں کہیں بہتر سمجھتی اور ان کے متعلق زیادہ ذہانت اور آزادی سے اظہار خیال کر سکتی ہیں۔ لیکن عورتیں اتنی ہوشیار ہیں کہ ادب کے ذریعے اپنے دل کا بھید نہیں کھلنے دیتیں۔ وہ اس خیال سے مسرور اور مطمئن ہیں کہ ان کے دشمن کتابیں لکھتے ہیں۔

یہ لازمی ہے کہ اس موضوع پر کسی اوسط آدمی کا فیصلہ یک طرفہ ہو' اس لئے کہ داخلی طور پر وہ فقط اس موضوع کے نصف حصے سے واقف ہے۔ بلکہ شاید اس نصف کا ایک نہایت ہی قلیل حصہ قریب سے جانتا ہے' اور اس قلیل حصے کو بھی دیانت اور خوبی سے نہیں جانتا۔ جنگ کے دوران میں غیر جانبدار ہونا مشکل ہے۔ اسی لئے اس موضوع کے ضمن میں سائنس خام ہے۔ پروفیسر تھورن ڈائیک کے کم کم اور منتشر مشاہدات اور ذہنی آزمائشوں کی ضخیم روئدادیں محض ہنگامی شعبہ تحقیق کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جس میں ترقی کرنے کی صلاحیت مشکل ہی سے ہے۔ انسانوں کا آخری مطالعہ انسان کا مطالعہ ہوگا۔ آخری سائنس نفسیات اور آخری موضوع عورت ہوگی۔

لیکن ہمیں احتیاط سے کام لینا چاہئے۔ ہم افادی نقطہ نظر سے انسانی فطرت کو بنیادی جبلتوں میں تقسیم کریں گے اور ہر جبلت کی بحث کے ضمن میں یہ دیکھیں گے کہ عورتوں کا ذہن اور شخصیت مردوں کے ذہن اور شخصیت سے کیونکر مختلف ہے۔ ہم یہ فرض کریں گے کہ انسان چند بنیادی رجحانات اور عمل اور احساس کی محرکات کے ساتھ پیدا ہوتا ہے جنہیں شوپن ہار کے وقت سے فلسفی اور ماہرین نفسیات جبلت کا نام دیتے آئے ہیں۔ ہم ان موروثی رجحانات کی وہ تقسیم قبول کریں گے جو پروفیسر مارشل نے مرتب کی تھی۔ یہ موروثی رجحانات تین مقاصد کے نقطہ نظر سے دیکھے جا سکتے ہیں۔ چند جبلتیں' مثلاً بھوک' پیکار' فرار اور کھیل فرد کی بقا کے مقصد کو پورا کرتی ہیں۔ کچھ اور جبلتیں' مثلاً بزم آرائی اور مقبول ہونے کی آرزو' اجتماع کو قائم رکھتی ہیں اور کچھ اور جبلتیں مثلاً تناسل اور والدانہ شفقت نسل کی بقاء کے لئے مفید ہیں۔ ہم یہاں یہ سوال پوچھیں گے کہ آیا مردوں اور عورتوں میں یہ جبلتیں نوعیت اور شدت کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہیں؟ ہم ابتدا نسلی جبلتوں سے کریں گے' کیونکہ ان کے مختلف طرز عمل سے جنسوں کے درمیان جسمانی' ذہنی' اور عضوی اختلاف پیدا ہوتے ہیں۔

۲۔ شخصیت کے اختلافات

زبھی اس بات پر حیران ہے کہ حیوانوں کی دنیا میں مادہ غالب ہے' محض جسم میں نہیں
(جیسا کہ ہم دیکھ آئے ہیں) بلکہ اس حیاتیاتی برتری میں کہ وہ نسل کی بقا کی براہ راست
ذمہ دار ہے' زندگی کے حقیر درجوں میں بقائے نسل تقسیم بدن کے ذریعے ہوتی ہے اور اس
لئے جنسوں کا وجود نہیں ہوتا۔ انسانی نسل میں تناسل کا حقیقی عمل مادہ کا اندر ہوتا ہے۔ مرد
کی حیثیت محض ایک غیر ضروری حادثے کی سی ہے۔ قدرت اور تجربہ گاہ دونوں متفق ہیں
کہ نر غیر ضروری ہے۔ یہ امر تلخ حد تک واضح ہے کہ کسی نسل میں مادہ بنیادی حیثیت
رکھتی ہے اور نر ثانوی۔ نر ان وظائف کی تجسیم و تخصیص ہے جو کبھی اس کے بغیر عمل
میں آتے تھے۔ تناسل کی اس عظیم تمثیل میں جس کے گرد تمام زندگی گھومتی ہے' نر ایک
نہایت غیر اہم اور سطحی پارٹ ادا کرتا ہے۔ پیدائش کے نازک موقعہ پر وہ عجز اور بے بسی
کی حالت میں ایک طرف کھڑا رہتا ہے اور یہ محسوس کرتا ہے کہ نسل کی بقا کے سلسلے میں
وہ کتنا غیر اہم آلہ ہے۔ اس وقت وہ جانتا ہے کہ عورت مرد سے زیادہ نسل کے بہت قریب
ہے' اور یہ کہ زندگی کی عظیم الشان موج عورت کے جسم میں بے تابی سے دوڑتی ہے اور
اسی کے گوشت پوست اور خون سے نئی نسل کی تخلیق ہوتی ہے' اور یہ بات اس کی سمجھ
میں آنے لگتی ہے کہ وحشی لوگ اور بڑے بڑے مذہب کیوں ماتا کی پرستش کرتے ہیں۔

عورت میں حیا کی افراط تناسل کے مقاصد کو پورا کرتی ہے۔ اس کی باحیا پس پائی جنسی
انتخاب میں مدد دیتی ہے' وہ اس میں یہ صلاحیت پیدا کرتی ہے کہ وہ اپنے شریک زندگی کا
سوجھ بوجھ کے ساتھ انتخاب کر سکے۔ کیونکہ یہی شریک زندگی بعد میں اس کے بچوں کا باپ
بنے گا۔ نسل اور اجتماع کا مفاد اس کے وجود میں مضمر ہے' جس طرح فرد کا مفاد مرد کے
ذریعے اظہار پاتا ہے۔ جب وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتی ہے' اور ماں بن کر اپنی
شخصیت کی تکمیل کر لیتی ہے تو اس کی حیا بھی کم ہو جاتی ہے۔ اس تفاخر میں کس قدر
خوشگوار سادگی ہے جس کے ساتھ ایک دیہاتی ماں جو حال ہی میں بہت شرمیلی تھی' منظر عام
پر اپنے بچے کو دودھ پلاتی دیکھی گئی اور اس کی یہ حرکت بجا ہے۔ زندگی اور فن کے تمام
مناظر اور تصاویر میں یہ منظر حسین ترین ہے۔

عورت محبت کے معاملے میں مرد سے اس لئے زیادہ سمجھ دار ہے کہ بالعموم اس کی
خواہش کم شدید ہوتی ہے اور اس کے فکر کو نہیں الجھاتی۔ یہی اس کی قدیم حکمت کا راز
ہے۔ ڈارون کا یہ خیال تھا کہ اکثر نسلوں کی مادہ محبت سے کسی قدر بے نیاز ہوتی ہے۔
لومبروزو' کش' کرافٹ ایبنگ اور دوسرے علماء کا یہ خیال ہے کہ انسانی نسل میں بھی چالیس

فی صد عورتیں جنسی تعلقات سے بے زار رہتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ عورت جسمانی لذت نہیں ڈھونڈتی بلکہ بے انتہا تعریف اور بے حد توجہ کی خواہشمندی ہوتی ہے۔ اور اکثر اوقات محض یہ خوشی کہ کوئی اسے چاہتا ہے' اسے مطمئن کر دیتی ہے۔ ٹامسن ہارڈی کہتا ہے۔ کبھی کبھی عورت کی یہ خواہش کہ اس سے محبت کی جائے' اس کے ضمیر کو بے بس کر دیتی ہے۔

جس چیز کو ہم نے محبت کا روحانی عنصر کہا تھا' یعنی محبت کا وہ عنصر جو بدن سے دلچسپی نہیں رکھتا مرد سے زیادہ عورت کو پسند ہوتا ہے۔ عورت کی فطرت کے بعض مطالعہ کرنے والوں کا یہ خیال ہے کہ عورت کی محبت اتنی جنسی نہیں ہوتی جتنی کہ مادرانہ شفقت سے معمور ہوتی ہے۔ لومبروزو کہتا ہے کہ "عورت کی محبت دراصل اس کی مامتا کی ایک ثانوی صفت ہے۔ اور محبت کے وہ تمام احساسات جو عورت کو مرد سے متعلق کرتے ہیں' جنسی محرکات سے نہیں بلکہ سپردگی اور اطاعت کی جبلتوں سے پیدا ہوتے ہیں۔" انفرڈویوائی کا یہ خیال تھا کہ مرد کی محبت ماں کے سینے کی یاد اور آرزو ہے۔ اور شاید ہر عاشق اپنی محبوبہ کے لئے محض ایک بچے کی حیثیت رکھتا ہے جسے وہ خوشی اور اطمینان بہم پہنچاتی ہے۔

عورت کا جذبہ محبت مرد کے مقابلے میں کم شدید ہوتا ہے لیکن اس میں وسعت اور گہرائی زیادہ ہوتی ہے۔ یہ جذبہ اس کی زندگی کے ہر گوشہ اور ہر کونہ میں سرایت کر جاتا ہے۔ وہ جبھی زندہ رہتی ہے اگر اس سے محبت کی جائے۔ فرانس کے ایک مجسٹریٹ نے جب ایک عورت کو ایک چور کے ساتھ تعلقات قائم کرنے پر مطعون کیا تو اس نے جواب دیا کہ "جب میں محبت میں مبتلا نہیں ہوتی تو میں زندگی سے محروم ہو جاتی ہوں۔"

غالباً وا لیننگر کے ذہن میں عورت کی اس نفسیاتی ضرورت کا تصور تھا' جب اس نے کہا کہ عورت روح سے محروم ہوتی ہے' اور یہ کہ اس کا وجود مرد کے وجود پر مرکوز ہوتا ہے۔

بسا اوقات وہ مرد کی شخصیت کو اپنا لیتی ہے لیکن اس کی تہ میں بھی فریب ہوتا ہے۔ عورت' محض مرد کی آراء کی نقل کرتی ہے۔ اپنے آپ میں وہ اپنی انفرادیت قائم رکھتی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ مرد اپنی غیر محدود انانیت میں اس سے متنفر ہو جائے گا۔ اگر وہ اپنی شخصیت کا پوری طرح اظہار کرے۔

اگر عورت محبت کے فن میں مرد کو نیچا دکھاتی ہے تو مرد دوستی کے معاملے میں اس سے کہیں بہتر ہے۔ مرد دوست ہو سکتے ہیں لیکن عورتیں محض ملاقاتی۔ جب عورتیں دوسری عورتوں کی تعریف کرتی ہیں تو ستارے اپنا راستہ بھول جاتے ہیں۔ عورتوں کے لئے اپنے

آپ کو خوش رکھنا بہت مشکل ہے۔ انہیں ایک دوسرے کی موجودگی میں بے حد الجھن محسوس ہوتی ہے اور اس بیزاری کو مردوں کی باتوں سے بہلاتی ہیں۔ اور یہ بات قدرت کے اصولوں کے عین مطابق ہے۔ جیسا کہ مدت ہوئی روشفوکو نے کہا تھا کہ اکثر عورتیں اس لئے دوستی کی اہل نہیں ہوتیں کہ دوستی محبت کے بعد پھیکی اور بے مزہ معلوم ہوتی ہے اور بقول شاعر' محبت مرد کی زندگی کا ایک حصہ ہے مگر عورت کا سارا وجود۔ ہمیں اپنی فطرتوں کے مطابق زندہ رہنا ہے۔

مرد کا حسد اس کی محبت کی طرح زیادہ شدید مگر غیر مستقل ہوتا ہے۔ مرد میں ملکیت کی ہوس مستحکم تر اور اس کی محبت کا نصف ہوتی ہے۔ محبت محض سپردگی نہیں ہوتی۔ وہ انا کی توسیع اور فتح بھی ہوتی ہے۔ حسد ملکیت کی جبلیت ہے جو تقابل سے ڈر جاتی ہے۔ یہ "جملہ حقوق محفوظ" کی خلاف ورزی کی سزا ہے۔ "میں تمہارا آقا' تمہارا خدا ہوں۔ تم اجنبی خداؤں کو میرے مقابلہ میں لا کر کھڑا نہیں کرو گے۔" عورت کے لئے یہ امر کسی قدر غیر اہم ہوتا ہے کہ اس کا محبوب پہلے کسی اور کا بھی محبوب رہ چکا ہے' لیکن مرد کی حالت اس کے برعکس ہے۔ عورت کے حسد میں اگرچہ شدت اور گہرائی نہیں ہوتی لیکن اس میں وسعت زیادہ ہوتی ہے۔ وہ فقط اپنے شوہر کی محبوباؤں کی حاسد نہیں ہوتی بلکہ اس کے احباب' اس کے پائپ' اس کے اخبار اور اس کی کتابوں سے بھی جلتی ہے۔ آہستہ آہستہ وہ اسے دوستوں سے علیحدہ کر دیتی ہے' اور اگر اس علیحدگی کی کوئی اور صورت نظر نہ آئے تو ان دوستوں کے ساتھ نظر بازی شروع کر دیتی ہے اور اس طرح اپنی چالبازی کو گناہ کی رنگینی دیتی ہے۔ جب مرد عورت کے مداحوں سے جلنے لگتا ہے تو وہ مضطرب نہیں ہوتی۔ وہ مرد کے حسد کو بڑھاتی ہے اور اس میں لذت لیتی ہے۔ کیونکہ وہ جانتی ہے کہ وہ مرد کو اسی حد تک پسند ہے جس حد تک کہ مرد کو اپنی ملکیت غیر محفوظ محسوس ہوتی ہے۔ وہ یہ سمجھتی ہے کہ مرتی ہوئی محبت کے لئے حسد سے بہتر کوئی علاج نہیں۔ یہ حسین خامیاں قابل عفو ہیں۔ سماج میں عورت کو ادنیٰ مقام حاصل ہے اور اسے مرد کی جسمانی برتری کے مقابلہ کے لئے ان حیلوں کی ضرورت ہے۔ اسے ہر حالت میں اپنے آپ کو محفوظ رکھنا ہے۔ کیونکہ نسل اپنی بقا اور استحکام کے لئے عورت کی محتاج ہے۔ وہ محبت میں اپنے مختصر حصے کی بہت بڑی قیمت ادا کرتی ہے۔ اس لئے اسے اس کی چالاکی پر مطعون کرنا بجا نہیں۔ عورتوں کے ساتھ جس قدر نرمی برتی جائے کم ہے۔

ب۔ انفرادی جبلتیں

عورت کا وظیفہ نسل کی خدمت کرنا ہے اور مرد کا وظیفہ عورت اور بچے کی خدمت کرنا۔ ان کے اور وظائف بھی ہیں مگر وہ ان بنیادی وظائف کے تابع ہیں۔ ان بنیادی اور نیم غیر شعوری مقاصد میں قدرت نے ہماری اہمیت اور ہماری خوشی مضمر رکھی ہے۔

اس لئے مرد کا فطری کام حفاظت کرنا اور حصول اشیا کے لئے معرکہ آرائی کرنا ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ وہ خوراک کی تلاش میں گھر سے باہر جائے۔ وہ غذا حاصل کرنے کا ذریعہ ہے اور عورت تناسل کا۔ غذا مرد کا مقصد ہے۔ اگر وہ کچھ اور چیزوں کی طلب بھی رکھتا ہے تو اس لئے کہ یہ چیزیں دولت کی علامت ہیں اور دولت زبوں حالی میں غذا کی ضامن ہے۔ مسٹر وڈ ورس نے کہا ہے کہ تمام اچھی چیزیں پیٹ سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور اگرچہ یہ بات کتنا بعید از اخلاق ہے لیکن یہ مرد پر صادق آتی ہے۔ مرد کو خوراک بے حد عزیز ہوتی ہے اور اسی کی وجہ سے وہ آسانی سے مطیع ہو سکتا ہے۔ وہ عورت سے زیادہ کھانے اور پینے کا رسیا ہے اور جب سے حوا نے آدم کو سیب پیش کیا تھا عورت نے مرد کے پیٹ کے ذریعے اس پر حکومت کی ہے' اور ایک ہی وار میں اس کے ہاضمے اور اخلاق کو تباہ کر دیا ہے۔

خوراک کی جستجو میں نر ایک سپاہی بن گیا۔ حیوانوں میں وہ دانتوں اور پنجوں سے لڑتا ہے۔ انسانوں میں سرمایہ اور دولت سے قوموں میں بحری اور بری فوجوں اور اخباروں سے۔ کپلنگ کا یہ خیال تھا کہ مادہ نر سے زیادہ ظالم ہوتی ہے۔ لیکن غالباً اس نے کوئی زخم کھائے تھے' جن سے اس کی نظر صائب نہیں رہی۔ عورت کی فطرت امن و تحفظ چاہتی ہے نہ کہ جنگ۔ اور بعض نسلوں میں تو مادہ میں لڑنے کی جبلت کا وجود ہی نظر نہیں آتا۔ جب کبھی وہ لڑتی ہے تو اپنے بچوں کے لئے۔ اگر اس میں تندی و تیزی کی صلاحیت موجود ہے تو یہ اسی وقت بروئے کار آتی ہے جب نسل کو کوئی خطرہ ہو لیکن بظاہر وہ جنگ کی خوگر نہیں ہوتی اور اس کے اکا دکا جرائم اس کی جسمانی خرابیوں کی وجہ سے اس سے سرزد ہوتے ہیں۔ وہ مرد سے زیادہ صابر ہے۔ اور اگرچہ مرد زندگی کے بڑے مسائل میں جرات سے کام لیتا ہے۔ لیکن عورت چھوٹی چھوٹی مصیبتوں اور مشکلوں کو برداشت کرنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتی ہے۔ وہ بیماری کو خاموشی سے برداشت کرتی ہے۔ جیسے اس میں اسے کوئی خفیہ لذت حاصل ہوتی ہے۔ (شاید روزمرہ کے کام کاج سے کچھ دنوں کے آرام کی لذت) اس کے برعکس مرد جو ساکن زندگی کا خوگر نہیں ہوتا بیماری میں بے قرار رہتا ہے اور دنیا میں اپنی تکلیف کو مشتہر کرتا ہے۔

لیکن عورت ایک اور طرح پیکار پرست ہے۔ وہ سپاہی سے متاثر ہوتی ہے اور ایک جابر مرد کی اطاعت میں لذت حاصل کرتی ہے۔ اس کے اندر اذیت پسندی کا ایک عجیب عنصر ہے جو طاقت کے مظاہرہ سے مرعوب ہوتا ہے۔ چاہے اس طاقت کا شکار وہ خود ہی کیوں نہ ہو۔ ہر نسل میں وہ لڑاکو مرد کا انتخاب کرتی ہے۔ غیر شعوری طور پر وہ یہ جانتی ہے کہ اس کے گھر اور اس کے بچوں کو حفاظت کی ضرورت ہو گی۔ کبھی کبھی مردانگی میں یہ قدیم لذت اس کے حالیہ اقتصادی شعور پر قابو پا جاتی ہے۔ اور وہ ایک بہادر آدمی سے شادی کر لیتی ہے چاہے وہ آدمی بے وقوف ہی کیوں نہ ہو۔ وہ پوری آمادگی سے ایک اولوالعزم مرد کی اطاعت کرتی ہے۔ اگر ہمارے زمانے میں وہ اتنی فرمانبردار نہیں رہی تو اس لئے کہ اس زمانے کے مردوں کی شخصیتوں میں پہلا سا دم خم موجود نہیں۔ غالباً صنعت کی عقل کش پابندیاں اور ذہنی زندگی کے جاں سوز تصنع نے مردوں کو غلامی کا خوگر بنا دیا ہے۔ اور ان کی ہمت و جرات کو منفعل کر دیا ہے۔

عورت لڑائی اور بہادری سے نہیں بلکہ استقلال سے اپنی فتوحات حاصل کرتی ہے۔ مرد کی جنگ جوئی شدید تر اور کھلم کھلا ہوتی ہے۔ مگر وہ اتنی مستقل نہیں ہوتی۔ وہ امن کی خاطر ہتھیار ڈالنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ وہ چیخے چلائے۔ حتیٰ کہ اپنی بیوی کو زدو کوب رے لیکن آخر میں فتح عورت ہی کی ہوتی ہے۔ کمزور نسلیں' عوام' اجناس اور افراد' صبر اور چالاکی خوب جانتے ہیں۔ نپولین جو ایک براعظم کی تسخیر کر سکتا تھا' اپنی بیوی کو مطیع نہ کر سکا۔ اس کی طاقت جوزفین کی جسمانی کمزوری اور بزدلی کے سامنے بے بس تھی۔ کیونکہ جو اسلحے وہ استعمال کرتی تھی اس کے پاس ان کا کوئی جواب نہیں تھا۔ نپولین لکھتا ہے کہ "میری شخصیت کی قوت کی اکثر تعریف کی گئی ہے۔ لیکن اپنے بیوی بچوں کے لئے میں ہمیشہ ایک کمزور انسان رہا۔ اور وہ یہ جانتے تھے کہ پہلی لڑائی کے بعد ان کا استقلال اور ان کی ضد ہمیشہ فتح پاتی اور محض تکان کی وجہ سے وہ میرے ساتھ جو چاہتے کرتے۔" آج ہر گھر میں یہی حالت ہے۔ اس عیاش زمانے میں جبکہ ایک متوسط طبقے کی بیوی اس گھر میں عیش آرام کی زندگی بسر کرتی ہے جس میں نہ کوئی کام ہے نہ کوئی بچہ۔ حالات مرد کے خلاف ہیں۔ جب وہ سارے دن کے کام اور مصیبت کے بعد گھر لوٹتا ہے تو اس کی قدیم دشمن نئی قوت سے تازہ دم اس کی منتظر ہوتی ہے۔ جنگ سے پہلے ہی اسے شکست ہو جاتی ہے۔ اور اگر کسی طرح اتفاقاً" وہ جیت جائے تو عورت کے لئے فقط رونا کافی ہے اور وہ شکست کھا جاتا ہے۔ میریٔالوئیسا کہا کرتی تھی کہ اگر وہ کسی چیز کے لئے دو مرتبہ

رو دے تو وہ اسے مل جاتی تھی۔ عقل مند بیوی کو جنگ کا یہ بنیادی اصول یاد رکھنا چاہیے کہ اگر پہلی مرتبہ تم کامیاب نہ ہو تو ایک دفعہ اور رو دو۔

جہاں تک عمل کی جبلتوں مثلاً رینگنے، چلنے، پھینکنے، کودنے، دوڑنے اور کھیلنے کا تعلق ہے مادہ نر سے کم ہوشیار معلوم ہوتی ہے۔ مرد بے کار حرکت کی طرف مائل ہے، اور عورت غیر ضروری سکون کی طرف۔ عورت مرد سے زیادہ ست ہوتی ہے اور اس لئے زیادہ خطرناک جنس۔ کیونکہ بے کاری زنا کو جنم دیتی ہے۔ نیکی، مسرت اور حسن حاصل کرنے کے لئے لازمی ہے کہ انسان کام میں مصروف رہے۔

ج۔ اجتماعی جبلتیں:۔

جن جبلتوں کا ہم نے جائزہ لیا ہے، یعنی انفرادی جبلتوں میں مرد کی برتری واضح اور قدرتی ہے۔ لیکن اجتماعی اور نسلی جبلتوں میں عورت کو تفوق حاصل ہے۔ عورت مرد سے زیادہ اجتماع پسند ہے۔ وہ محفلوں اور گروہوں کو پسند کرتی ہے اور بطیب خاطر کسی اژدھام میں اپنے آپ کو ایک بے نام حیثیت کے سپرد کر دیتی ہے۔ وہ یہ نہیں پوچھتی کہ بہترین ڈرامے، بہترین موسیقی اور بہترین جگہ کون سی ہے۔ بلکہ یہ کہ سب سے زیادہ لوگ کہاں جاتے ہیں؟ اگرچہ اس سلسلے میں اس کے شوہر اور اس کے درمیان فرق بہت کم ہے (کم سے کم وہ بہترین چیز کو پسند کرنے کی کوشش کرتی ہے) لیکن ایک اوسط مرد موسیقی کی محفلوں، آرٹ کی نمائشوں اور ڈراموں میں مجبوراً بیوی کے خوف سے جاتا ہے۔ عورت مرد سے کم تنہائی کو برداشت کر سکتی ہے۔ اس لئے عورتیں بہت کم تارک الدنیا ہوتی ہیں۔ عورت مرد کے بغیر زیادہ نامکمل محسوس کرتی ہے اور مرد عورت کے بغیر اتنا نامکمل محسوس نہیں کرتا۔ کیونکہ عورت کو مرد کی حفاظت اور قیادت کی ضرورت ہوتی ہے۔ عورت ایک بزم پسند حیوان ہے۔

اس لئے وہ زیادہ باتونی ہے۔ افواہ ہے کہ وہ اپنے دل میں کوئی راز نہیں رکھ سکتی۔ فرینکلن کا یہ خیال تھا کہ "تین شخص ایک راز کو سربستہ رکھ سکتے ہیں اگر ان میں سے دو مر چکے ہوں۔" لیکن اس بات کو دونوں جنسوں پر صادق کرنے کے لئے ہمیں شرح اموات بڑھانی پڑے گی۔ تاہم عورتیں مردوں سے زیادہ دیر تک خاموشی سے کوئی دکھ برداشت کر سکتی ہیں۔ عورت احساسات اور جذبات کے ہاتھوں اکثر و بیشتر بے بس ہو جاتی ہے۔ اس لئے وہ ذہنی خرابیوں کی زیادہ شکار ہوتی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ سماج اس کی

جنسی آرزوؤں پر کڑی پابندیاں عائد کرتا ہے۔ اس کا چہرہ اس کی گفتار کی طرح اس کے جذبات کا آئینہ ہوتا ہے۔ اس نے تقدیر پسند فلسفی اور محتاط تاجر کی طرح یہ نہیں سیکھا ہوتا کہ نفع و نقصان' لذت و الم میں چہرے کو کیسے بے کیف بنایا جاتا ہے۔ اس لئے اس میں دوسروں کے خیالات اور احساسات کا اندازہ لگانے کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے۔ عورت کو دھوکا دینا زیادہ مشکل ہے۔

جیسا کہ گالٹن نے ہمیں بتایا تھا کہ بزم پسندی' کم ہمتی اور نقل کی صلاحیت کے ساتھ بدلتی ہے۔ عورت بالعموم پہلا اقدام مرد پر چھوڑتی ہے۔ اور اسی میں مرد کے غلبہ کا راز مضمر ہے۔ اور اگر آرزو کی تازہ شراب اسے سرمست نہ کر دے تو وہ برسوں تک اسے انتظار کی تلخ گھڑیاں گننے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اور وہ خود دولت جمع کرنے اور دوسری عورتوں کے ساتھ تجربہ کرنے میں مصروف رہتا ہے۔ عورت کو اپنے آپ پر اعتماد نہیں ہوتا۔ اس کی جسمانی کمزوری اور اقتصادی احتیاج اس کے ذہن کو بوجھ کی طرح دبائے رکھتی ہے۔ اس کی جرات کے نشتر کو کند بنا دیتی ہے اور اسے بغاوت اور اولوالعزمی کے جذبات سے محروم کر دیتی ہے۔ وہ رسم و رواج سے چمٹی رہتی ہے اور پارسائی کے ساتھ ماضی کی لکیر پیٹتی رہتی ہے۔ لباس' اطوار اور افکار کے تازہ فیشنوں کو اپناتی تو ہے لیکن سہم کر۔ وہ ہر نئے طرز فکر کو بغیر سوچے سمجھے مرد سے پہلے قبول کر لیتی ہے۔ ماہر تجزیہ نفس اس کی خوف زدہ روح کی گہرائیوں تک پہنچتا ہے۔ ماہر روحانیات اسے روحوں کی تصویریں دکھا کر تسکین دیتا ہے اور اس کے ہلکے واہمے سے کھیل کر دولت کماتا ہے۔

عورت مرد کی طرح اعتدال سے بہت زیادہ تجاوز نہیں کرتی۔ عورتوں میں سے بہت کم بے وقوف اور بہت کم فطین ہوتی ہیں۔ ایک مرد دوسرے مرد سے اتنا مماثل نہیں ہوتا جتنی کہ ایک عورت دوسری عورت سے۔ ایک بدلتے ہوئے ماحول مختلف اور متنوع پیشوں کے تقاضوں نے مردوں کی ہزاروں قسمیں بنا دی ہیں۔ لیکن گھر کے روایتی کام کاج' شوہر کے ساتھ شرکت حیات اور بچوں کی تربیت۔ یہ امور تقریباً تمام عورتوں کی زندگی سے متعلق ہیں اور انہیں ایک ہی سانچے میں ڈھالتے ہیں' ظاہر اگرچہ مختلف ہوتے ہیں' لیکن باطن ہمیشہ ایک سا ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ مرد نہایت سہولت سے اپنی توجہ ایک عورت سے ہٹا کر دوسری طرف منعطف کر دیتا ہے اسے محض ایک نیا نام سیکھنا ہے' کوئی نیا ہنر نہیں سیکھنا۔ حتیٰ کہ کبھی کبھی پرانے خطوط بھی کام آ سکتے ہیں لیکن یہ بہت ممکن ہے کہ ایک عورت جو محبت میں ناکام رہی ہو' اپنی ناکامی کو کبھی برداشت نہ کر سکے۔ اس نے اپنی

روح ایک خاص تصور کے ساتھ وابستہ کر دی ہے اور جہاں کہیں بھی وہ جائے گی اس ا
اس کی یادوں کے ساتھ ساتھ رہے گا۔

عورت کو بزم آرائی کی آرزو کے ساتھ اجتماعی قبولیت حاصل کرنے کی بھی ہوس ہے۔ اسے ہمسایوں کی رائے مرد کی رائے سے زیادہ متاثر کرتی ہے' کیونکہ جو لمحے محبت اور ا میں صرف نہیں ہوتے وہ اجتماعی تعلقات میں صرف ہوتے ہیں۔ وہ مرد سے زیادہ خود پسند ہوتی ہے۔ اسے اپنی خوبیوں اور حسن کا زیادہ احساس ہوتا ہے۔ وہ اپنی ناک پر پاؤڈر لگانے میں آدھ گھنٹہ لگا سکتی ہے۔ اگرچہ اس کی خودپسندی مرد کے تکبر سے بہت زیادہ نہیں ہوتی۔ اس کی اظہار پسندی بعض اوقات غیبت کی حد تک پہنچ جاتی ہے اور اس کی نقالی اسے رسم و رواج کا پابند بنا دیتی ہے۔ اپنے شوہر سے زیادہ وہ دنیا میں عروج کی متمنی ہوتی ہے اور اس کی ترقی کرنے کی خواہش ہی مرد کی ترقی کی آدھی قوت ہوتی ہے۔ اس لئے وہ اپنے سے بہتر لوگوں کے سامنے بہت ہی حقیر اور کم تر لوگوں کے سامنے بہت برتر محسوس کرتی ہے۔ اسی وجہ سے وہ بہت خوش اخلاق ہوتی ہے۔ اجتماعی حساسیت اور مامتا کا امتزاج اسے مرد سے زیادہ نرم دل اور ہمدرد بنا دیتا ہے۔ اس کی دلفریب خودپسندی سے قطع نظر اس میں ہمدردی اور رحم دلی کی صفات بدرجہ اتم موجود ہوتی ہیں۔ وہ بیماروں اور کمزوروں کی نگہداشت اور امداد میں پیش پیش ہوتی ہے۔ اس کی فطرت ان اخلاقی خوبیوں سے مالا مال ہوتی ہے۔

ذہن اور قلب کی ان صفات نے اسے مذہب کے زیادہ قریب کر دیا ہے۔ اپنے جذباتی تناؤ کی وجہ سے وہ مذہب کی پکار جلدی سنتی ہے۔ کیونکہ مذہب اس کے حواس اور احساسات کو بہت متاثر کرتا ہے۔ جنسی آرزوؤں پر کڑے دباؤ کی وجہ سے وہ ہر قابل پرستش چیز کی شکر گزاری سے پرستش کرتی ہے۔ وہ ان حوادث کو زیادہ محسوس کرتی ہے جو زندگی کو اداس بناتے ہیں۔ مرے ہوئے عزیزوں سے دوبارہ وصال کی آرزو اس میں بقائے روح کا یقین پیدا کرتی ہے۔ قدرت اس کے لئے ایک مقدس طلسم کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ ممکن ہے کہ اپنی اس نادانی میں وہ ہماری میکانکی سائنس سے کہیں زیادہ قدرت کے اسرار کے قریب ہو۔ وہ جبلی طور پر ان چیزوں کی پرستش کرتی ہے جنہیں مرد تسخیر کرنا چاہتا ہے۔ جسمانی طور پر محتاج ہونے کی وجہ سے وہ قادر مطلق کی پناہ ڈھونڈتی ہے۔ دنیا کے مصائب کی وجہ سے ذہنی طور پر پریشان ہو کر وہ آسمانی ہدایت کے لئے دعا کرتی ہے۔ تنہائی سے خوف زدگی اور بزم آرائی کی دلدادگی نے اس میں خدا کے حضور کی پیاس پیدا کی ہے۔

وہ فضا کو ان روحوں سے آباد کرتی ہے جو شاید اس کی تنہائی اور احتیاج میں اس کی رفیق ہیں۔ وہ نئے عقائد کا خیر مقدم کرنے میں پہل کرتی ہے اور پرانے عقاید کو ترک کرنے میں تامل کرتی ہے۔ مایوسی میں مرد خودکشی کر سکتا ہے۔ لیکن عورت ہر طرف سے ناامید ہو کر اپنے آپ کو آسمانی طاقتوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتی ہے اور خدائے رحیم کی آرزو میں قوت اور تسکین پاتی ہے۔

۳۔ ذہنی اختلافات

تو یہ ہیں مردوں اور عورتوں کی جبلتیں۔ لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ یہ بنیادی محرکات تجربے اور تعلیم سے متاثر نہیں ہوتیں۔ دونوں جنسوں میں ان محرکات کی بنیاد پر عادت اور عقل کی تعمیر استوار ہوتی ہے۔ یہ تعمیر مردوں اور عورتوں میں کس طرح مختلف ہے؟

مردوں میں یہ زیادہ بلند اور زیادہ وسیع ہوتی ہے۔ کئی نسلوں سے مردوں کو گھروں سے نکل کر اس متنوع دنیا میں زندگی کی کشمکش سے دوچار ہونا پڑا۔ انہیں نئے حالات پر قابو پانا پڑا ہے جن پر قابو پانے کے لئے ان کی قدیم جبلی محرکات ناکافی تھیں۔ اس لئے انہیں کامیاب نادر عمل کی لچک پیدا ہو گئی' جسے جبلت کی ذہانت کہتے ہیں۔ جبلت بھی ذہین ہو سکتی ہے۔ اگر حالات روائتی قسم کے ہوں تو جبلت کام آ سکتی ہے۔ اور یہ ممکن ہے کہ وہ عقل سے زیادہ کامیاب ثابت ہو۔ موجودہ زمانے تک عورت کی زندگی کے مرکزی وظائف شوہر حاصل کرنا اور بچوں کی تربیت کرنا تھا۔ اور یہ بات صنعتی طبقہ کی شہری عورتوں کے علاوہ آج بھی سب عورتوں پر صادق آتی ہے۔ یہ مرکزی وظائف بہت قدیم مسائل ہیں۔ ابتدائے تاریخ سے ہر عورت کو ان سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ ان مسائل کے لئے قدرت نے جبلی محرکات کی تعمیر کی تھی جو بالعموم کامیاب ثابت ہوتی تھیں۔

اس لئے عورت (سوائے صنعتی طبقہ کی عورتوں کے) اپنی جبلتوں کے ربط' شدت اور کامیابی میں مرد سے کہیں برتر ہے۔ مرد کی تعمیر میں خردہ گیری' تشکک اور فکرمندی بسی ہوئی ہے۔ لچک کی خاطر اس کی جبلتیں پارہ پارہ ہو گئی ہیں۔ اور ان میں فوری عمل کی صلاحیت اور اعتماد باقی نہیں رہا۔ عورت کے سامنے مرد ہمیشہ بوکھلایا رہتا ہے۔ جہاں کہیں کسی مرد کو پھانسنے' کسی عاشق کو گرویدہ رکھنے یا گھر بنانے کا مسئلہ درپیش ہو' عورت زیادہ خود اعتمادی سے عمل کرتی ہے' بہتر منصوبے بناتی ہے اور انہیں فوراً عملی جامہ پہناتی ہے۔ محبت کی

جنگ میں کوئی تیس سالہ مرد ایک بیس سالہ عورت کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ کسی مرد کو دیکھو (چاہے وہ کتنا ہی بوڑھا کیوں نہ ہو) جو کسی عورت کی محبت میں مبتلا ہے (چاہے وہ کتنی ہی جوان کیوں نہ ہو) وہ کون کس کے اشارہ پر ناچتا ہے۔ کچھ باتیں ایسی ہیں جو عورت ماں کے پیٹ سے سیکھ کر آتی ہے' لیکن مرد کو وہ تلخ تجربے اور مایوسیوں کے بعد سیکھنی پڑتی ہیں۔ عورت دیکھتی زیادہ ہے مگر قوت بیان کم رکھتی ہے۔ مرد دیکھتا کم ہے مگر قوت بیان زیادہ رکھتا ہے۔ عورت بغیر سوچے سمجھے سوچتی ہے اور بغیر تدبر کے جھوٹ بولتی ہے۔ وہ جھوٹ بولنے میں مرد سے کہیں زیادہ ہوشیار ہے اور جب وہ کوئی گناہ کرتے پکڑی جائے تو نہایت اطمینان سے اپنی صفائی پیش کرتی ہے۔

زندگی کے روزمرہ کاموں کے لئے عورت پیدائش ہی سے مسلح ہوتی ہے۔ عورت جلدی بالغ ہوتی ہے۔ اس لئے اس کے عنفوان شباب کا زمانہ مختصر ہوتا ہے۔ کچھ مردوں نے اس بنا پر اسے ایک ادنیٰ جنس قرار دیا ہے۔ لیکن یہ غلط استدلال ہے۔ اس طرح تو فاختہ خدا کی بہترین مخلوق ہے۔ اس طرح تو ہم یہ بھی نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ عورت ذہنی طور پر مرد سے برتر ہے کیونکہ اس کے دماغ کا اس کے جسم سے تناسب مرد سے کہیں زیادہ ہے۔ غالباً اس کے مختصر عنفوان شباب کی وجہ یہ ہے کہ کسی قدیم زمانے میں اسے جلدی ماں بننے پر مجبور کیا گیا تھا۔ مرد بھی اس عمر میں باپ بن سکتا ہے' جو آج کل شادی کی اوسط عمر کا نصف ہے۔ لیکن اقتصادی حالات اس کی اجازت نہیں دیتے۔ عنفوان شباب' جسم اور ذہن دونوں کا ہوتا ہے ۔ اور مختلف حالتوں میں یہ بہت مختلف ہو سکتا ہے۔ کچھ مرد جلدی بلوغت حاصل کرتے ہیں' کچھ دیر سے اور کچھ کبھی نہیں۔ انسان کا عہد عنفوان شباب طویل تر ہوتا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ پیچیدہ تہذیب روز بروز ہمارے فطری رجحانات سے متصادم ہو کر ہمیں زیادہ سے زیادہ بے بس بنا رہی ہے۔ ہمارے زمانے میں بہت کم مرد نصف زندگی گزارنے سے پہلے ذہنی بلوغت حاصل کرتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں عورت جس کی زندگی میں فطری رجحانات کی سادگی ہے چھوٹی عمر ہی میں ذہنی اور جسمانی بلوغت حاصل کر لیتی ہے۔ وہ رسمی طرز عمل کے فوائد کو زیادہ جلدی سیکھتی ہے۔ وہ مدرسے میں اپنے ہم عمر لڑکوں سے زیادہ ہوشیار ہوتی ہے۔ حال ہی میں ریڈ کلف کالج کی لڑکیوں نے ذہنی آزمائشوں میں ہارورڈ کے لڑکوں پر اپنی برتری ثابت کی لیکن یہ نشوونما مرد کی نشوونما سے بہت پہلے رک جاتی ہے۔ عورت اپنی پیدائشی حالت سے اتنی دور تک نہیں بڑھتی جتنا کہ مضطرب اور تجربہ پسند مرد۔ وہ موروثی رجحانات سے چمٹی رہتی ہے اور مرد نئی سے نئی کیفیتوں کے پیچھے

بھاگتا ہے۔ عورت نسلی استحکام کا ذریعہ ہے۔ لیکن مرد انقلاب کا پیغمبر۔ عورت انسانی شجر کی جڑ اور اس کا تنا ہے جو زمین سے وابستہ رہتا ہے۔ اور جب اس کی شاخیں آسمان کی طرف سربلند ہوتی ہیں تو یہ اپنی جڑوں کو مضبوط کرتی ہے۔

اس استحکام کا دوسرا رخ یہ ہے کہ عورت کا احساس قدامت پسند اور فکر نامکمل ہوتا ہے۔ اس کی دلچسپیاں گھریلو اور بالعموم اس کا ماحول گھر ہوتا ہے۔ وہ فطرت کی طرح عمیق اور چاردیواری کی طرح تنگ نظر ہوتی ہے۔ جبلت اسے روایات پسند بناتی ہے' اور وہ روایات کو فنکارانہ خلوص سے چاہتی ہے۔ وہ ذہنی اور اخلاقی شعبوں میں کم تجربے کرتی ہے۔ اگر وہ آزاد محبت کرتی ہے تو اس لئے نہیں کہ آزاد محبت میں اسے آزادی میسر آتی ہے بلکہ اس لئے کہ وہ ایک ذمہ دار مرد کے ساتھ شادی کرنے میں ناکام رہتی ہے۔ کتنی خوشی کے ساتھ وہ ایک مرد کو اپنے قریب لاتی ہے اور اسے گھر میں بسا لیتی ہے اور اگر نوجوانی کے زمانے میں وہ سیاسی اصلاح کی قائل ہو اور اپنی محبت کو تمام انسانیت پر پھیلا دے تو ایک ایماندار شوہر ملنے پر وہ ان ہنگامی دلچسپیوں کو ترک کر دیتی ہے۔ بہت جلد ہی وہ اپنے آپ کو اور اپنے شوہر کو کسی عالمگیر نصب العین کی محبت سے محروم کر دیتی ہے اور اسے خاندان کے ساتھ وفا کے شدید جذبے سے آشنا کرتی ہے۔ نوجوان محبت کے سرور میں یہ کہتا ہے "میں تیرے لئے ساری دنیا کو ترک کر دوں گا۔" اور جب وہ شادی کرتا ہے تو اپنے قول کو عمل میں تبدیل کر دیتا ہے۔

اور ایسا ہونا بھی چاہئے۔ عورت فطری طور پر یہ جانتی ہے کہ اصل اصلاح ہمیشہ گھر سے شروع ہوتی ہے۔ جب وہ ایک آوارہ گرد مصلح کو اپنے بچوں کا شیدائی بناتی ہے تو وہ نسل کی نمائندگی کرتی ہے۔ فطرت کو قوانین اور ریاستوں سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ خاندان اور بچے سے شغف رکھتی ہے' اگر وہ ان کی حفاظت کر سکتی ہے تو وہ حکومتوں اور بادشاہتوں سے بے نیاز ہو جاتی ہے اور ان لوگوں پر ہنستی ہے جو قوانین بدلنے میں مصروف رہتے ہیں۔ اگر آج فطرت خاندان اور بچے کی نگہداشت کرنے میں کامیاب نہیں ہے تو اس لئے کہ عورت نے فطرت کو بھلا دیا ہے لیکن فطرت زیادہ دیر تک شکست خوردہ نہیں رہ سکتی۔ وہ کسی وقت بھی اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے سینکڑوں اور ذرائع استعمال کر سکتی ہے۔ دنیا میں اور لوگ بھی ہیں جو تعداد اور وسعت میں ہم سے زیادہ ہیں جن کے ذریعے وہ اپنا ازلی تسلسل قائم رکھ سکتی ہے۔

٭ عورت اور ذہانت

عورتیں پیدائشی طور پر ذہین ہوتی ہیں۔ کچھ مرد ذہانت کا اکتساب کرتے ہیں اور اکثر مردوں پر ذہانت تھوپی جاتی ہے۔ صنعتی انقلاب کے الجھے ہوئے نتائج کے زیر اثر مرد کی زندگی غیر متوقع اور کڑی ذمہ داریوں سے بھر گئی ہے۔ بہت سے مرد اس بوجھ کے نیچے کچلے گئے ہیں اور بہت سے مردوں نے ذہن میں وہ روشنی اور وسعت پیدا کی ہے جو اعصابی نظام کی تمام قوتوں کو استعمال کرتی ہے۔ اس انقلاب سے پہلے مردوں میں اتنے صاحب فطنت اور دیوانے پیدا نہیں ہوئے۔ جوں جوں صنعت عورتوں کو بھی اپنے اندر سمیٹ رہی ہے ان میں بھی مجبوراً ذہنی ارتقا کا یہ سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ لیکن وہ بدلتے ہوئے بھی مردوں سے ذہنی طور پر خاصی مختلف ہیں۔ عورت فکری تصورات کی اہل نہیں ہے' وہ واقعات کے لئے تیز نظر اور تیز حافظہ رکھتی ہے لیکن وہ کلیہ سازی اور نئی تعبیروں کی اہل نہیں۔ وہ اکثر تفاصیل میں کھو جاتی ہے۔ وہ چیزوں اور اصولوں سے زیادہ شخصیتوں سے دلچسپی رکھتی ہے۔ وہ مسائل پر بحث نہیں کرتی بلکہ مردوں کے متعلق گفتگو کرتی ہے کیونکہ مرد اس کے لئے ایک مسئلہ ہیں۔ شخصیتوں یعنی شوہر اور بچوں سے دلچسپی رکھنا اس کی تقدیر ہے۔ مرد کی تقدیر یہ ہے کہ وہ تجارت اور صنعت کے طوفانوں کے تھپیڑے کھائے۔ اسباب و نتائج کی سنجیدگیوں میں الجھے۔ مرد اور عورت میں دلچسپی لے۔ مرد کے لئے اس کتاب میں دلچسپی لینا آسان ہے جو کسی خیال کی وضاحت کرتی ہو۔ عورت اسی کتاب میں دلچسپی لے سکتی ہے جو کوئی افسانہ بیان کرے۔ بالخصوص مرد کے متعلق افسانہ۔ عورت کائناتی' اجتماعی اور اقتصادی انقلابات کے غیر شخصی عمل کو کبریائی قوتوں اور بہادر انسانوں کے عزائم سے منسوب کرتی ہے۔

جنسوں کے درمیان ذہنی اختلافات کے مطالعہ کرنے والے مردوں کے لئے یہ امر ہمیشہ باعث تسکین رہا ہے کہ عورتوں میں فطین بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ فن میں بھی جس کا تعلق حسن سے ہے' اور موسیقی میں جو جذباتی حساسیت پر استوار ہے عورت نے اپنی کوششوں اور مواقع کے باوجود کوئی خاص بات پیدا نہیں کی۔ مردوں سے زیادہ عورتوں کو موسیقی سے شغف ہے لیکن زیادہ مرد زندہ موسیقی کی تخلیق کرتے ہیں۔ جب مرد عورتوں میں ذہنی اور فنی فطنت کو تسلیم کرتے ہیں تو وہ انہیں مردانہ قسم کی عورتیں کہہ کر تعریف دراصل مردوں ہی کی کر جاتے ہیں۔ شوپن ہار ہمیں یقین دلاتا ہے کہ فطنت اور مامتا آپس میں برسرپیکار ہیں۔ اگر ہم شوپن ہار کی بات مانیں تو ہمیں یہ نتیجہ اخذ کرنا پڑے گا کہ کوئی عورت شوپن ہار کی طرح خطرناک حد تک ذہنی طور پر غیر معمولی ہوئے بغیر ذہنی برتری

حاصل نہیں کر سکتی۔ جارج سینڈ ایک نہایت مردانہ قسم کا سگار پیتی تھی اور جارج ایلیٹ پنسر کی سرد روح کے لئے بھی بہت مردانہ قسم کی عورت تھی۔ مادام جیراڈین کا یہ خیال تھا کہ جارج سینڈ کے ہر ناول میں اس کے تازہ ترین عاشق کا طرز، کردار اور اثر نظر آتا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ جب ہم عورتوں کی تصنیفات پر تنقید کرتے ہیں تو ہمیں اکثر بوفون کا ہم خیال ہو کر کہنا پڑتا ہے کہ انداز تحریر مردانہ ہے۔

عورتوں میں فطنت کی کمی کے کئی اسباب ہیں۔ غالباً ہم فطنت کی تعریف کرتے وقت تعصب سے کام لیتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے ہیں کہ ممکن ہے سیاست، ادب اور جنگ کی طرح مامتا میں بھی فطنت کارفرما ہوتی ہے۔ ہر جنس اور ہر عمر کے فطری وظائف کو پورا کرنے کی اعلیٰ صلاحیت ہی سے ہم فطنت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ پچھلے زمانوں میں فطین زیادہ ہوتے تھے، اب کم ہوتے ہیں تو غالباً ہم یہی غلطی کرتے ہیں۔ ہم آج فطنت کی توقع انہی میدانوں میں کرتے ہیں جن میں وہ پہلے پھلا پھولا کرتی تھی۔ یہ بہت ممکن ہے کہ ہماری وہ ذہنی قوت جو پہلے ادب اور فن کی تخلیق کیا کرتی تھی، اب سائنس اور صنعت کے وسیع شعبوں میں سما جاتی ہو۔ ہم آج اپنے نئے علم اور نئی طاقت کے ذریعے مادی دنیا کی از سرِنو تعمیر کرنے میں مصروف ہیں۔ ہمارے ہاں عظیم مخترع اور سائنس دان بین الاقوامی تجارت کے منتظمین اور وہ سرمایہ دار ہیں جن کا اثر ساری دنیا پر پھیلا ہوا ہے۔ اس زمانے میں افلاطون، شیکسپیئر، لیونارڈو اور بیتھوون کی توقع رکھنا غلطی ہے۔

غالباً فطنت کے معاملے میں مرد اس لئے عورتوں سے بڑھ گئے ہیں کہ فطین عموماً ہر جنس کی تعلیم یافتہ اقلیت میں پیدا ہوتا ہے۔ جب تک کہ دونوں جنسوں میں اعلیٰ تعلیم پانے والوں کا تناسب برابر نہ ہو مردوں اور عورتوں کا مقابلہ کرنا ایک خطرناک غلطی ہے۔ لاکھوں تعلیم یافتہ مردوں میں سے چند مرد فطین ہوتے ہیں اور سینکڑوں تعلیم یافتہ عورتوں میں سے چند عورتیں صاحب فطنت ہوتی ہیں۔ جب انہیں مواقع اور تربیت میسر ہو تو عورتیں سیفو جیسی عظیم شاعرات، جارج ایلیٹ جیسی عظیم ناول نویس، مادام کیوری جیسی عظیم ماہر طبیعات، ہائی پیشیا اور سونیا کاوَلوسکی جیسی عظیم ماہر ریاضی اسپیشیا اور مادام ڈی سٹیل جیسی عظیم مفکر اور ملکہ الزبتھ اور کیتھرائن ڈی میڈیکی جیسی سیاستدان پیدا کرتی ہیں۔ یہ قابل تعجب بات ہے کہ ان ناخوشگوار حالات کے باوجود عورتوں میں بہت ہی فطین عورتیں پیدا ہوئی ہیں۔ غالباً عورتوں میں وہ جسمانی قوت محض نہیں ہوتی جو فنی تخلیق کے لئے لازمی

حسن نہیں ہوتا جو روح کو تخلیق پر آمادہ
ہے۔ غالباً ان میں مردوں کا سا وہ احساس حسن نہیں بلکہ قابلیت اور طاقت ڈھونڈتی ہے جو اُس کی
ہے۔ بالعموم عورت اپنے شوہر میں حسن کو زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ
کی ضامن ہوتی ہے۔ مرد اپنے انتخاب میں طاقت اور صحت کی علامت ہے۔ عورت
حسن مسرت کا ضامن ہے' بلکہ اس لئے کہ وہ نظر انداز کر دیتی ہے' کیونکہ وہ غالب نہیں بلکہ
اپنے جمالیاتی ذوق کو انتخاب شوہر کے وقت تخلیق نہیں کرتی فن کی تحریک کرتی ہے۔ غالباً
مغلوب بننا چاہتی ہے۔ اس لئے وہ فن کی حسن نظر نہیں آتا جو اسے تخلیق پر اکسا
اے مرد میں' مغرور اور مضحکہ خیز مرد میں وہ حسن ہے۔ زندہ حسن حسین ترین فن
سکے۔ وہ تخلیق حسن کیوں کرے جب کہ وہ خود پیکر ہے۔ وہ اول الذکر کا سرچشمہ اور موخر الذکر
سے بہتر ہے اور ذہانت سے زیادہ قابل تعریف ہوتی تو اسے ذہانت کی ضرورت ہی نہ ہوتی اور اگر وہ ذہین
کا مقصد ہے۔ اگر زندگی حسین
ہوتی تو وہ حسین بننے کی کوشش کرتی۔

۵۔ کیا یہ اختلافات فطری ہیں؟

اب فقط یہ سوال پوچھنا باقی ہے کہ آیا یہ ذہنی اختلافات فطری ہیں یا اکتسابی؟ اس سوال کا جواب دینا مشکل ہے۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس کے متعلق سائنس فلسفہ کی طرح' علم کم اور مفروضے زیادہ بہم پہنچاتی ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگرچہ یہ اختلافات ساخت اور وظیفے کے بنیادی اختلافات پر مبنی ہیں یہ افراد میں زیادہ تر اجتماعی اثرات کے تحت پیدا ہوتے ہیں۔ دنیا کے اکثر حصوں میں وہ ان تصورات پر مبنی ہیں جو مردوں نے اپنے فائدے اور تسکین کے لئے عورتوں کے متعلق تیار کئے ہیں اور ماحول کے ہزاروں اثرات کے ذریعے ان پر حاوی کر رکھے ہیں' جیسا کہ ایک لیڈی پروفیسر نے لکھا ہے "لڑکوں میں انفرادیت پیدا کی جاتی ہے' انہیں فکر و عمل میں آزادی کی تربیت دی جاتی ہے۔ انہیں تجربہ کرنے اور خود چیزیں بنانے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ لڑکیوں کو اطاعت' احتیاج اور انحصار کی تعلیم دی جاتی ہے۔ انہیں اس بات کا احساس دلایا جاتا ہے کہ عورتوں میں فکر یا عمل کی آزادی ایک خامی ہے' ایک غیر نسائی صفت ہے۔ ایک لڑکے کو یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ زندگی میں اس کی کامیابی کا انحصار کسی نئے کام کے انجام دینے پر ہو گا۔ سماج لڑکیوں سے کوئی ایسی توقع وابستہ نہیں کرتا۔"

ایک خاص معنی میں ہم ایک وسیع تجربے کی بنا پر اس سوال کا ایک معقول جواب

دینے کے قائل ہو گئے ہیں کہ کیا مردوں اور عورتوں کے ذہنی اور اخلاقی اختلافات موروثی ہیں۔ اقتصادی حالات نے ایک تجربہ کیا ہے اور زندگی خود ایک تجربہ گاہ بنی ہے جسے قدرت نے اس سے ایک عالمگیر تجربے کے ذریعے خود اس مسئلہ کو حل کرنے کی ٹھانی ہو۔ مرد ذہنی طور پر عورتوں سے بہتر ہیں۔ کیا یہ تفوق فطری ہے یا اکتسابی؟ اس سوال کو حل کرنے کے لئے یہ لازمی تھا کہ عورتوں کو کثیر تعداد میں ان متنوع اور متحرک صنعتی حالات کے سپرد کر دیا جاتا جو مردوں کی تعمیر کر رہے تھے۔ ان حالات نے کتنی سرعت سے عورتوں کے ذہن اور شخصیت کو بدل دیا تھا۔ سارے انگلستان اور نصف امریکہ میں یہ تجربہ ہوتا رہا کہ کارخانوں' دفتروں اور دیگر پیشوں کے دروازے دونوں جنسوں پر کھول دیئے گئے۔ اقتصادی حالات نے لاکھوں کروڑوں عورتوں کو گھروں سے نکال کر صنعتی اور تجارتی دنیا میں مردوں کے دوش بدوش لا کھڑا کیا۔ اس تجربہ کا کیا نتیجہ ہوا؟

نتیجہ یہ ہوا کہ آزاد عورتوں میں ایک ایسا فوری انقلاب آیا کہ دنیا دنگ رہ گئی۔ تین نسلوں کے اندر اندر صنعت کے ان نئے کارندوں نے ہر اس میدان میں قسمت آزمائی کی جہاں جسمانی طاقت لازمی نہیں تھی' اور ہر میدان میں انہوں نے مردوں کی ذہنی اور اخلاقی صفات کا اکتساب کیا اور اس طرح کہ مسیحیت کا ہر معلم اخلاق صنف نازک کے مردانہ خصائل کے اکتساب پر افسوس کرنے لگا۔ قانون طب' حکومت' ڈاکہ غرضیکہ ہر شعبے میں عورتوں نے یہ ثابت کر دکھایا کہ عورتیں اپنے محدود مواقع کے باوجود مردوں کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔ کالجوں میں ان لڑکیوں نے تعلیم پائی جن سے کوئی مرد شادی کرنے پر رضامند نہیں ہوتا تھا' کیونکہ ان کے ذہنی تفوق کا یہ بھی تقاضا تھا کہ مرد کے غلبہ کو تسلیم نہ کریں اور یہ بات ہر مرد کو ناگوار تھی۔ جوں جوں دکانوں اور کارخانوں نے کھیتوں اور گھروں کی جگہ لینی شروع کی۔ جنسوں کے درمیان ذہنی اور اخلاقی اختلاف گھٹتا گیا۔

ہم بعد میں اس انقلاب کا زیادہ تفصیل سے مطالعہ کریں گے۔ اس وقت ہم صرف یہی نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اگر عورتوں نے مرد کی پیشہ ور زندگی کی پوری نقل کرنے کی ٹھانی تو وہ اس کا مقابلہ کر سکیں گے' اور ذہنی اور اخلاقی صفات میں مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔ لیکن غالباً عورتیں اچھے ذوق کا ثبوت دیں گی۔ نقالی کا یہ ہنگامی دور ختم ہو جائے گا۔ وہ یہ سمجھ لیں گی کہ نقل خوشامد کی ایک قسم ہے اور مرد اس خوشامد کے مستحق نہیں۔ وہ یہ جان لیں گی کہ علم ذہانت نہیں ہے۔ اور یہ کہ مسرت حسن اور کمال کی طرح فطری رجحانات کی تکمیل میں مضمر ہے۔ حریت پسند عورتیں ناکمل مرد نہیں بلکہ مکمل

عورتیں بنا چاہیں گی۔ وہ ماتا کو ایک ایسا فن بنا دیں گی جس کے لئے اسی محنت اور ذہانت کی ضرورت ہے جو کل پرزوں کے جوڑ توڑ میں صرف ہوتی ہے۔ شاید وہ یہ بھی سمجھ لیں گی کہ یہ بہترین فن ہے۔

ان کی نئی آزادی اتنے ہی پیچیدہ اور اہم مسائل کا پیش خیمہ بنتی ہے جتنے کہ ان کے عہد غلامی سے وابستہ تھے۔ اس معاملہ میں مرد ان کی مدد نہیں کر سکتے۔ کیونکہ مرد کا ذہن اتنا میکانکی اور درشت ہے کہ وہ ان نازک اور خطرناک تبدیلیوں کو نہیں سمجھ سکتا جو عورت کی زندگی اور ذہن میں انتشار پیدا کر رہی ہیں۔ صرف اس کا نیا علم ہی نئے حالات پر قابو پا سکتا ہے۔ غالباً وہ کامیاب ہو گی۔ وہ قوت جس نے اسے آزادی دلائی تھی آزادی کے پیدا کئے ہوئے مسائل بھی حل کرے گی' وہ کوئی ایسی سبیل نکال لے گی جس سے اس کی نرم مزاجی جو محبت اور ماتا میں کمال حاصل کرتی ہے اس کی استعداد' بیدار مغزی اور لافانی حسن کے ساتھ مربوط اور ہم آہنگ ہو جائے!

باب نہم

عصر حاضر کی عورت

۱۔ انقلاب عظیم

ہمارے جدید شہروں کی صنعت زدہ عورت ایک لاثانی جنس ہے جس کی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی۔ اگر ہم تصور میں اپنے آپ کو ۲۰۰۰ء میں لاکھڑا کریں اور پھر یہ سوال پوچھیں کہ بیسویں صدی کے آغاز میں انسانی نقطہ نظر سے کون سا اہم واقعہ پیش آیا تھا۔ تو ہم یہ دیکھیں گے کہ اس کا جواب نہ جنگ عظیم ہے نہ روسی انقلاب بلکہ عورت کی حیثیت کی تبدیلی۔ "تاریخ میں اتنے مختصر عرصہ میں شاید ہی کبھی ایسا عظیم انقلاب رونما ہوا ہو۔ مقدس خاندان جو اجتماعی نظام کی بنیاد تھا' مناکحتی نظام جو انسانی شہوت اور غیر مستقبل مزاجی کے خلاف ہماری مدافعت تھا اور وہ پیچیدہ اخلاقی نظام جو ہمیں بربریت سے ابھار کر تہذیب اور خوش اخلاقی کی بلندیوں کی طرف لے جاتا تھا' اس مضطرب انقلاب میں گرفتار ہے جو ہمارے تمام اداروں کی زندگی اور فکر کی تمام راہوں میں نظر آتا ہے۔ ہم اس بے ربط عہد میں یوں ہی پریشان نہیں ہیں۔

عورت کی حیثیت ایک گھریلو کنیز' اجتماعی ترصیع یا جنسی سہولت کے وسیلے کے کچھ اور ہوتی جا رہی ہے۔ یہ احساس ہماری صدی سے پہلے بھی موجود تھا لیکن اس احساس (یا بغاوت) کی حیثیت ایک غیر اخلاقی استثنیٰ کی سی تھی۔ جسے عبرت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ افلاطون نے عورتوں پر تمام پیشوں کے دروازے کھول دینے کی اپیل کی تھی۔ لیکن ارسطو نے جو اپنے عہد کے تعصبات کا احترام کرتا تھا۔ عورت کی توجیہہ یہ کی کہ وہ رکی ہوئی نشوونما ہے۔ وہ فطرت کی مرد بنانے میں ناکامی ہے۔ عورت غلاموں کی طرح ایک ادنیٰ حیثیت رکھتی ہے۔ اور اس لئے سیاسی اور اجتماعی معاملات میں شرکت کرنے کی اہل نہیں ہے۔ یہودیوں کے خداوند کا بھی یہی خیال تھا۔ اس کے آخری حکم میں بیویوں اور ماؤں کو وہی مرتبہ دیا تھا جو مویشیوں اور جائداد کو دیا تھا۔ یہودیوں کا خدا یہودیوں کی شخصیت کا آئینہ دار تھا اور یہودی ہر جنگ جو قوم کی طرح عورت کو مصیبت سمجھتے تھے۔ ایک لابدی

برداشت کی جاتی تھی۔ تو... سپاہیوں کا واحد سرچشمہ ہونے کی حیثیت سے
معیت جو سپاہیوں کا واحد سرچشمہ ہونے کی حیثیت سے برداشت کی جاتی تھی۔ اس ماں کو جو...
یہودیوں کے ہاں جب بچی پیدا ہوتی تھی تو چراغ نہیں جلائے جاتے تھے۔ اس ماں کو جو...
کو جنم دیتی تھی' دوچند تطہیر کی ضرورت ہوتی تھی' اور ہر یہودی لڑکا باقاعدہ یہ دعا کرتا تھا
"اے خدا میں تیرا ممنون ہوں کہ تو نے مجھے کافر یا عورت نہیں بنایا۔" لیکن یہودی اس
معاملے میں دوسری قوموں سے مختلف نہیں تھے۔ بلکہ کئی حیثیتوں سے اپنے زمانہ کے اخلاقی
نظام سے بہت آگے تھے۔ اہل مشرق عورت کو جب تک کہ وہ بیٹوں کی ماں نہ بن جاتی
حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اور جب تک وہ بیٹے کسی جنگ میں شہید نہ ہو جاتے ان ماؤں
کا پورا احترام نہ کیا جاتا۔ حتیٰ کہ عورتوں کے بہی خواہ افلاطون نے بھی خدا کا شکر ادا کیا کہ
اس نے اسے مرد بنایا۔

اس دن سے آج تک عورتوں کی حیثیت میں لاکھوں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ہم ان
سب کو یہاں بیان نہیں کریں گے۔ یونانی طوائفیں جو قدیم ایتھنز کی زندگی کو رنگین بناتی
تھیں اور جدید زمانے کے بادشاہوں کی درباری رقاصاؤں نے جنسی جاذبیت کے فن کی
پرورش سے مرد کے غلبے سے نجات حاصل کی تھی۔ اسپیشیا اور فرائن کا مفکروں اور فن
کاروں سے میل جول تھا۔ ڈوباری اور پومپاڈور کی صحبتیں دنیا کے پختہ ترین تمدن کا ذہنی
مرکز بن گئی تھیں۔ کچھ وقت تک انقلاب فرانس عالمگیر آزادی کا ضامن بنا رہا۔ کنڈورسے
نے قومی اسمبلی میں عورتوں کے حق رائے دہندگی کی عرضداشت پیش کی اور میری وولسٹون کرافٹ نے مردوں کے حقوق میں عورتوں کے حقوق کا اضافہ کیا۔ لیکن جب کشت و
خون ختم ہوا اور عورتوں نے فرانس کی آزادی پر اپنے پانچ لاکھ بیٹوں کو قربان کر دیا تو
انہوں نے دیکھا کہ آزادی کے علم بردار آزادی اور مساوات کو اپنے گھروں کے اندر دیکھنے
کے روادار نہیں۔ آزادی فقط مردوں کے لئے تھی اور محض قواعد کی رو سے مادہ تھی۔

یہی خیالات ہمارے زمانہ میں بھی موجود ہیں۔ ہم میں سے کس مرد کو جس کی عمر
چالیس سال سے زیادہ ہو وٹو وائینگر کا یہ قول یاد نہیں کہ عورت ایک بے روح حیوان ہے؟
ہم میں سے کس مرد نے عورتوں کے بارے میں شوپن ہار کے مضمون کا لطف نہیں اٹھایا
شوپن ہار کہتا ہے کہ "عورت ایک کوتاہ قد' تنگ کندھوں' چوڑے کولھوں اور چھوٹی ٹانگوں
والی جنس ہے۔" جب نیٹشے نے ہمیں یہ تلقین کی کہ "جب تم عورت کے پاس جاؤ تو اپنی
چابک نہ بھولنا۔" تو کیا ہم مردوں کو تفوق کا احساس نہیں ہوا۔ ہم اس امر کو نظر انداز کر
جاتے ہیں کہ یہ دل فریب کتابیں جنسوں کی دائمی پیکار کا ایک حصہ ہیں۔ یہ کتابیں محدود

پاہیوں کی دفاعی تدابیر ہیں۔ شکست خوردہ مردوں کی حکمت کی آواز ہیں۔ ہم نے یہ نہیں دیکھا کہ ایک حسینہ نے بائرن کے حسن اور رتبہ سے متاثر ہو کر شوپن ہار کو ٹھکرا دیا تھا۔ نیٹشے یورپ کے کئی ممالک میں لوسیلومے کا پیچھا کرتا رہا اور اسے اپنے علم و فضل سے متاثر کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن وہ اسے حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ وہ مغرور فطین وائینگر و یٹینا کے ایک ہوٹل کی ملازمہ کی محبت میں گرفتار تھا۔ جب اس ملازمہ نے اسے ٹھکرا دیا تو اس نے بیتھوون کے گھر میں خودکشی کر لی۔ ہم یہ کتابیں خوشی سے پڑھتے ہیں کیونکہ یہ ہماری اس جنس سے پوشیدہ خصومت کی ترجمانی کرتی ہیں جس سے ہم ہمیشہ محبت کرتے رہیں گے۔

۱۹۰۰ء تک عورت کو کوئی آئینی حقوق حاصل نہیں تھے۔ انیسویں صدی میں افریقہ کی عورتیں زراعتی مشینوں کی طرح بکتی تھیں۔ تاہیتی اور نیو برٹن میں وہ سوروں کو دودھ پلاتی تھی۔ انگلستان میں شوہر بیوی کو بری طرح زد و کوب کر سکتا تھا۔ وہ ہر رات زنا کر سکتا تھا اور بیوی کے پاس سوائے اس کی نقل کرنے کے اور کوئی علاج نہ تھا۔ اگر وہ پیسے کماتی تو وہ مرد کی ملکیت ہوتے' اگر وہ شادی میں جائداد ساتھ لاتی تو وہ مرد کے تصرف میں چلی جاتی' یہ بات کسی مرد کے وہم و گمان میں بھی نہ آئی تھی کہ وہ کبھی کارخانوں میں کام کرے گی۔ یا اسے حق رائے دہندگی حاصل ہو گا۔

اور پھر یہ انقلاب عظیم آیا۔ ان حسین لونڈیوں نے آزادی اور مساوات کے نعرے بلند کئے۔ انہوں نے کھڑکیاں توڑ دیں۔ لیٹر بکس جلا دیئے۔ لمبے لمبے جلوس نکالے اور پرزور تقریریں کیں۔ انہوں نے عزم آہنی سے کام لیا اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئیں۔ اب ہم انہیں زد و کوب نہیں کر سکتے۔ اب وہ ہمارے لئے کھانا نہیں پکاتیں۔ اب وہ شام کو ہمارے ساتھ گھر میں نہیں بیٹھتیں۔ اب وہ ہمارے گناہوں کی فکر کرنے کی بجائے اپنے گناہوں میں مصروف ہیں۔ انہیں اس وقت روحیں اور ووٹ حاصل ہوئے جبکہ مردوں نے اول الذکر کو کھو دیا اور ثانی الذکر کو بھلا دیا تھا۔ اب عورتیں سگریٹ پیتی ہیں۔ گالیاں بکتی ہیں' شراب خوری کرتی ہیں اور سوچتی ہیں۔ اور مغرور مرد جو کبھی ان فنون کا تنہا ماہر تھا آج گھر میں بچوں کی نگہداشت کرتا ہے۔

۸۔ اسباب

ہم ان اداروں اور رسموں کے تنزل کی کیونکر توجیہہ کر سکتے ہیں جو مسیحی عہد سے بھی

زیادہ قدیم تھیں۔ اس انقلاب کی بنیادی وجہ مشینوں کا غلبہ تھی۔ عورتوں کی آزادی صنعتی انقلاب کا ایک حادثہ تھی۔

اس انقلاب نے ایک وسیع پیانہ پر عورتوں کو صنعت میں شامل کر دیا۔ ان کی مزدوری مردوں کی مزدوری سے زیادہ سستی تھی کیونکہ مرد مزدور اجرت زیادہ مانگتے اور بات بات پر جھگڑتے۔ پچھلی صدی میں انگلستان میں مردوں کو کام ملنا مشکل ہوتا تھا۔ لیکن ان کی بیویوں اور بچوں کو کارخانوں میں کام کرنے کی صلائے عام تھی۔ سرمایہ دار محض منافع حاصل کرنے کی تدبیریں سوچتا ہے اسے اخلاقی اداروں سے کوئی سروکار نہیں۔ انیسویں صدی میں انگلستان کے وطن پرست سرمایہ داروں نے گھروں کو تباہ کرنے کی غیر شعوری سازش کی تھی۔

ہماری بڑی بوڑھیوں کی آزادی کے سلسلہ میں پہلا آئینی قدم ۱۸۸۲ء میں اٹھایا گیا۔ اس سال برطانیہ میں فرمان جاری کیا گیا کہ عورتیں اپنی کمائی ہوئی مزدوری اپنے پاس رکھ سکتی ہیں۔ یہ ایک نہایت اخلاقی قانون تھا اور مسیحیت کے بنیادی اصولوں کے عین مطابق تھا۔ اسے کارخانہ داروں نے دارالعوام میں اس لئے پیش کیا تھا کہ انگلستان کی عورتیں مشینوں پر کام کر سکیں۔ تب سے لے کر آج تک منافع کی ترغیب عورتوں کو گھر سے نکال کر دکانوں کا غلام بنا رہی ہے۔ آج انگلستان میں ہر دو میں سے ایک عورت کسی دفتر یا کارخانے میں کام کرتی ہے۔ صنعتوں میں عورتوں کا تناسب مردوں کے تناسب سے چار گنا زیادہ تیز رفتاری سے بڑھ رہا ہے۔ مستقبل کے شہروں میں غالباً ہر عورت گھر سے باہر کام کرے گی۔ (سوائے زچگی کے نادر مواقع پر) ہم میں سے بعض لوگوں کے لئے یہ تصور ناخوشگوار ہے لیکن ہم بھی دس بیس برس کے اندر اس انقلاب کے خوگر ہو جائیں گے۔ ہر عادت معقول معلوم ہوتی ہے۔

عورتوں کی صنعت زدگی کا مطلب لازمی طور پر گھریلو زندگی کا خاتمہ ہے۔ جوں جوں نئی مشینوں کا سیلاب امڈا اور صنعت کے نئے طریقوں نے قیمتوں میں کمی پیدا کر دی۔ کارخانوں نے گھریلو دستکاریوں کو ختم کر کے عورتوں سے گھریلو دلچسپیاں چھین لیں۔ آہستہ آہستہ وہ اپنے قدیم فرائض سے محروم کر دی گئیں۔ گھر کی فضا بے کیف ہو گئی اور عورت بے کار اور غیر مطمئن رہ گئی۔

عورت تعریف کی مستحق ہے۔ وہ گھر کو چھوڑ کر کارخانے میں گئی۔ اس نے اس کام کی تلاش کی، جو اس کے ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ کام کے بغیر وہ ایک بے

فلیٹ بن جائے گی جو کسی متمول گھرانے کی آرائش یا جسمانی طور پر کسی انحطاط پذیر شخص کی بیوی بن جائے گی' وہ اپنی تنخواہ اس خودپسندی اور شادمانی سے پاتی جس کے ساتھ کوئی لڑکا مدرسہ کو اس لئے خیرباد کہتا کہ صنعتی ملازمت کے ذریعے بلوغت حاصل کرے۔ عورتوں نے یہ نئی غلامی اس لئے قبول کی کہ انہیں کوئی کام کرنے کی خوشی حاصل ہو سکے۔

چونکہ گھر اب وہ جگہ نہیں رہی تھی جہاں کوئی کام ہو سکتا یا لوگ اطمینان سے زندگی بسر کر سکتے' مردوں اور عورتوں نے اسے ترک کر دیا اور مشترکہ فلیٹوں میں رہنے لگے۔ ان کی زندگی صبح و شام گھر سے باہر گلی کوچوں کے شور و غوغا میں بسر ہوتی۔ ایک ادارہ جو دس ہزار برس سے قائم تھا ایک ہی نسل میں تباہ ہو گیا۔ ماہرین نفسیات اجتماع یہ کہا کرتے تھے کہ ادارے رسم و رواج اور اخلاق آہستہ آہستہ تبدیل ہوتے ہیں۔ لیکن یہ تاریخ تمدن کا ایک عظیم ترین انقلاب چشم زدن میں رونما ہو گیا۔ ہمارے مدبروں' مبلغوں اور سیاست دانوں نے ہمیں یہ تنبیہہ کی تھی کہ اشتراکی گھروں کو تباہ کر دیں گے لیکن ان کے دیکھتے دیکھتے اقتصادی انقلاب کی غیر شخصی قوتوں نے اس المیہ کو مکمل کر دیا۔

بچے اپنی شوخیوں اور شور و غوغا سے گھر کو زندہ رکھ سکتے تھے۔ لیکن صنعتی انقلاب اپنے ساتھ انہیں بھی بہا کر لے گیا۔ بچے جو وسیع کھیتوں میں مدد بہم پہنچاتے اور باعث مسرت بنتے' بھرے ہوئے شہروں اور چھوٹے چھوٹے گھروں میں محض ایک مصیبت بن گئے تھے۔ دنیا میں مزدوروں کی افراط تھی۔ تولید کی زرخیزی ختم ہو گئی کہ کہیں لوگ ہمیشہ کے لئے مفلس اور جاہل نہ رہ جائیں۔ مشینوں کی آمد سے کارخانے بنے۔ کارخانوں کی بنا پر شہر تعمیر ہوئے' اور شہروں سے جمہوریت' اشتراکیت اور ضبط تولید کو جنم دیا۔ یہ انقلاب کسی کے اختیار میں نہیں تھا۔ ضبط تولید کے سلسلے میں عورتوں کے حقوق کے متعلق شاندار کتابوں کا اس سے کوئی تعلق نہیں اور پادریوں اور حاکموں کی پند و نصیحت اس کی روک تھام نہ کر سکی۔ اس کے نتائج سے دامن بچانے کی فقط یہی صورت تھی کہ یورپ اور امریکہ کی پچھلی صد سالہ تاریخ کو بدل دیا جاتا۔ لیکن تاریخ کبھی لوٹ کے نہیں آتی وہ اپنی ڈگر پر چلتی رہتی ہے۔

شہروں میں بچے فقط ایک سامان عیش تھے۔ کیونکہ پانچ سال کا بچہ کوئی کام نہیں کر سکتا تھا اور خاندان میں ہر نیا اضافہ کرایہ کے بوجھ کو گراں تر کر دیتا تھا۔ تولید اب ایک عام واقعہ نہیں رہی تھی بلکہ اس نے ایک خطرناک عمل جراحی کی صورت اختیار کر لی تھی۔ کارخانوں میں کام کر کے عورت جسمانی طور پر ناتواں ہو گئی تھی۔ جدید مردوں کے انحطاط

پذیر جمالیاتی شعور نے اور نازک اندام عورتوں کی مدح سرائی نے حالات اور بھی بگاڑ دیے تھے۔ صحت مند عورتیں ہمارے فن کاروں اور کامیاب مردوں کے ذوق کی تسکین نہیں کرتی تھیں۔ کیونکہ ان کے لئے حسن تندرست ماتا کی ممکنات کی بجائے ہنگامی جنسی کشش کا نام تھا۔ عورتیں بچے پیدا کرنے کے ناقابل ہوتی گئیں۔ جہاں تک ممکن ہوتا وہ تولید سے گریز کرتیں۔ ان کے شوہر ان سے اکثر و بیشتر اتفاق کرتے۔ وہ نادان یہ نہیں جانتے تھے کہ بچوں پر رقص و سرود سے کم خرچ ہوتا ہے۔

آلات ضبط تولید کے ایجاد نے عورت کی آزادی میں ہاتھ بٹایا۔ بچوں کی نگہداشت کے فرض سے آزاد ہو کر عورت دفتر اور کارخانوں میں سما گئی۔ وہ کارخانے میں مرد کے دوش بدوش کام کرنے لگی۔ وہ مردوں جیسے کام کرنے لگی۔ مردوں جیسی سوچ سوچنے لگی اور مردوں جیسی زبان بولنے لگی۔ عورتوں کو آزادی نقالی کے ذریعے حاصل ہوئی۔ جدید عورت نے روائتی مرد کی اچھی اور بری سب عادات اپنالیں۔ اس نے سگریٹ پینا' غلاظت بکنے' لاادری بننے' بال کٹانے اور پتلونیں پہننے میں مرد کی نقل شروع کر دی۔ نئے حالات نے مردوں میں نسائیت اور عورتوں میں مردانہ صفات پیدا کر دیں۔ یکساں پیشے اور یکساں حالات نے دونوں جنسوں کو ایک ہی سانچے میں ڈھال دیا۔ ایک نسل کے بعد افسوس ناک پیچیدگیوں سے بچنے کے لئے مصنوعی علامتوں کے ذریعے مردوں اور عورتوں میں فرق کرنا پڑے گا۔ اب بھی ان میں تمیز کرنا خاصا مشکل ہے۔

جب ہم اس دہشت کا خیال کرتے ہیں جو پچھلے زمانے کے لوگوں کو بانجھ پن کے تصور سے ہوتی تھی تو ہمیں اس انقلاب عظیم کا احساس ہوتا ہے کہ آج عورتوں کے لئے بانجھ ہونا یا ایک بچہ کی ماں بننا فیشن میں داخل ہے۔ ہمارے زمانے سے پہلے عورت کا احترام اس کے بچوں کی تعداد کے مطابق ہوتا تھا۔ عورت کا کام ماں یا طوائف بننا تھا اور اس سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ اپنے کام کو پوری طرح نبھائے گی۔ ہر روز مسیحی اور غیر مسیحی انسان اپنے خداؤں اور دیوتاؤں سے بچوں کے عطیہ کی دعا مانگتے تھے۔ لوگ وظیفے پڑھتے۔ مقدس مقامات پر جاتے اور دیگر رسوم ادا کرتے۔ مایا قوم کے لاولد لوگ بچوں کے لئے روزے رکھتے۔ عبادتیں کرتے اور ولدیت کی دیوی کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے قیمتی نذرانے چڑھاتے۔ کسی نے ایک افریقی بادشاہ سے پوچھا کہ "آپ کے کتنے بچے ہیں؟" تو اس نے نہایت افسوس کے ساتھ یہ جواب دیا "بہت کم' میرے فقط ستر بچے ہیں!"

ماؤں کی تصویریں ہمیں کیوں اس قدر متاثر کرتی ہیں؟ کیونکہ بڑے شہروں کے وجود

میں آنے سے پہلے بچوں کی کثیر تعداد میں ضرورت ہوتی تھی اور ہمارے احساسات اس ضرورت کے مطابق پروان چڑھے تھے۔ اب شہروں کو بچوں کی ضرورت نہیں رہی۔ شہر اپنی درخشاں روشنیوں اور طویل راتوں کی کشش سے صحت مند دیہاتیوں کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ نیا خداوند رنگین نور سے چمکتا دمکتا اپنے بازو پھیلاتا ہے اور دیہاتی بچے اس کے بازوؤں میں سمٹ آتے ہیں۔ ہر سال وہ لاکھوں کی تعداد میں آتے ہیں اور بہت جلد ہی عقلمند اور بانجھ ہو جاتے ہیں۔ شہری یہ نہیں مانتے کہ انہیں بچوں کی ضرورت ہے اس لئے وہ عورتوں کو طوائف بننے کی تربیت دیتے ہیں اور ان کے دلوں کو مامتا سے داغدار نہیں کرتے۔ ولدیت کا شوق جو کبھی کبھار ہماری متشکک اور سرد روحوں کو گرماتا ہے۔ ہماری آبائی دیہاتی زندگی کی یادگار ہے۔ جب عورتیں بچے جنتی تھیں وہ حالات مٹ گئے ہیں۔ لیکن ہمارے احساسات اب بھی زندہ ہیں۔ ہم میں سے وہ لوگ جو انیسویں صدی میں پیدا ہوئے تھے اور کھیتوں کی فضا میں پروان چڑھے تھے تادم مرگ اس بات پر یقین رکھیں گے کہ جن لوگوں کے ہاں بچے نہیں انہیں خوشی میسر نہیں آسکتی اور یہ کہ تندرست اور توانا بیٹوں اور نیک اور رحم دل بیٹیوں کے ایک خاندان کی تعمیر کے لئے جدید آرٹ کی تصویریں بنانے' جدید موسیقی تخلیق کرنے یا جدید عورت پر مضامین لکھنے سے کہیں زیادہ جرات اور توازن شخصیت کی ضرورت ہے۔

۲۔ ہماری بیٹیاں

عورت کی آزادی ان اقتصادی تبدیلیوں کو رہین منت ہے۔ جن کی وہ خود ذمہ دار نہیں ہے اور اس لئے وہ مذمت کی سزاوار نہیں۔ اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں چاہئے کہ ہم عورت کا مطالعہ کسی قدر غیر جانبدار ہو کر کریں۔

وہ غیر معمولی لچک کے ساتھ صنعتی زندگی کے تقاضوں کے ساتھ مطابقت پیدا کر رہی ہے۔ ذہانت کے اکثر حربے جنہیں نئی نفسیات بنیادی طور پر مردانہ صفات سمجھتی تھی عورتیں انہیں بڑی سرعت سے سیکھ رہی ہیں۔ ان دفتروں میں کام کرنے والی لڑکیوں کو دیکھو ان میں شاید کوئی نیا کام شروع کرنے کی ہمت کم ہوتی ہے (سوائے جنسی معاملات کے) لیکن ان کی خاموشی' قابلیت' ان کی مستقل خوش خلقی' بغیر نمائش کے دفتروں کا سارا کام کرنے کی صلاحیت ہم میں حیرت اور تعریف کے ملے جلے جذبات پیدا کرتی ہے۔ ایک دو نسلوں میں صنف نازک نے صنعت میں وہ مقام حاصل کیا ہے (اور سوائے محض جسمانی

پیشوں کے ہر میدان پہ ایسے چھا گئی ہیں) کہ اگر آج جان سٹوئرٹ مل انہیں دیکھتا تو حیران رہ جاتا کہ اس نے جنس مخالف کے ساتھ کتنی کم توقعات وابستہ کی تھیں۔ ہم یہ نہیں کہ سکتے کہ صنعت میں عورتوں کی شرکت کس حد تک بڑھے گی۔ غالباً وہ وقت آ جائے گا کہ عورتوں کی بہتر موقع شناسی اور تفاصیل پر قابو پانے کا بلکہ مردوں کی زیادہ طاقت کے ساتھ برابر کی اہمیت رکھے۔ جب برقی قوت صنعت میں سے غلاظت اور جسمانی تھکن کے امکانات دور کر دے گی تو مرد کو اقتصادی دنیا میں اپنی حیثیت قائم کرنے کے لئے زیادہ ذہانت سے کام لینا پڑے گا۔

سیاسیات میں ہماری بیٹیاں البتہ اتنی زیادہ خوش نصیب نہیں رہیں گی۔ صنعت زدہ عورت کو اس کھیل میں اس لئے الجھنا پڑا تھا کہ وہ مردوں کے بنائے ہوئے قوانین کے خلاف اپنی حفاظت کر سکے۔ کیا مردوں نے ہزاروں قانونی حد بندیوں سے اپنے جابرانہ حقوق کو محفوظ نہیں کر لیا تھا؟ ان حدود کو ٹوٹنا تھا اور اس جنس کی توانائی کو جذب کرنے کے لئے ہر راہ کو کھلنا تھا۔ کتنی یک سوئی اور قابلیت کے ساتھ انہوں نے اپنے حق رائے دہندگی کی جنگ میں شرکت کی۔ انہوں نے ہر مخالفت کی آواز کو دبا دیا۔ اسی زمانے میں انگلستان اور امریکہ کے باغی مزدوروں نے اسی ناانصافی کے خلاف سیاسی احتجاج کیا لیکن کچھ نہ حاصل کر سکے۔ عورتوں نے سپاہیوں کی طرح یہ جنگ لڑی اور حکومت کے دروازوں پر دستک دی' حتیٰ کہ وہ دروازے ان پر کھول دیئے گئے اور جمہوریت انہیں اپنے بازوؤں میں پناہ دینے پر مجبور ہو گئی۔ آج سے پچاس سال بعد انہیں معلوم ہو گا کہ ان کے ساتھ کتنا بڑا فریب کھیلا گیا ہے۔

چند عورتیں آج بھی یہ نکتہ سمجھتی ہیں کہ مردم شماری آزادی نہیں ہے اور یہ کہ آزادی کوئی سیاسی چیز نہیں بلکہ ایک ذہنی کیفیت ہے۔ لاکھوں ہوشیار اور شادماں لڑکیاں کالجوں اور مدرسوں میں داخل ہیں۔ ہزاروں تعلیمی اداروں میں ان سے ہماری ملاقات ہوتی ہے۔ ان کے چہروں پر سائنس اور ادب سے حاصل کی ہوئی سنجیدگی' ان کی شوخ آنکھوں میں تجسس علم کی تابانی اور ان کے بھرپور حسین جسموں میں زندگی کے احساس کی لچک' ان کا حسن ہماری نظروں کو خیرہ کر دیتا ہے اور ہم ان کی بے فکری اور خوش باشی پر ضرورت سے کچھ زیادہ ہی مہربان ہیں۔ لیکن کیا آپ نے انہیں جماعت میں سوال کرتے دیکھا ہے؟ کیا آپ نے انہیں کسی نظریہ کی دھجیاں اڑاتے اور اپنی رضا کے مطابق دنیا کی ازسرنو تعمیر کرتے دیکھا ہے؟

اس سب تعلیم کا کیا انجام ہو گا؟ کیا یہ لڑکیاں جدید عورت کی نئی مصروفیتوں اور نئے تجربوں میں نئی ذہانت شامل کر کے اس کے ساتھ تعاون کریں گی؟ کیا ذہن اور شغف کی یہ بو قلمونی، جبلت کی وحدت اور فراست کو منتشر نہ کر دے گی؟ کیا یہ نئی ذہانت شوہر حاصل کرنے کے امکانات کو کم نہ کر دے گی؟ سنا ہے کہ رومن شہری ایک تعلیم یافتہ بیوی کے خیال ہی سے کانپ اٹھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر وہ مرد اس عورت کی صحبت میں ناخوش رہتا ہے جس کا دماغ اس کے دماغ کے ہم پلہ ہو۔ وہ صرف اس چیز سے محبت کر سکتا ہے جو اس سے کمزور ہو۔ جس طرح عورت صرف اسی چیز سے محبت کر سکتی ہے جو اس سے زیادہ طاقت ور ہو۔ اس لئے وہ لڑکی جس کی تہذیب فطری جاذبیت پر نہیں بلکہ علم اور خیالات پر مشتمل ہے۔ شوہر حاصل کرنے کے سلسلے میں ناکام رہتی ہے۔ کیونکہ وہ ان شعبوں میں بے جا مداخلت کرتی ہے جن پر صدیوں سے مرد بلا شرکت غیرے قابض رہا ہے۔ عورتوں کے کالجوں کی ساٹھ فی صد گریجویٹ لڑکیاں غیر شادی شدہ رہتی ہیں۔ ایک ممتاز سائنس دان سونیا کاولوسکی نے یہ شکایت کی کہ کوئی مرد مجھ سے شادی کرنا نہیں چاہتا۔ "مجھ سے کیوں کوئی شخص محبت نہیں کرتا جبکہ میں دوسری عورتوں سے کہیں زیادہ ان کی زندگی کو بہتر بنا سکتی ہوں۔ اور پھر بھی لوگ نہایت گھٹیا قسم کی عورتوں سے محبت کرتے ہیں لیکن مجھ سے نہیں کرتے۔" ایک سمجھ دار لڑکی ایک خاص عمر تک پہنچنے سے پہلے اپنے ذہنی تفوق کو چھپائے رکھتی ہے۔

کوئی پچاس برس کے عرصے میں عورتوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جنسوں کے ذہنی اختلافات فطری نہیں بلکہ اکتسابی ہوتے ہیں۔ اس کا لازمی طور پر یہ مطلب نہیں کہ عورتیں بہت جلدی ان ذہنی دشواریوں پر قابو پالیں گی جو وقت اور رسم و رواج نے پیدا کی ہیں۔ عورتوں کا تمدنی ارتقا حال ہی میں شروع ہوا ہے۔ ان کے تمدن کے پیچھے کوئی قدیم روایت اور تحریک نہیں ہے۔ ان کے سامنے ایسی شاندار مثالیں نہیں ہیں جو خود اعتمادی پیدا کرنے میں انہیں مدد دیں۔ صرف ہمارے زمانہ ہی میں عورت کسی قدر مردوں جیسے تعلیمی مواقع سے فیض یاب ہوئی ہے۔ کئی نسلوں تک کالجوں میں مردوں اور عورتوں کا تناسب آبادی میں مردوں اور عورتوں کے تناسب سے کم رہے گا۔ شاید عورت کی قوت کا کچھ حصہ مامتا میں صرف ہو جائے۔ وہ شاید پھر مامتا کو اپنا سب سے بڑا کارنامہ تصور کرنے لگے۔ اور ادب اور فن کے عارضی ہنگاموں کو غیر جنسی مردوں کے سپرد کر کے مطمئن ہو جائے، اسے شاید یہ معلوم ہو جائے کہ دنیا میں چھپے ہوئے لفظ سے بھی زیادہ بہترین چیزیں

ہیں اور شعور اور علم میں خاصا فرق ہے۔

جدید عورت کے جسم کی کیا حالت ہے؟ کیا گھر سے اس کے اخراج اور کارخانے کے کام سے اس کی جسمانی صحت خراب ہو گئی ہے؟ وہ اپنی دادی کی طرح جو زراعت پیشہ تھی اب اتنی تندرست و توانا معلوم نہیں ہوتی۔ اس کے چہرے پر اصلی رنگ بہت کم ہے۔ اور وہ بے بسی اور درد کی طویل مدت گزارنے کے بعد بچے پیدا کرتی ہے۔ لیکن صحت کی خرابی سے صرف عورت ہی کو دوچار نہیں ہونا پڑا بلکہ مرد بھی جب سے انہوں نے زراعتی زندگی کو خیرباد کہا ہے ویسے تندرست و توانا نہیں رہے۔ جدید ذہن زیادہ ہوشیار ہے وہ پیچیدہ آلوں اور مشینوں کو اطمینان اور اعتماد سے حرکت میں لاتا ہے۔ لیکن جدید جسم اب وہ بوجھ اور وہ دباؤ برداشت کرنے کے قابل نہیں رہا جو کبھی وہ اپنی روزمرہ زندگی میں اٹھایا کرتا تھا۔ لیکن ان تمام امراض کے باوجود اس زمانہ کی عورت اتنی کافی حسین ہے کہ فلسفی بھی اسے دیکھ کے کچھ وقت کے لئے سرمست ہو جاتے ہیں۔ ہم عورت کے جس قدر ممنون ہوں کم ہے کہ وہ کن کن حیلوں سے اپنی دل فریب کشش کو اس عمر تک برقرار رکھتی ہے جس عمر میں پہلے زمانہ کی عورتوں کو بوڑھا قرار دے دیا جاتا تھا۔ کسی زمانہ میں ایک چالیس برس کی عورت بوڑھی، متحمل اور قابل اعتماد سمجھی جاتی تھی۔ اور آج دنیا میں اس سے خطرناک ہستی کوئی نہیں۔ گلگونہ لب و عارض اس نقطہ نظر سے فن اور تہذیب کے لازمی نتائج ہیں۔ اگرچہ فطری رنگ غازہ کا قابل تعریف نعم البدل ہے۔

غالباً یہ حسین نزاکت، جدید عورت کی یہ جسمانی ناتوانی ایک ہنگامی اور سطحی حالت ہے، جب دنیا کا مشینی کاروبار برقی طاقت سے چلنے لگے گا تو کارخانے بھی اتنے ہی صاف ستھرے ہو جائیں گے جتنے کبھی گھر ہوا کرتے تھے۔ شہر پھیل جائیں گے اور انسان پھر تازہ ہوا کھانے لگیں گے۔ سیر و تفریح، ٹینس اور باسکٹ بال کے ذریعے شاید پھر ان گلاب کے پھولوں کو اپنا لے جو شہری صنعت اس کے رخساروں سے چھین کے لے گئی تھی۔ جدید لڑکی کا جسم کپڑوں سے ضرورت سے زیادہ آزاد ہوتا ہے۔ مختصر سائے ساری دنیا کے لئے رحمت ہیں (سوائے درزیوں کے) ان کا فقط ایک ہی نقصان ہے کہ وہ مرد کے تخیل کو ختم کر رہے ہیں۔ اور اگر مردوں میں تخیل نہ ہوتا تو شاید عورتوں میں حسن بھی نہ ہوتا۔ الغرض جدید عورت نے جدید زندگی کی رنگینی اور تنوع میں خاصا اضافہ کیا ہے۔ وہ اپنی نئی آزادی کی تحریک کی وجہ سے زیادہ شاداں اور مسرور نظر آتی ہے۔ ہم میں سے کچھ لوگوں کے لئے یہ مشکل ہے کہ اپنے آپ کو عورتوں کے کٹے ہوئے بالوں اور سگریٹ نوشی جیسی عادتوں کا

غور کریں۔ لیکن آئندہ نسل ان سطحی تبدیلیوں کو برا نہیں سمجھے گی۔ حسین عورتیں جو پھر بھی مستقل مزاجی سے کرتی چلی جائیں گی ایک عام مرد کو وہ طرز کردار پسند آتا جائے گا۔ رسم و رواج کا احساس حسن پر خاصا اثر ہوتا ہے۔ پچھلے زمانے میں بوڑھی عورتیں حقہ پیتی تھیں اور مرد برا نہیں مانتے تھے۔ دنیا اسی طرح اپنا کاروبار چلاتی رہے گی۔ اب جب کہ بوڑھی عورتیں بدمعاش ہیں اور جوان عورتیں اپنے عاشقوں کی آنکھوں میں دھوئیں مرغولے پھونکتی ہیں۔ سگریٹ پینا نقصان دہ بھی ہے اور خوشگوار بھی۔ لیکن اگر مرد اور عورتیں ایک مختصر مگر شوخ زندگی کو ترجیح دیتے ہیں تو ہم انہیں روکنے والے کون! ہم کس طرح یہ بات یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ شوخ مزاجی حکمت سے بہتر نہیں ہے۔ لیکن ہم آخر جدید رقص کے بارے میں کیا کہیں گے؟ یہ عورتوں کی ایجاد ہے یا کسی نیوراتی مرد کی؟ کیا یہ ممکن ہے کہ جب بے باک اور بے حیا والٹز نے عہد امارت کے رقص کی جگہ لی تھی تو ہمارے آباؤ اجداد اخلاقی طور پر ہماری ہی طرح غضب ناک ہوئے ہوں۔ پھر ڈاکہ زنی، قتل اور سیاسیات کے شریفانہ فنون میں عورتوں کی بڑھتی ہوئی مہارت کے متعلق ہم کیا کہیں۔ ۱۹۲۶ء میں ایک گم نام شخص نازک حالت میں ایک ہسپتال میں لایا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ تین لڑکیوں نے اس کو بہت بری طرح مجروح کر دیا تھا۔ وہ مرد پیدل جا رہا تھا کہ لڑکیوں نے اسے اپنی کار میں بیٹھنے کی دعوت دی جو اس نے قبول کر لی۔ کچھ دور جانے کے بعد لڑکیوں نے کار کھڑی کر لی اور اس مرد کے ساتھ بوس و کنار کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ان میں سے ایک لڑکی اس مرد کی سرد مہری پر غضب ناک ہوئی اور لڑائی شروع ہو گئی دو لڑکیوں نے اسے پکڑے رکھا اور تیسری نے ایک پن سے اسے مجروح کر دیا۔ اس کے بعد اسے زمین پر بے بس چھوڑ کر لڑکیاں بھاگ گئیں۔ اس کے بعد بھی ہم عورتوں کی آزادی کے متعلق شک کر سکتے ہیں؟

غالباً ہکسلے نے ٹھیک کہا تھا کہ عورتوں کی نیکی مردوں کا سب سے بڑا تخیلی افسانہ ہے۔ عورتوں میں ہمیشہ سے یہ جذبات رہے ہیں لیکن کسی زمانہ میں وہ انہیں ہوشیاری سے چھپا لیا کرتی تھیں کیونکہ انہیں یہ خیال تھا کہ مرد حیا کو پسند کرتے ہیں لیکن آج کل جب مرد بے حیائی سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں، جدید لڑکی جسمانی اور ذہنی بے باکی سے کام لیتی ہے، وہ ہنگامی طور پر حواس کو لبھاتی ہے لیکن روح کو بے نیاز چھوڑ دیتی ہے۔ ایک بالغ مرد عورت کی مدافعت سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ اور عورتوں میں ایک لطیف کم سخنی کی عادت کو پسند کرتا ہے۔ لیکن جب مرد ناپختہ ہوں، جنسی تلون کا شکار بن جائیں، رفاقت اور وفا کی

لذتوں سے ناآشنا رہیں اور سوائے جسمانی دلفریبیوں کے کوئی اور بات ان کے کشش نہ رکھے تو ان کو رشتہ نکاح میں منسلک کرنے کے لئے غیر معمولی اقدامات کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن جب شادی کے بعد خون کی حرات کسی قدر سرد پڑ جاتی ہے تو شادی کے تواتر سے جذبات بجھ جاتے ہیں اور شادی کا انجام عموماً خراب ہوتا ہے۔ برنارڈشا کا خیال غلط تھا کہ شادی زیادہ سے زیادہ ترغیب کے ساتھ تسکین کے زیادہ سے زیادہ مواقع کا نام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مواقع تو باقی رہتے ہیں لیکن ترغیب بہت جلد کم ہو جاتی ہے۔

۴۔ ہماری بڑی بوڑھیاں

ایک جدید مزدور لڑکی کی تصویر، جو اپنے کام میں مصروف ہے اور توانائی اور جذبہ آزادی سے لبریز ہے۔ متوسط طبقہ کی شادی شدہ عورت کی تصویر سے زیادہ حسین ہے۔ متوسط طبقہ کی شادی شدہ عورت ایک ذریعہ آمدنی سے وابستہ ہے اور تاش کھیلنے خرید و فروخت اور اجتماعی اصلاح کے کام میں منہمک رہتی ہے۔

آیئے ہم اپنے آپ کو ایک غیر ملکی کی نظر سے دیکھیں۔ کوئنٹ کیزرلنگ کہتا ہے "امریکہ میں شوہر اسی طرح مجبور و معذور ہے۔ جس طرح قدیم مشرق میں عورت بے بس و لاچار ہوتی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ مرد میں لازمی نفسیاتی انحطاط پیدا ہو رہا ہے۔" وہ یہ بھی کہتا ہے کہ امریکی عورتیں پستانوں کے بغیر مرد نما ہوتی جاتی ہیں اور "سرد مہری و درشتی کا تاثر پیدا کرتی ہیں۔" لیکن پہلی ہی ملاقات میں کوئنٹ کیزرلنگ اور کس بات کی توقع رکھتا تھا۔ ہمیں ان خیالات کو اتنا زیادہ قابل توجہ نہیں سمجھنا چاہئے کیونکہ یہ خیالات برینڈن برگ کی اشرافیت کے پس منظر میں پھلے پھولے ہیں۔ لیکن ان میں اتنی صداقت ضرور ہے کہ یہ مردوں کی مغلوبیت کی پیش گوئی کرتے ہیں۔ یقیناً بہت جلدی ہمارے ہاں چند شوہری کا ادارہ قائم ہو گا اور جابر عورتیں مخنتی مردوں کے حرم تعمیر کریں گی جن کی حفاظت مخنث عورتیں کیا کریں گی۔ غالباً مستقبل میں ہم میں چیونٹیوں اور شہد کی مکھیوں کی طرح تین جنسیں ہوا کریں گی۔ کچھ عورتیں نسل کی بقا کا کام سنبھالیں گی۔ باقی عورتیں اقتصادی معاملات میں اس طرح منہمک ہو جائیں گی کہ پہلے تولید کی آرزو اور پھر اس کی صلاحیت بھی کھو بیٹھیں گی۔ ارتقا کی رو سے ہمارے پاس یہ توقع رکھنے کا کوئی جواز نہیں کہ مستقبل ماضی کو دہرائے گا۔

اس انقلاب کی کیا وجوہات ہیں؟ غالباً یہ کہ وقار کا تصور جسمانی تفوق سے وابستہ نہیں

رہا۔ مرد کے جسمانی تفوق کی وجہ سے عورت محکوم تھی مرد آقا تھا اس لئے کہ وہ عورت کو پیٹ سکتا تھا۔ آج بھی وہ عورت کو پیٹ سکتا ہے۔ اور یہ فلسفے کا ایک نہایت نازک مسئلہ بن گیا ہے کہ مرد نے یہ قدیم رسم کیونکر ترک کر دی۔ غالباً مرد کے اخلاقی شعور کی ترقی نے اس سے یہ رسم چھین لی اور عورت کی جنسی آرزوئے آزادی نے اسے ایک ایسی حیثیت بخش دی ہے کہ وہ اپنا آپ اپنے طالب کے سپرد کر دے۔ لیکن اس ثانوی حقیقت کے پیچھے یہ ایک بنیادی اقتصادی حقیقت پوشیدہ ہے کہ جدید حالات کی پیچیدگی نے جو جسمانی طاقت سے زیادہ ذہانت کے مقتضی ہیں' محض جسمانی حجم کی اہمیت کم کر دی ہے اور متوسط طبقہ کے مرد سے اس کا تفوق چھین لیا ہے' اس کے بعد عورت بستر زیری اور مستقل مزاجی' مرد کی حیا' اس کی حساسیت اور اس کی تکان پر غالب آ گئی۔ جہاں کہیں جسمانی قوت کی اہمیت قائم ہے۔ (مثلاً مزدور طبقہ میں) مرد گھر کا آقا ہے' اور عورت خودمختاری حاصل کرنے کے لئے اپنی روزی کماتی ہے۔

ذرا مفت خور عورت کی حیثیت پر غور کرو' گھر کے کام کاج سے آزاد ہو کر اور آلات ضبط تولید' نرسوں یا خادماؤں کی بدولت مامتا کی پابندیوں سے گریز کر کے وہ بے کاری کا شکار ہو گئی ہے۔ اجنبی تخم کے لئے زرخیز زمین بن گئی ہے اور وہ جتنا کم کام کرتی ہے' قدرتی طور پر اتنی ہی تساہل پسند ہوتی جا رہی ہے۔ وہ کام سے قطعاً جی چرانے لگی ہے۔ وہ کام جو کبھی اسے ایک حسین گڑیا کی بجائے مرد کا مددگار بناتا تھا۔

ہم کسی کام کرنے والی عورت کی چاہے وہ گھر میں کام کرتی ہو یا دفتر میں تذلیل نہیں کرنا چاہتے' کیونکہ وہ زندگی یا مفید اشیاء کی تخلیق کرتی ہے۔ ہم صرف اس عورت کی مذمت کرتے ہیں' جو اپنے حسن کی تجارت کرتی ہے' جو اپنی محبت' تعیش اور دولت کے عوض دیتی ہے' جو دن آرائش میں اور رات تفریح اور بدمعاشی میں گزارتی ہے۔ جدید زندگی کے متنوع ساز و سامان میں ان عورتوں کی تعیش پسندی سے زیادہ الم ناک کوئی بات نہیں ہے۔ ان کے بچے یا تو ہوتے ہی نہیں یا کم ہوتے ہیں' لیکن انہیں بہت سے ملازموں کی ضرورت ہوتی ہے۔ انہیں کوئی کام نہیں ہوتا' لیکن ان کی ضروریات بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ وہ بے کاری کے فن میں ہزاروں دلفریب طریقوں سے مہارت حاصل کرتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مرد بے حد مشقت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور اس کی حیثیت محض ایک "زرساز" مشین کی سی ہو جاتی ہے۔

آج "عورتیں" شادی کی تجاویز کی منتظر رہتی ہیں۔ یہ حالت ان مفت خور عورتوں نے

پیدا کی ہے۔ کیونکہ اس قسم کی عورت اپنے شوہر کو جو کچھ دیتی ہے' وہ باآسانی اسے تھوڑی سی رقم دے کر خرید سکتا ہے۔ ان حالات میں ایک غیر شادی شدہ مرد کے لئے شادی شخصیت کی تکمیل کا وسیلہ نہیں بنتی' بلکہ اسے روحانی طور پر برباد کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ لاکھوں عورتیں اپنی زندگیاں تنہائی میں بسر کر دیتی ہیں' کیونکہ لاکھوں بیویاں اپنا شکار پھانسنے کے بعد کھلم کھلا اسے اس طرح چباتی ہیں کہ سینکڑوں مرد گوشہ گیری کی زندگی کی طرف فرار کرتے ہیں۔ کٹے ہوئے بالوں یا مختصر سایوں میں نہیں' بلکہ ان حالات میں ہمارے زمانہ کی بداخلاقی کا راز پنہاں ہے۔

ہم امید کرتے ہیں کہ یہ شکلیں محض ہنگامی ہیں اور ہمارے ذہن اور اخلاق' سیاسیات اور فن کا انتشار' ایک نئے عہد درخشاں کا پیش خیمہ ہے۔ عنفوان شباب کے زمانے کی طوالت جو حقیقت میں تعلیم اور تربیت کے عہد کی طوالت ہے' شاید اعلیٰ معیاروں کی تعمیر کی علامت ہو۔ غالباً ہم ذہنی بیماروں کی ایک مختصر اقلیت ہیں لیکن ہمارے گرد و پیش لوگ بیاہ رچائیں گے اور بچے پیدا کریں گے اور زندگی کے تسلسل کو اس وقت تک قائم رکھیں گے جب تک ایک نیا اخلاقی نظام اور فکر و کردار کے نئے مستحکم ادارے' انسانیت کو ارفع و اعلیٰ مراتب کی طرف نہیں لے جاتے۔

باب دہم

شادی کی شکست

اور اب ہم شادی کے مسائل سے دوچار ہوتے ہیں۔ غالباً برنارڈشا نے کہا تھا کہ دنیا کے کسی اور موضوع پر اتنی خرافات نہیں لکھی گئی جتنی کہ شادی کے مسئلہ پر لکھی گئی ہے۔ محبت کے بارے میں بے وقوف بننا اتنا ہی آسان ہے جتنا کہ ابتدائے محبت میں احمق بننا ہے۔ ایک گوشہ گیر مفکر بھی یہ بات تسلیم کرے گا کہ ان کے باہمی تعلقات پر خیالات کا اثر بہت تھوڑا ہے اور یہ کہ اقتصادی تبدیلیاں' فلسفہ اور اخلاق کو درہم برہم کر دیتی ہیں۔ فکر کا کام فقط یہ ہے کہ وہ ان تبدیلیوں کا تجزیہ کرے اور کوئی ایسا موزوں طرز کردار وضع کرے جو فرد اور نسل کی بقا کا باعث بن جائے۔ ان معاملات میں تبلیغ کرنا بے سود اور سوجھ بوجھ سے کام لینا مفید ہے۔

ہم اپنی جنگوں اور مشینوں کے درمیان یہ بھول گئے ہیں کہ زندگی کی اساسی حقیقت سیاست یا صنعت نہیں' بلکہ انسانی تعلقات ہیں۔ مرد اور عورت' زندگی' ماں اور بچے کے تعلقات کے گرد رقص کرتی ہے۔ اس باغی لڑکی کی کہانی یاد کرو' جس کا عاشق دسمبر ۱۹۱۷ء میں ماسکو کی بغاوت کے دوران میں مارا گیا تھا۔ جب لوگ اسے دفن کرنے لگے تو وہ قبر میں کود گئی اور اپنے عاشق کے کفن سے لپٹ کر کہنے لگی۔ "مجھے بھی دفن کر دو۔ جب میرا محبوب مرگیا ہے تو مجھے انقلاب کی کوئی پروا نہیں" وہ شاید یہ سمجھنے میں غلطی پر تھی کہ اس کا محبوب جواب دینے سے قاصر تھا اور اس کی جگہ کوئی اور پر نہیں کر سکتا تھا۔ ہم ایک دوسرے سے اتنے ملتے جلتے ہیں کہ شکستہ دل اور شکستہ پیان دونوں غیر معقول معلوم ہوتے ہیں۔ وہ اس حکمت کے ذریعہ جو ہر عورت کے خمیر میں بسی ہوتی ہے' یہ جانتی تھی کہ یہ عظیم انقلاب' محبت ولدیت اور موت کے مقابلہ میں جو انسانی زندگی کا مرکزی سرچشمہ ہے' ایک غیر اہم حیثیت رکھتا ہے۔ وہ مبہم طور پر یہ سمجھتی تھی کہ خاندان' ریاست سے زیادہ عظیم ہے' سپردگی اور مایوسی' اقتصادی پیکار سے کہیں زیادہ دلوں میں اتر جاتی ہے اور بالآخر ہماری مسرت' مملوکات' جائیداد اور طاقت پر نہیں بلکہ محبت کی داد وستد پر مبنی ہے۔

۱۔ شادی کا ارتقا

شادی کا مطلب کیا ہے؟ اگر ہم اس کا ماخذ ڈھونڈ نکالیں، تو ممکن ہے کہ اس کی اہمیت کو بہتر سمجھ سکیں۔ ذرا ایک تازہ مچھلی کا تصور کیجئے، جو اپنے بازو اپنے انڈوں پر پھیلا رہی ہے۔ یہ فطرت کی اس مرکزی حقیقت یعنی مادرانہ شفقت کی ابتدا ہے۔ نباتات اور حیوانات کی دنیا میں بالعموم جنس ماما سے نہیں، بلکہ وافر تناسل کے ذریعہ بقا حاصل کرتی ہے۔ آہستہ آہستہ قدرت نے اس بیجا اسراف کی جگہ والدانہ شفقت کی تربیت شروع کی۔ جوں جوں خاندان کا حجم کم ہوتا والدانہ شفقت بڑھتی جاتی۔ انسانوں میں شادی کا ادارہ محبت کی تقدیس کے لئے قائم نہیں کیا گیا، بلکہ بچوں کی نگہداشت اور تربیت کی خاطر مرد اور عورت کو ایک مستقل رشتے میں مربوط کیا گیا ہے، تاکہ زندگی اپنی نوعیت کے اعتبار سے خوب تر بن سکے۔

شادی فقط ایک انسانی ادارہ ہے۔ پرندوں کی بعض اقسام انسانوں سے زیادہ یک زوجگی پر قائم رہتی ہیں۔ ڈی کرسپنی بورنیو کے انسان نما بندروں کے بارے میں لکھتا ہے۔ "وہ خاندانوں میں رہتے ہیں۔ وہ درختوں پر کھلے اور فراخ گھروندے بناتے ہیں اور جہاں تک میں دیکھ سکا ان گھروندوں میں فقط مادہ اور اس کے بچے رہتے ہیں۔ نر اسی یا کسی ہمسایہ درخت کے تنے پر رات بسر کرتا ہے۔" ویسٹر مارک گوریلا کے متعلق لکھتا ہے کہ "گوریلے خاندانوں میں رہتے ہیں۔ نر گھروندا بناتا ہے اور خاندان کی حفاظت کرتا ہے۔ یہی حال چمپنزی کا ہے۔" سیویج کہتا ہے۔ "اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ گوریلا خاندان کے بزرگ درخت کے نیچے بیٹھ کر پھل کھاتے اور گپیں ہانکتے ہیں اور ان کے بچے ان کے قریب اچھلتے کودتے ہیں اور پر خروش مسرت کے ساتھ ایک شاخ سے دوسری شاخ پر لپکتے ہیں۔"

آہستہ آہستہ وہ اجناس جو اپنے بچوں کی نگہداشت نہیں کرتیں، ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتی ہیں اور قدرت اکثر اجناس میں والدانہ شفقت کی جبلت پیدا کرتی ہے، جو فرد اور نسل کی بہتری کا باعث بنتی ہے۔ بعض اوقات بندریاں اپنے بچوں کی موت پر غم سے جان دے دیتی ہیں۔ بندروں کی ایک جنس میں ماں اپنے بچے کو مسلسل کئی مہینوں تک اپنے ایک بازو سے چمٹائے رہتی ہے۔ انسان میں یہ جبلت اکثر و بیشتر جذبہ غالب کی صورت اختیار کرتی ہے اور جذبہ محبت سے زیادہ قوی اور مستحکم ہوتی ہے۔ ہر عورت اپنے بچے کو اپنے شوہر سے زیادہ پیار کرتی ہے۔ وحشی مائیں بعض اوقات اپنے بچوں کو بارہ برس کی عمر تک گود

میں اٹھائے پھرتی ہیں اور بعض قبائل میں (مثلاً نیوہیبرڈیز) میں کچھ مائیں اپنے بچے کی موت پر خودکشی کر لیتی ہیں' تاکہ وہ موت کے بعد بھی بچے کی حفاظت کر سکیں۔

اس جبلت کے ارتقا کے ساتھ ساتھ وہ مرکزی ادارہ قائم ہوا' جس کا نام خاندان ہے۔ خاندان کا ماخذ بچے کی بے بسی اور تعلیم و تربیت کے لئے حساسیت ہے۔ حیوانوں کا ارتقا بنیادی طور پر حیاتیاتی ہے کیونکہ اس کا تعلق نئے اعضاء کی تخلیق سے ہے۔ لیکن انسانوں کا ارتقا اجتماعی نوعیت رکھتا ہے کیونکہ اس کا تعلق ایک نسل سے علوم و فنون کے سرمایہ کو دوسری نسل تک منتقل کرنے سے ہے۔ قدرت نے خاندان کا ادارہ اس لئے پیدا کیا کہ نر مادہ کی خدمت پر مامور رہے اور مادہ بچہ کی نگہداشت کرتی رہے۔ فطری طور پر مرد عورتوں کے غلام ہیں اور عورتیں فطری طور پر بچوں اور نسل کی غلام ہیں۔ اس فطری غلامی میں ان کی حقیقت کے اسرار پنہاں ہیں۔

ہمیں یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ شادی مرد اور عورت کی جنسی آرزو کو آئینی جواز دینے کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا ادارہ ہے جو والدین اور بچوں کے رشتہ پر استوار ہے اور اس کا مقصد نسل کو قائم اور مستحکم رکھنا ہے۔ اگر شادی فقط ذاتی معاملہ ہوتا تو اسے رسوم اور قوانین کی زد میں سب سے پہلے کیوں لایا جاتا۔ حکومتوں نے مرد اور عورت کی محبت کی تنظیم کے سلسلے میں اتنی احتیاط سے آئین کیوں بنائے ہیں؟ شادی کے رسم و رواج کا یہ ہنگامہ آخر کیوں؟ فقط اس لئے کہ شادی سب سے اہم اور بنیادہ ادارہ ہے' جو زندگی کے سرچشمے کی حفاظت کرتا ہے اور تازہ تر پانیوں سے اس کے بہاؤ کو تیز تر کرتا ہے۔ خدا شاہد ہے کہ شادی کا مقصد شوہر اور بیوی کی خوشی نہیں تھا' بلکہ تناسل اور بچوں کی نگہداشت۔ انسانی وجود پچھلے زمانے میں اتنا مختصر تھا کہ کسی نے فرد کی اہمیت پر غور نہیں کیا۔ جدید زمانے میں زندگی طویل تر ہوتی جا رہی ہے اور اللہ کی مخلوق بڑھتی جا رہی ہے۔ اس لئے فرد نے اپنے آپ سے یہ سوال پوچھا کہ نسل کی بقا تو ہوئی' اس کی اپنی انفرادی خوشی کو قابل غور کیوں نہ سمجھا جائے؟ فرد کے عہد میں شادی کے خلاف بغاوت اپنی موجودہ معراج پر پہنچی ہے۔

شادی کا ارتقا نسلی افادہ کی صورت میں ہوا ہے۔ ابتدائے تاریخ سے شوہر یا بیوی کے انتخاب کے ضمن میں فرد کی آزادی ہمیشہ اجتماعی ضروریات کے تابع رہی ہے۔ اولین جنسی پابندیاں والدین اور بچوں' پھر بہنوں اور بھائیوں کے جنسی تعلقات پر عاید کی گئیں۔ اس کے بعد یہ پابندی لگائی گئی کہ کوئی مرد اپنے قبیلہ کی عورت سے جنسی تعلقات قائم نہ

کرے۔ پچھلے ماہرین اجتماعیات مثلاً لوئیس مورگن ان پابندیوں کی یوں توجیہہ کرتے تھے کہ وحشی انسان قریبی رشتہ داروں سے جنسی تعلقات قائم کرنے کے حیاتیاتی نقصانات کو غیر شعوری طور پر جانتا تھا۔ ان کے بعد ویسٹرمارک اور ایلس نے اس کی وجہ یہ بیان کی کہ قریبی رشتہ داروں کی باہمی شناسائی اور بے تکلفی سے آپس میں نفرت اور حقارت کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ لیکن ہم اپنے وحشی آباؤ اجداد کی ناقابلیت کے بیان میں مبالغہ سے کام لے رہے ہیں۔ ان میں بھی حالات کا اندازہ کرنے اور اپنے اجتماعی نظام تعمیر کرنے کی صلاحیت تھی۔ غالباً جب انہوں نے فرد پر پابندیاں عائد کیں تو نسل کا مفاد ان کے پیش نظر تھا۔

اقتصادی رابطوں کے ساتھ ساتھ شادی کا ادارہ بھی بدلتا گیا۔ خانہ بدوشی کے عہد میں مرد ہاتھ میں ڈنڈا اٹھائے کسی اور قبیلہ میں چوری چھپے چلا جاتا اور کسی خیمہ سے کسی حسین دوشیزہ کو جبراً اٹھا کر لے آتا تھا۔ لیکن دولت اور امن کی ترقی کے ساتھ اخلاق بھی بہتر ہو گئے اور مرد مطلوبہ عورت کے باپ کے پاس ڈنڈا لے کے نہیں بلکہ کوئی تحفہ یا پیمان خدمت لے کے جاتا ہے۔ چھینا جھپٹی کی شادی کی جگہ کاروباری شادی نے لے لی۔ آج یہ ادارہ چھینا جھپٹی اور کاروبار کا ایک عجیب امتزاج بن گیا ہے۔

اس ابتدائی زمانے میں جنگ عام تھی اور خطرے زیادہ تھے۔ مرد عورت سے بہت پہلے موت کا شکار ہوتا تھا اور چند زوجگی باقی ماندہ مردوں کی اس کوشش کا نتیجہ تھی کہ عورتوں کی اکثریت کے مسئلہ کو حل کریں۔ چونکہ عورتیں کئی برس تک بچوں کی نگہداشت میں لگی رہتیں اور جب تک بچہ کا دودھ نہ چھڑایا جاتا' عورتیں شوہروں کے ساتھ ہم بستری نہ کرتیں' اس لئے مرد نے بیویوں کی کثرت اور تنوع کے ذریعہ اپنے مسلسل جنسی تقاضوں کی تسکین کی مفید اور آسان ترکیب سوچی۔ اس کے علاوہ چند زوجگی' یک زوجگی سے زیادہ بچوں کی پیدائش کا باعث بنتی اور بچوں کی فراوانی ایسے لوگوں کے لئے رحمت خداوندی سے کم نہ تھی' جو ہمیشہ جنگوں' حادثوں اور بیماریوں سے دہشت زدہ رہتے تھے۔

لیکن جب جنگوں کا زور کم ہو گیا اور زندگی اور صحت زیادہ محفوظ ہو گئیں' تو عورت کی تعداد اور مردوں کی تعداد کے لگ بھگ ہو گئی اور اس طرح یک زوجگی کا آغاز ہوا۔ یہ ادارہ بچوں کے لئے مفید تھا کیونکہ اب انہیں والدین کی متحدہ محبت میسر آئی اور کنبے کے بہت مختصر ہو جانے کی وجہ سے انہیں کھانے کو ملا۔ یہ ادارہ مرد کے لئے بھی مفید تھا کیونکہ اب مرد اپنی جائداد کو یکجا رکھ سکتا تھا۔ وہ اب بھی آزاد تھا کہ اپنی تنوع پسند جنسی حرکات

کو پوشیدہ طور پر تسکین کرے اگرچہ رواج اور طاقت کے ذریعہ وہ اپنی بیوی کی وفا کو ملوث نہیں ہونے دیتا تھا۔ اس طرح اس کی جائداد اس کے بچوں کو ہی پہنچتی۔ یک زوجگی عورت کے لئے بھی مفید تھی۔ اس نے وہ مسئلہ حسد کسی قدر حل کر دیا جس نے چند زوجگی کو ایک پاگل خانہ بنا رکھا تھا۔ اس ادارہ نے عورت اور مرد کو جنسی مساوات عطا کر دی۔

شادی کی باقی تاریخ عورت اور جائیداد' دولت اور محبت کے درمیان آویزش پر مشتمل ہے۔ خیال تو یہ تھا کہ دولت شوہر یا بیوی کے انتخاب میں ایک فیصلہ کن سبب ثابت ہو گی اور عورت کی محکومی ایک دائمی رسم بن جائے گی' لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔ دولت نے تعلیم کو جنم دیا۔ تعلیم نے مرد کے وحشی جذبات میں نرمی پیدا کی اور صدیوں کے ارتقا کے بعد جسم کے لئے جسم کی ہوس رومانی محبت میں تبدیل ہو گئی۔ بعض ممالک میں والدین اپنی مرضی سے لڑکی کی شادی کسی دولت مند سے کر دیتے' لیکن انگلستان اور امریکہ میں اور ہر ملک میں کہیں کہیں رومانی شادی کا چرچا ہونے لگا۔ آہستہ آہستہ عورت نے جو مرد کی بربریت کی وجہ سے نرم مزاج ہو گئی تھی' اپنی نرم مزاجی سے مرد کی بربریت میں تہذیب پیدا کی۔ آہستہ آہستہ اس نے اپنی شرافت اور ایثار سے مرد کو وحشی کے مرتبہ سے بلند کیا اور اسے یہ تعلیم دی کہ وہ جسمانی کشش کے بجائے عورت کے اندر چند غیر مرئی صفات تلاش کرے۔ اس طرح آرزو کی جسمانی بنیاد پر تہذیب نے رومانی محبت کی نازک مگر حسین عمارت تعمیر کی۔

یقیناً رومانی محبت وجود میں آ چکی تھی۔ عنفوان شباب میں نوجوان خلوص سے لبریز شعر و سخن کی تخلیق کرتے۔ مرد عورتوں کے سامنے گھٹنے ٹیکتے' ان کے ہاتھوں پر بوسہ دینے کے لئے جھکتے اور ان کے گداز جسم کی ملائمت کے علاوہ ان میں کچھ اور صفات کی وجہ سے ان سے محبت کرتے۔ جب کئی دلوں میں آرزو نے جذبہ ملکیت کی بجائے جذبہ سپردگی کی صورت اختیار کی' اور جب مرد نے تادم مرگ محبت کرنے کا پرخلوص پیمان باندھا تو شادی اپنے ارتقا کی آخری منزل پر پہنچ گئی۔ غالباً ہم پھر اس کی معراج نہ دیکھ سکیں گے۔

۲۔ شادی کا تنزل

یہ عہد مشین کا عہد ہے اور اس میں ہر چیز کا بدلتا رہنا لازمی ہے۔ جہاں اجتماعی تحفظ بڑھ گیا ہے' انفرادی تحفظ کم ہو گیا ہے۔ جسمانی زندگی پہلے سے زیادہ محفوظ ہے' لیکن اقتصادی زندگی ہزاروں پیچیدگیوں میں الجھ گئی ہے اور ہر روز نئے خطرات پیدا ہو رہے ہیں۔ جوان لوگ' جو پہلے زمانہ سے زیادہ بہادر اور مغرور ہیں۔ اقتصادی طور پر بے بس اور

جاہل ہیں۔ وہ محبت کرتے ہیں لیکن افلاس کی وجہ سے شادی نہیں کر پاتے۔ کئی سال کے بعد وہ پھر محبت کرتے ہیں، لیکن پھر بھی افلاس انہیں شادی کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ کئی سال اور گزر جانے کے بعد ان کے دلوں میں جذبہ محبت پھر بیدار ہوتا ہے، گو ان میں پہلے جیسی تازگی اور توانائی نہیں ہوتی۔ اب مرد دولت مند ہے اور شادی مرگ محبت کی رسم ادا کرتی ہے۔

اتنی دیر انتظار سے خستہ و پامال ہو کر شہری لڑکی پختگی کی عمر تک پہنچ جاتی ہے۔ داخلی مجبوریاں اسے ستاتی ہیں، جنسی نمائش یا سپردگی سے وہ مردوں کی توجہ حاصل کرتی ہے۔ مرد اسے تحفے دیتے ہیں سیرو تفریح کے سامان بہم پہنچاتے ہیں، شراب پلاتے ہیں مگر ان سے شادی کبھی نہیں کرتے۔ کبھی کبھی اس کے کردار کی آزادی اس کی اقتصادی آزادی کا نتیجہ ہوتی ہے وہ مرد کی محتاج نہیں رہی۔ مرد بالعموم ایسی عورت سے شادی کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا جو جنسی معاملات میں تجربہ کار ہو (اگرچہ مردوں کا یہ میلان شدت میں کسی قدر کم ہو جاتا ہے۔) عورت اپنی اقتصادی خود مختاری کی وجہ سے اس میلان کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ اس کی اقتصادی خود مختاری ہی کسی مرد کو اس سے شادی کرنے سے روکتی ہے۔ مرد کی قلیل آمدنی دونوں کے موجودہ معیار زندگی قائم رکھنے کی کیونکر متحمل ہو سکتی ہے۔

بالآخر ایک مرد اس سے شادی کرنے کی تمنا کا اظہار کرتا ہے۔ وہ شادی کر لیتے ہیں، کسی معبد میں نہیں کیونکہ وہ آزاد لوگ ہیں اور کسی مذہب سے تعلق نہیں رکھتے اور وہ اخلاقی نظام جس کی بنیادیں ان کے بچپن کے مذہب پر استوار تھیں ان کے دلوں سے اپنا اثر کھو چکا ہے۔ وہ کسی کارپوریشن کے دفتر میں شادی کرتے ہیں۔ ان کا پیمان کوئی مقدس پیمان نہیں ہوتا بلکہ ایک کاروباری معاہدہ جسے وہ جب چاہیں توڑ سکتے ہیں۔ ان کی شادی میں کوئی مقدس رسوم ادا نہیں ہوتیں۔ کوئی پرشوکت تقریر نہیں کی جاتی۔ موسیقی کی عظمت کا پس منظر نہیں ہوتا۔ جذبات کی گہرائی اور سرمستی نہیں ہوتی جو ان کے پیمان کے الفاظ کو ہمیشہ کے لئے ان کے دلوں پر ثبت کر دے۔ وہ ایک دوسرے کا بوسہ لیتے ہیں اور لاابالی انداز میں گھر چلے جاتے ہیں۔

نہیں گھر نہیں، کوئی پھولوں سے لدا ہوا اور سایہ دار درختوں میں گھرا ہوا مکان ان کے استقبال کے لئے ان کا منتظر نہیں ہوتا۔ کوئی باغ جو ان کے لئے پھل اور پھول پیدا کرے ان کی راہ نہیں تکتا۔ وہ تنگ و تاریک کمروں میں پناہ لیتے ہیں۔ وہ کمرے جن میں وہ زیادہ دیر تک نہیں سما سکتے اور جنہیں وہ آرائش و ترمیم سے اپنی شخصیتوں کا جزو نہیں

بنانے۔ ان کا مکان کوئی روحانی وجود نہیں رکھتا وہ محض ایک مادی حیثیت رکھتا ہے جو ایک پناہ گاہ کی طرح سرد مہر اور درشت ہے۔ وہ شور و غوغا پتھر کی سلوں اور فولاد کی سلاخوں میں محصور ہے۔ بہار اس کی فضا میں داخل نہیں ہوتی اور انہیں پھلتی پھولتی چیزیں عطا نہیں کرتی وہ انہیں فقط بارش دیتی ہے۔ خزاں آسمانوں پر قوس و قزح کے رنگ نہیں بکھیرتی اور پتے ہر روز نیا روپ نہیں دھارتے۔ خزاں میں انہیں فقط تساہل اور اداس یادیں میسر ہوتی ہیں۔

عورت مایوس ہو جاتی ہے' وہ اس چار دیواری کو خوشگوار بنانے کی کوئی سبیل نہیں پیدا کر سکتی اور کسی نہ کسی بہانے سے وہ اس سے فرار کرتی ہے اور صبح کے وقت اس میں واپس آتی ہے' مرد مایوس ہوتا ہے کیونکہ وہ دن بھر کی مشقت کے بعد اس میں گھر کا سا آرام اور اطمینان نہیں پاتا' آہستہ آہستہ اسے یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ یہ کمرے بالکل ایسے ہی ہیں جیسے کبھی اس کے غیر شادی شدہ زمانہ میں ہوا کرتے تھے اور یہ کہ اس کے اپنی بیوی سے روابط بالکل اسی طرح بے کیف ہیں جس طرح کبھی سہل الحصول عورتوں کے ساتھ ہوا کرتے تھے۔ شادی سے کوئی نئی بات پیدا نہیں ہوئی' بچے کی آواز رات کی نیند میں مخل نہیں ہوتی' بچے کے کھیل کود دن کو درخشاں نہیں بناتے' بچہ اپنے گداز بازوؤں سے خیر مقدم کر کے دن کی محنت اور مشقت کی تکان کو دور نہیں کرتا۔ کیونکہ اگر بچہ پیدا ہو تو وہ کھیلے گا کہاں؟ وہ ایک اور کمرہ کیونکر کرایہ پر لے سکتے ہیں؟ اور بچہ کی تعلیم و تربیت کے اخراجات کیونکر برداشت کر سکتے ہیں؟ وہ یہ سوچتے ہیں کہ احتیاط بہتر ہے' وہ یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ وہ بچے پیدا نہیں کریں گے۔ جب تک کہ وہ علیحدہ نہیں ہو جاتے۔

ان کی شادی' شادی نہیں ہوتی' وہ ماں باپ کا تعلق نہیں ہوتا بلکہ ایک جنسی تعلق ہوتا ہے۔ اس لئے پھلتا پھولتا نہیں وہ آبیاری سے محروم ہو کر مرجھا جاتا ہے۔ وہ اس لئے ختم ہو جاتا ہے کہ وہ نسل کی زندگی سے علیحدگی پر مبنی ہوتا ہے۔ میاں بیوی اپنے آپ میں سمٹ کر رہ جاتے ہیں۔ محبت کی فراخ دلی' ذاتیت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ مرد کی فطرتی تنوع پسندی عود کر آتی ہے' بے تکلفی نے ایک دوسرے کے لئے جذبہ تحقیر پیدا کر دیا ہے اپنی سخاوت اور سپردگی میں عورت کوئی نئی چیز دینے کی اہل نہیں رہی۔

لاولد ہونے کی وجہ سے انہیں اتفاق کے ہزاروں بہانے ہاتھ آ جاتے ہیں' آغاز محبت کے پیار بھرے کلمے اب استعمال تو ہوتے ہیں لیکن ان میں خلوص نام کو نہیں ہوتا۔ عورت ابتدائی زمانہ کی محبت کو یاد کرتی ہے وہ گھر میں اپنے جسم' لباس' قول و عمل کی پروا نہیں

کرتی، جس نے کبھی مرد کو اپنی طرف کھینچا تھا۔ اگر کوئی جنسی تناقص پیدا ہو جائے تو وہ ایک ناقابل عبور خلیج بن جاتا ہے کیونکہ وہ شادی کو محض ایک جنسی تعلق سمجھتے ہیں۔ اگر وہ مفلس ہیں تو مرد اپنی ذمہ داریوں کے اضافے پر کڑھتا ہے اور عورت پرنس آف ویلز کے خواب دیکھتی ہے۔ اگر وہ دولت مند ہیں تو حرص اور خوف کی ذاتیت، محبت اور شادی کی مصنوعی مساوات سے متصادم ہوتی ہے، پیسے کے جھگڑے محبت کے خاتمے کے ساتھ ہی شروع ہو جاتے ہیں۔ اگر وہ مہذب لوگ ہیں تو مساوات کا دم بھرتے ہیں اور جب تک کہ ایک دوسرے پر غالب نہ آ جائے، ان کی جنگ ختم نہیں ہوتی۔ اگر عورت کام کرتی ہے تو وہ اپنی غلامی پر نالاں ہے۔ اگر وہ بے کار ہے تو وقت کاٹنا اس کے لئے وبال جان بن جاتا ہے حتیٰ کہ شیطان اسے کوئی نہ کوئی مصروفیت بہم پہنچا دیتا ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ وہ بچوں کی تربیت کی استطاعت نہیں رکھتے۔ وہ بالزک کی طرح یہ انکشاف کرتے ہیں کہ "بدی، کنبہ پروری سے سستی ہوتی ہے" اگر ان میں سے ایک کے بہت سے دوست ہیں تو دوسرا ان کا حاسد ہے۔ اگر دونوں کا کوئی دوست نہیں تو دونوں مجبوراً ایک دوسرے کی بے کیف محبت میں وقت گزارتے ہیں۔ ملکیت اور تجسس کے جذبات کے باعث محبت کی آزادی ختم ہو جاتی ہے۔ روح کو کہیں امن اور اطمینان نصیب نہیں ہوتا، محبت ایک مسلسل پیکار میں تبدیل ہو جاتی ہے، جس میں رات کا اختلاط ہنگامی صلح کی حیثیت رکھتا ہے۔

مرد اور عورت دونوں یہ محسوس کرتے ہیں کہ محبت کی شدت اور گرمی ان کی اپنی مسرت کے لئے نہیں بلکہ نسل کی بقا کے لئے تھی۔ عورت دیوی سے باورچن بن جاتی ہے (لیکن کبھی کبھی اسے کوئی ایسا شریف الطبع شوہر میسر آتا ہے جو باورچن کو دیوی بنا دیتا ہے۔) وہ مرد کی تنوع پسندی کو محسوس کرتی ہے اور اس کے اعمال پر کڑی نظر رکھتی ہے کیونکہ وہ جانتی ہے کہ وہ مرد پر زیادہ دیر بھروسہ نہیں کر سکتی۔ وہ دیکھتی ہے کہ مرد کی توجہ کم ہوتی جا رہی ہے اور وہ حضور قلب کے بغیر محبت کرتا ہے۔" مرد اپنی بیوی کو ایک اجنبی کی نگاہ سے دیکھنے کا اہل نہیں رہتا۔ شوہر اور بیوی دونوں کو دور کے ڈھول سہانے معلوم ہوتے ہیں اور نیا محبوب حسین تر سمجھا جاتا ہے۔ جب عورت لاولد یا بیکار ہوتی ہے تو وہ کسی اجنبی مرد کی تمنا میں مبتلا ہو جاتی ہے جو اس کی آرزو کو دلفریب خوشامدوں سے بھڑکائے۔ دونوں زنا کا ارادہ نہیں رکھتے وہ فقط زندگی کی آرزو رکھتے ہیں لیکن یکایک حواس شعور پر غالب آ جاتے ہیں۔ وفا غائب ہو جاتی ہے اور ایک دوسرے کے متعلق شکوک ابھر آتے ہیں اور دونوں ایک دوسرے کی بے وفائی پر غیظ و غضب کا اظہار تو کرتے ہیں لیکن

ساتھ ساتھ اس کا خیر مقدم بھی کرتے ہیں۔ کیونکہ اس طرح انہیں آسان راہ نجات مل جاتی ہے۔

اور وہ علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ انہیں طلاق کی عدالت میں دیکھئے۔ جب دوسرے لوگ اپنی دکھ بھری داستانیں بیان کرتے ہیں تو وہ مغموم اور اداس ہو کر اپنی باری کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔ جب ان کی باری آتی ہے تو وہ ایک دوسرے کے ظلم و ستم کو مبالغہ آمیزی سے بیان کرتے ہیں اور اپنے گزشتہ محبوبوں کو گالیاں دیتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں جو صرف وہی لوگ کہہ سکتے ہیں جنہیں محبت کے عہد و پیمان یاد ہوں۔ وہ جلدی ہی آزاد ہو جاتے ہیں' طلاق ہو جاتی ہے۔ وہ از سرنو تجربہ کر سکتے ہیں لیکن حالات اور لوگ وہی ہیں انجام کیونکر مختلف ہو گا؟

اکثر شادیوں کے فوراً بعد ہی علیحدگی ہو جاتی ہے۔ اور بہت کم لوگ وفاداری کے متحمل ہوتے ہیں۔ لیکن مطلقہ لوگوں کی تعداد ناخوش شادیوں کی تعداد سے کہیں کم ہے۔ بہت سے لوگ علیحدہ ہونا چاہتے ہیں لیکن شرم یا قانونی پابندیوں کے باعث علیحدہ نہیں ہو سکتے۔ جو لوگ علیحدہ نہیں ہوتے' ان کے دلوں میں علیحدگی کی جرات کی بجائے رسوائی کا خوف ہوتا ہے۔ محبت کی جگہ بیزاری اور وفا کی جگہ فریب ہوتا ہے۔ اگر یہ بھی علیحدہ ہو جائے تو بہتر ہوتا کیونکہ اس طرح شادی کا انحطاط واضح ہو جاتا اور ہر فکر و تدبر کرنے والے سیاست دان کے لئے (جو صدی میں ایک ہوتا ہے) اور ہر عاشق کے لئے جو محبت کو اتنی جلدی مرتے نہیں دیکھ سکتا' فکر و تدبر کا مواد بہم پہنچاتا۔

۳۔ شادی کی تعمیر نو

مرض کی تشخیص تو آسان ہے لیکن اس کی دوا تجویز کرنا مشکل ہے۔ وہ کونسا نیا علاج ہے جو ہزاروں مرتبہ پہلے تجویز نہیں کیا گیا؟ اور وہ کونسا نسخہ ہے جو آزمائش میں ناکام نہیں رہا؟ ہم کیا نصیحت کریں کیونکہ ہر نصیحت زخموں پر نمک چھڑکتی ہے' اصلاح نہیں کرتی؟

شاید ہمیں اس مسئلہ کو بالائے طاق رکھ دینا چاہئے اور قدیم مسیحی مذاہب کی طرح یہ کہنا چاہئے کہ فرار کی ہر راہ مسدود کر دو' تو قیدی یہ سمجھنے لگیں گے کہ وہ قید میں نہیں ہیں۔ اگر شادی' بچوں اور نسل کے لئے ہے تو بچوں کی خاطر شادی کو اٹل بنا دو تاکہ جو رشتے خدا نے جوڑے ہیں' انسان انہیں توڑنے نہ پائے۔ انسان ایک دوسرے سے اتنے کمائل ہیں کہ اگر ہم ایک سے نباہ نہیں کر پائے تو گمان غالب ہے کہ دوسرے کے ساتھ بھی

وہی الجھنیں پیدا ہوں گی۔ انسان دکھ اٹھانے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ وہ شادی کرے اور دکھ سکھ کو صبر و استقامت کے ساتھ برداشت کرے۔

لیکن کیا ہم ناپختہ جوانوں کے جذباتی عہد و پیمان کو ناقابل تحلیل قرار دے سکتے ہیں؟ کیا ہم دو روحوں کو ہمیشہ کے لئے باہم منسلک کر سکتے ہیں جب کہ ان کی محبت' نفرت میں تحلیل ہو گئی ہو؟ نسل کے ارتقا کا راز اس امر میں مضمر ہے کہ اس کی خاطر افراد کو اپنی شخصیتوں کی قربانی کم سے کم کرنا پڑے۔ نسل کو فرد پر فوقیت حاصل ہے لیکن فقط اس لئے کہ وہ اعلیٰ افراد پیدا کرے' ورنہ نسل محض ایک لفظ ہے' فقط ایک قیاس۔

ہمارے ذاتیت پسند زمانہ میں شادی کا ایک بالکل مختلف نظریہ پیدا ہوا ہے جسے "آزاد محبت" کا دلفریب نام دیا گیا ہے۔ اس نظریہ کی رو سے اگر عہد و پیمان محض ٹوٹنے کے لئے ہی استوار ہوتے ہیں' تو ہم عہد و پیمان کریں ہی کیوں؟ اگر شادیوں کا انجام طلاق ہی ہے تو ہم رسمی شادی کو ترک کیوں نہ کر دیں؟ اگر محبت شادی کی محرک ہے تو محبت کی موت' طلاق کے لئے بہترین جواز ہے۔ عاشق اور محبوب کو ذاتی دیانت اور اعتماد کی بنا پر یکجا ہو جانا چاہئے۔ جب محبت ختم ہو جائے تو انھیں زندگی اور شباب کے احیاء کے لئے نئے محبوب تلاش کرنے چاہئیں۔

مسئلہ شادی کا یہ حل روز بروز زیادہ سے زیادہ مقبول ہوتا جا رہا ہے۔ جج لنڈزے کہتا ہے کہ ۱۹۲۲ء میں شادی کی درخواستیں ۱۹۲۱ء کی نسبت ۲۵/فی صد کم تھیں وہ اس تخفیف کو "آزاد محبت" کی مقبولیت سے منسوب کرتا ہے۔ یہ آزاد اتحاد نہایت قابل تعریف حل ہے' مسئلہ شادی کا۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ عورت اقتصادی اور نفسیاتی طور پر مرد کی محتاج ہے۔ ماہواری اور حمل اسے وقتاً" فوقتاً" بے کار بنا کر اس کے کمانے کی صلاحیت کو کم کر دیتے ہیں' جب تک کہ وہ گھر نہ بنائے اور ان خطرات سے کوئی مستقل تحفظ حاصل نہ کرے۔ آزادی کے تمام فوائد مرد کے حصے میں آتے ہیں۔ آج کل۔ اگرچہ یہ احساس کم ہو رہا ہے لیکن بہرصورت موجود ہے کہ عورت اپنے آپ کو مرد کے سپرد کر کے اس کی نظروں میں اپنی وقعت کھو دیتی ہے۔ مرد ایک جنگجو حیوان ہے۔ کم سے کم وہ اپنے آپ کو یہی سمجھتا ہے۔ وہ مدافعت کو خواہ وہ مصنوعی ہی کیوں نہ ہو پسند کرتا ہے۔ جب وہ پوری طرح تسخیر کر چکتا ہے تو تسخیر کے نئے میدان تلاش کرتا ہے۔ مرد کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کی بیوی اس سے پہلے کسی اور مرد کے ساتھ وابستہ نہ رہی ہو۔ وہ کسی تجربہ کار عورت کے ساتھ ہنگامی معاشقہ پر فوراً رضامند ہو جاتا ہے لیکن اسے بیوی بنانا پسند نہیں

کرتا۔ وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ تجربہ کار عورت شادی کی ابتدائی جذباتی شدت کو کھو کر پھر تنوع پسندی کا شکار ہو جائے گی۔ لیکن مرد اپنا تجزیہ نہیں کرتا۔ اپنے آپ کو اس نظر سے نہیں دیکھتا۔ اس کے یہ احساسات اور جذبات شادی کی اس قدیم رسم پر مبنی ہیں' جب عورت دام و درم کے عوض خریدی جاتی تھی اور مرد کی ملکیت بن جاتی تھی۔

یہ حالات بدل جائیں گے اور شاید جب عورت کی اقتصادی خود اختیاری مکمل ہو جائے گی اور آلات ضبط تولید' جنسی تعلقات کو تولید سے ممیز کر دیں گے۔ تو مرد عورت کو بھی اسی معیار سے پرکھے گا' جس سے وہ اپنے آپ کو جانچتا ہے۔ اس طرح ہمارا قدیم اخلاقی نظام ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا' لیکن اس کے خاتمے سے پہلے مرد کی انانیت اور غیر ذمہ داری کے باعث عورت کو درد و الم سہنا پڑے گا۔ آزاد محبت صرف مرد کو آزادی بخشتی ہے۔ کسی روز عورت اپنی زندگی کی باگیں اپنے ہاتھ میں لے گی اور ماتا اسے کسی تنوع پسند مرد کے رحم و کرم کا محتاج نہیں رکھے گی۔ دور دراز مستقبل میں کسی دن ہم شاید مرد کو عورت کے ساتھ محبوس کئے بغیر بچوں کی نگہداشت کی کوئی سبیل نکال لیں گے۔ اس وقت "آزاد محبت سب کے لئے نعمت ہو گی۔ لیکن اس وقت تک ہمیں قانون کا پابند رہنا چاہئے۔

عوام کے ذہن میں آزاد محبت اور رفاقتی شادی کے تصور الجھ کر رہ گئے ہیں۔ رفاقتی شادی کی مستند تعریف ہے "وہ قانونی شادی جس میں ضبط تولید کی قانوناً اجازت ہو اور لاولد جوڑوں کو باہمی رضا و رغبت سے طلاق کا حق حاصل ہو۔ بالعموم بغیر اس نان نفقہ کے جو شوہر مطلقہ بیوی کو دیتا ہے" اس شادی میں سوائے "نان نفقہ" والی شق کے کوئی خطرناک بات نہیں۔ اور یہ عام شادی سے کچھ ایسی مختلف بھی نہیں۔ لوگوں کو فقط اس بات کا اندیشہ ہے کہ یہ تصور' مرد اور عورت کی مساوات کو مکمل کر دیتا ہے' بہت جلدی' امیر گھرانوں کی تعیش پسند عورتوں کی بدولت جنس نازک' مرد کے انتقام کی آماجگاہ بننے والی ہے۔ شادی کی ہیئت بدل رہی ہے۔ اب وہ بے کار عورتوں کو برداشت نہیں کرے گی' جو بہت سے گھروں میں محض خوفناک آرائش کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مرد اپنی بیویوں کو یہ دعوت دے رہے ہیں کہ وہ خود کمائیں اور کھائیں۔ رفاقتی شادی اصرار کرتی ہے کہ عورت بچہ پیدا کرنے تک خود کمائے۔ عورت کی آزادی اس وقت مکمل ہو سکتی ہے' جب وہ اپنی روزی خود کمائے۔ اور یہی صنعتی انقلاب کی منطقی حد ہے۔ عورت کارخانے میں مرد کے دوش بدوش کام کرے گی۔ وہ محنت اور اجرت' فرائض اور حقوق میں مرد کی معزز شریک ہو

گی۔ اس کا نام ہے آزادی۔

قابل تحسین ہے وہ شخص جس نے فرسودہ عقائد کا مقابلہ کر کے جدید شادی کے امراض کا یہ علاج پیش کیا ہے لیکن یہ ایک درشت اور جارحانہ علاج ہے۔ اسے ہر معقول شخص اس وقت تک صحیح نہیں سمجھے گا' جب تک کہ عورت کی اقتصادی خود اختیاری مکمل نہ ہو جائے۔ جیسا کہ ہم دیکھ آئے ہیں۔ مرد فطری طور پر ہوس ناک اور تنوع پسند ہے۔ جونہی شادی کی ابتدائی ندرت ختم ہوئی اور عورت مدافعت کے تمام اسلحے پھینک دے گی' وہ حسن و جمال کے نئے قصر فتح کرنے پر کمربستہ ہو جائے گا۔ یہ درست ہے کہ رفاقتی شادی میں طلاق فریقین کی رضا سے ہو گی اور جدید عورت فوراً طلاق کی درخواست منظور کرے گی' لیکن وہ پھر خود کیا کرے گی؟ صنعت کے جہنم میں جھونک دی جائے گی اور اس کی قدر و قیمت مرد سے کہیں زیادہ کم ہو جائے گی۔

یہ معمولی مشکلات ہیں اور غالباً تجربہ اس علاج میں قطع و برید کر سکتا ہے۔ اس علاج میں سب سے زیادہ تعمیری عنصر یہ ہے کہ یہ اوائل شباب میں شادی کی ترغیب دیتا ہے اور یہی ہمارے اخلاقی مسئلہ کی جان ہے۔ اگر ہم کسی طرح شادی کی فطری عمر کو بحال کر سکیں تو عصمت فروشی' خفیہ امراض' غیر صحت مند پاکیزگی اور جنسی بے راہ روی میں فوراً خاصی تخفیف ہو جائے۔

پھر غور کیجئے کہ کتنے کم لوگ اس سے شادی کر سکتے ہیں جسے وہ سب سے زیادہ چاہتے ہیں۔ شباب کے درخشاں ولولے' ہماری مالی خود اختیاری سے پہلے ہی پیدا ہو جاتے ہیں۔ ہم شادی کے عظیم تجربہ سے گریز کرتے ہیں اور محبت کو ختم کر دیتے ہیں۔ ابتدائی شباب کی محبت تازہ اور گہری ہوتی ہے۔ تیس برس کی عمر کے بعد کوئی مرد جوانی کے جوش اور سپردگی کے ساتھ محبت نہیں کر سکتا۔ پہلی محبت' روح میں جو سپردگی پیدا کرتی ہے وہ ایک برس کے اختلاط اور آزمائش سے ختم نہیں ہوتی۔ لڑکے کی معصوم ہوس اور لڑکی کا بے باک اعتماد زندگی کو ہمیشہ خوشگوار رکھے گا۔

پہلی محبت کی شادی کا تصور کیجئے نئے جوڑے نے رہائش کے لئے کوئی تنگ و تاریک کمرہ نہیں چنا' بلکہ اس فضا میں ایک نیا گھر لیا ہے جہاں قدرت کی معصومیت ابھی تک کسی قدر قائم ہے۔ نئے گھر کی زینت اور آرائش کے متعلق ہزاروں خوشگوار بحثیں ہوتی ہیں' کیا کیا خریدا جائے اور اسے کہاں کہاں رکھا جائے؟ میاں بیوی گھر کے باغیچہ میں پھول اگاتے ہیں اور ان کی نشوونما کے ساتھ ساتھ خود بھی پھلتے پھولتے ہیں۔ گھر کو رنگ اور

نز، کتابوں اور دوستوں سے آباد کرتے ہیں اور اسے بھرے بازاروں کی تابانی اور شور و غوغا سے کہیں زیادہ دلفریب بنا دیتے ہیں اور بالاخر ایک بچہ کی شوریدہ سری اور مسرت سے گھر کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ ہم بار بار شادی کی پابندیوں کا مضحکہ اڑاتے ہیں، لیکن ہمارے دلوں میں ان دنوں کی یاد ہمیشہ ایک کسک بنی رہے گی۔ جب محبت جوان تھی۔

اوائل شباب کی شادی پر بہت سے اعتراضات ہو سکتے ہیں۔ پند و نصیحت کرنا بے کار ہے۔ جوانوں کی مالی احتیاط کو ہم اخلاقی مواعظ سے دور نہیں کر سکتے۔ لیکن نوجوان خود نہیں .... بلکہ ان کے والدین شادی کے التوا کی نصیحت کرتے ہیں اور جوانوں پر اقتصادی پابندیاں عائد کر کے اسے ممکن بناتے ہیں۔ شباب کی بے باکی کو شادی کی تلقین کرنا تحصیل حاصل ہے۔ ہمیں والدین کو یہ سمجھانا چاہئے کہ وہ اپنے بچوں کی شادی کو ملتوی کر کے ان میں جنسی بے راہ روی پیدا کر رہے ہیں، اور حکمت اسی میں ہے کہ صحت مند نوجوانوں کی شادی میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ کی جائے بلکہ بیٹوں اور بیٹیوں کے لئے اچھی خاصی مالی امداد مہیا کی جائے تاکہ ان کی اقتصادی ناپختگی دور ہو اور ان میں زندگی کی مشکلات کا مقابلہ کرنے کی طاقت بڑھے۔ یہ امداد قرض حسنہ کی حیثیت رکھے گی جو بچے اگلی نسل کو ادا کر دیں گے۔ اس میں کسی کا نقصان نہیں۔ ہر شخص فائدہ میں رہے گا۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جبکہ والدین اس قسم کی فراخ دلی سے کام لیا کرتے تھے۔

اس امداد سے ایک محتاط لڑکا بھی محبت کی پکار سن لے گا اور کوئی لڑکا بھی، جو شادی کرنے پر آمادہ ہو، اس قدیم ضرب المثل میں کچھ حقیقت محسوس کرے گا کہ "خدا تمہارا حافظ و ناصر ہو گا" غرور اس کی پشت پناہی کرے گا، اس کے بازوؤں کو طاقت بخشے گا اور اسے ہمت اور استقلال عطا کرے گا۔ ذمہ داری کی مجبوریاں اس کی شخصیت میں گہرائی پیدا کریں گی اور شادی اسے مرد بنا دے گی۔ اگر اور کوئی راہ قابل قبول نہ ہو تو شادی سے پہلے لڑکی کو کوئی کام کرنا چاہئے۔ یہ چیز گھر میں ایک نازک سامان ترصیع بننے سے کہیں بہتر ہے۔ شادی کو غیر فطری طور پر معرض التوا میں ڈالنے کی بجائے یہ بہتر ہو گا کہ جوان لڑکے اور لڑکیاں شادی کر کے تولید کو ملتوی کر دیں۔ شادی سے جنس کے نفاق کو کم کرنے کے لئے ہمیں شادی کو تولید سے علیحدہ کرنا پڑے گا۔ اگر کوئی مرد اس ذمہ داری کے باوجود تساہل اختیار کرے تو اس کا علاج یہی ہے کہ وہ بچے کا باپ بن جائے۔ بچہ اس میں غیرت مردانگی پیدا کرے گا بشرطیکہ اس میں مردانگی کی صلاحیت ہو۔

دوسری مشکل یہ ہے کہ جوان اکثر دنیا کے حالات سے بے خبر ہوتے ہیں۔ نیطشے نے

کہا تھا "جب کوئی مرد محبت میں مبتلا ہو تو اسے اپنی زندگی کے متعلق کوئی فیصلہ کرنے اور ایک جنون کی وجہ سے اپنے سماج کا کردار متعین کرنے کی اجازت نہیں ہونی چاہئے۔ ہمیں علی الاعلان عاشق و معشوق کے عہد و پیمان کو غلط قرار دے دینا چاہئے۔ اور انہیں شادی کی اجازت نہیں دینی چاہئے۔" یہ صحیح ہے کہ جوانی اندھی ہوتی ہے اور اس لئے کسی معقول فیصلہ پر نہیں پہنچ پاتی، لیکن محبت بڑھاپے میں نہیں ہو سکتی۔ غالباً ہمیں کسی وقت بھی اٹل فیصلے کرنے کی اجازت نہیں ہونی چاہئے۔ یہ امر طے شدہ نہیں ہے کہ مرد بیس سال کی بہ نسبت تیس سال کی عمر میں بیوی کا بہتر انتخاب کرتے ہیں اور چونکہ تمام بیویاں اور تمام شوہر بنیادی طور پر ایک جیسے ہوتے ہیں اس لئے اس بات سے کچھ زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ اگر کوئی مرد اپنی بیوی کے ساتھ ہم آہنگی کی کوئی صورت نہیں نکال سکتا تو اکثر اوقات اس کی وجہ اس کے اپنے کردار یا رویہ میں کوئی خامی ہوتی ہے۔ اگر وہ کسی اور عورت سے شادی کرے گا تو انجام وہی ہو گا۔ طلاق تو ایک سفر ہے اگر ہم اپنے آپ کو نہیں بدل سکتے تو یہ بالکل بے کار ہے۔

بہرحال نوجوان بے خبر ہوتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان معاملات میں کون بے خبر نہیں ہوتا۔ ہم میں سے کون مرد عورتوں کو سمجھتا ہے اور ان کے ساتھ صحیح برتاؤ کر سکتا ہے؟ جہالت کو کم کرنے کے لئے شادی سے چھ مہینے پہلے منگنی کی قدیم رسم کو بحال کر دینا چاہئے۔ اس عرصے میں لڑکا اور لڑکی ذہنی طور پر ایک دوسرے کو سمجھنے لگیں گے۔ شاید وہ شوہر اور بیوی کی طرح لڑنے بھی لگیں۔ اس طرح شادی سے پہلے ہی علیحدگی کا موقع مل جائے گا۔ یہ چھ ماہ کی مدت ہمارے شادی کے ادارہ کو وہ اخلاقی تقویت اور حسن عطا کرے گی جس کی اسے سخت ضرورت ہے۔

آخری اور سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ تجربے کی پختگی سے پہلے ہی نوجوانوں کو یہ ترغیب دینا کہ وہ ایک ایسے رشتہ میں منسلک ہو جائیں جو ممکن ہے ان کے پاؤں کی زنجیر بن جائے، بالکل ہی غلط ہے۔ اگر چھوٹی عمر کی شادی کو کامیاب بنانا ہے تو شادی سے فرار کی بھی کوئی راہ نکالنی چاہئے اور طلاق فریقین کی رضامندی پر مل جانی چاہئے۔ لیکن یہ استدلال کر کے کہ طلاق ایک المناک حقیقت ہے اور شادی زن و مرد کی خوشی کے لئے نہیں کی جاتی بلکہ اس کا مقصد بچوں کی پرورش اور تربیت ہوتا ہے، یہ بات مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے کہ طلاق کی توسیع کی تلقین کی جائے۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ فریقین کی رضامندی کی شرط لگانے سے طلاقوں کی تعداد بڑھ جائے یا بچوں کی تربیت کے لئے وہ والدین بہتر ہیں جو

ایک دوسرے کے لئے محبت اور اعتماد کے جذبات سے محروم ہوتے ہوئے بھی مجبوراً اکٹھے رہیں یا وہ جو علیحدہ ہو جائیں؟ اگر ہم مرد اور عورت کے متفقہ مطالبہ طلاق کو ٹھکرا دیں تو وہ علیحدگی کی کوئی اور سبیل ڈھونڈ نکالیں گے۔ یقیناً طلاق کو کچھ دیر ملتوی کرنا چاہئے۔ طلاق ہونے سے پہلے مرد اور عورت کو آزمائشی طور پر کچھ دیر علیحدہ رہنا چاہئے کہ شاید عقل و خرد بروئے کار آئے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ میاں بیوی تنہائی کو جنگ سے برا سمجھیں اور جدائی ان پر وہ خوبیاں منکشف کرے جو قربت کے پردے میں پنہاں تھیں۔

امریکی کانگرس کے ایک رکن اور اس کی بیوی نے مل کر طلاق کی درخواست کی۔ یہ درخواست اس بنا پر مسترد کر دی گئی کہ انہوں نے خاصی تعداد میں کبریائی احکام اور انسانی قوانین کی خلاف ورزی نہیں کی تھی۔ یہ حقیقت کہ انہوں نے متفقہ طور پر علیحدگی کی خواہش ظاہر کی تھی غیر متعلق سمجھی گئی اور انہیں زندگی بھر کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ باندھ دیا گیا۔ اس قسم کے حالات زنا کی ترغیب کی باعث بنتے ہیں۔ کئی سال سے جاپان میں فریقین کی رضامندگی پر طلاق ہو جاتی ہے، پھر بھی وہاں کی شرح طلاق ہمارے ملک سے کہیں کم ہے۔ روس میں ۱۹۰۷ء سے اس قسم کا قانون نافذ ہے۔ روم میں بھی یہ قانون تھا۔ بونا پارٹ نے اپنے آئینی نظام میں اسے شامل کر لیا تھا لیکن خاندان بوربون کے جاہل افراد نے اسے قلم زد کر دیا۔ بہت ممکن ہے کہ اس قسم کی ترمیم علیحدگیوں کی تعداد میں کوئی اضافہ نہ کرے۔ لیکن یہ ہمارے اخلاق اور ہماری عدالتوں کے اخلاق کو بہتر بنا دے گی۔

ہم نہیں جانتے کہ ہمارے ان تجربات کا انجام کیا ہو گا۔ غالباً یہ ہماری آرزوؤں اور خواہشوں کے مطابق نہیں ہو گا۔ ہم ایک انقلاب کی موجوں میں الجھے ہوئے ہیں اور یقیناً ایسے مقامات کی طرف بہے جا رہے ہیں، جن کا ہماری آرزوؤں سے کوئی تعلق نہیں۔ رسم و رواج اور اداروں کے اس بے پناہ تغیر سے جانے کیا حالات پیدا ہوں۔ آج جبکہ ہمارے بڑے شہروں میں گھروں کی اہمیت ختم ہو رہی ہے، ہے وہاں رفاقتی شادی عام ہوتی جائے گی، آزاد روابط بڑھتے جائیں گے اور اگرچہ یہ آزادی زیادہ تر مرد کے لئے مخصوص ہو گی، عورت اسے اپنے غیر شادی شدہ زمانے کی بے سود تنہائی سے بہتر سمجھے گی۔ مرد اور عورت کے لئے اخلاق کا معیار یکساں ہو جائے گا اور عورت مرد کی اس بات میں بھی نقل کرے گی کہ شادی سے پہلے جنسی تجربات حاصل کیا کرے۔ طلاق کی تعداد بڑھ جائے گی اور ہر شہر میں شکستہ پیمانوں کے انبار نظر آئیں گے۔ شادی کا ادارہ نئی صورتیں اختیار کرے گا۔ جب عورت مکمل طور پر صنعت زدہ ہو جائے گی تو ہر طبقہ ضبط تولید اختیار کرے گا۔ تولید عورت

کی زندگی کا محض ایک حادثہ بن جائے گا اور بچوں کی پرورش گھر لی جائے ... میں ہو گی۔

۴۔ بچے پیدا کرنا

بہرحال یک زوجگی شادی کی بہترین صورت ہے۔ شادی کا تقاضا ہے کہ میاں بیوی اور میاں اور بیوی تادمِ مرگ اکٹھے رہیں اور یہی وہ مقصد ہے جسے ملحوظ رکھتے ہوئے ایک عاشق صادق شادی کا عہد و پیمان کرتا ہے۔ طلاق میں میدانِ جنگ سے فرار کی طرف پناہ لینا نظر آتی ہے۔ وہ شخص جو نئے سے نئے محبوبوں کا آرزو مند رہتا ہے ایک غیر مستحکم اور ... شخصیت کا مالک ہے۔ مستحکم شخصیتوں کے مرد اور عورت اس خیال سے اپنی مشکلات کو حل کریں گے کہ تقریباً ہر میدانِ جنگ میں انہیں اس قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا ہے کہ جب ربط و اتفاق باہمی کی کوششوں کا کڑا دور ختم ہو گا تو انہیں ان مشکلات کا معاوضہ ملے گا۔ ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے ایک مستقل جذبہ محبت کار فرما رہے گا جس کا اظہار بچوں کی تربیت کی باہمی ذمہ داری کی شکل میں ہوتا رہے گا۔ ہزاروں انقلابات میں شرکت جسمانی آرزو کے ہنگامی جوش و خروش کی جگہ لے گی۔ اور دو دل اور دو دماغ ایک ہو جائیں گے۔ جب روح کی یہ آزمائش ختم ہو گی تو وہ محبت کے کمال کا شعور حاصل کریں گے۔

لیکن یہ کمال بچوں کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا' بچوں کے لئے ہی شادی کا ادارہ قائم ہوا تھا۔ اس کا مقصد مرد اور عورت کا وصال بھی تھا لیکن اتنا نہیں جتنا کہ والدین کو اولاد کے ساتھ وفا اور شفقت کے رشتے میں منسلک کر کے نسل کو قائم اور جاری رکھنا۔ ہم کتنے ہی آزاد کیوں نہ ہو جائیں ہم ماضی کے تعصبات سے کتنے ہی کیوں نہ ابھر جائیں۔ وہ عورت جو عمداً بانجھ رہتی ہے ہم میں ایک ناخوشگوار اور مریضانہ تاثر پیدا کرتی ہے۔ داخلی مسرت کی طرح معروضی حسن فطری مقاصد اور وظائف کی تسکین سے پیدا ہوتا ہے اس لئے وہ عورتیں جو کبھی بچے پیدا نہیں کرتیں کس قدر مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہیں۔ وہ ہمیں کبھی یقین نہیں دلا سکتیں کہ انہیں سکون اور اطمینان حاصل ہے۔ اگر کسی عورت نے بچوں کی بجائے اپنی قوت صرف کرنے کی کوئی اور سبیل نکال لی ہے تو فطرت اسے برداشت کرے گی۔ لیکن اگر وہ غیر مطمئن ہو کر ایک جگہ سے دوسری جگہ' ایک مرد سے دوسرے مرد یا ایک تفریح سے دوسری تفریح کی تلاش کرے گی اور کہیں بھی اپنی دلچسپیوں کا مرکز نہ

پائے گی تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اس نے محبت کے فطری مقصد کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ نیلٹشے نے کہا تھا "عورت ایک معمہ ہے اور اس کا حل ہے بچہ۔"

جدید عورت ان فرسودہ خیالات کا مذاق اڑائے گی اور کہے گی کہ وہ زمانہ گیا جب اسے تولید کی مشین کی طرح استعمال کیا جاتا تھا۔ کوئی شخص بھی' جسے تاریخ کا شعور ہے' عورت سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ اپنی دیہاتی ماؤں کی طرح ایک بڑے کنبہ کی بنیاد رکھے۔ ہر شخص یہ جانتا ہے (سوائے ان دیہاتی لوگوں کے جو ابھی تک ہمارے آئین ساز اداروں پر حاوی ہیں) کہ مشینوں کی افراط اور شرح اموات کی کمی نے کثیر تعداد میں بچے پیدا کرنے کی ضرورت کو ختم کر دیا ہے۔ اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ سماج کی فلاح و بہبود ایک کثیر آبادہ میں مضمر ہے تو یہ اس لئے کہ ہم مقدار کو غیر ضروری اہمیت دے کر اپنے آپ کو فریب میں مبتلا رکھتے ہیں یا ہم استعماری توسیع کے آرزو مند ہیں۔ لیکن جس وقت چینی مشینوں کے معاملہ میں ہماری برابری کرنے لگیں گے وہ بھی آبادی پر پابندیاں لگانے کے وہی ذرائع اختیار کریں گے جو ہم کرتے رہے ہیں۔ بڑے کنبوں کی نہ آج قوم کو ضرورت ہے نہ اخلاق کو۔ اور جب ہم یہ کہتے ہیں کہ عورت کو ایک خاص حد تک ماںتا کا وظیفہ ادا کرنا چاہئے تو وہ محض اس لئے کہ اس نے سماج کی نہیں بلکہ اس کی اپنی تکمیل اور مسرت کے امکانات پیدا ہوتے ہیں۔

جب بچے نہ ہوں تو شادی کا پھول مرجھا جاتا ہے اور بچے ہونے سے یہ پھول پھر شاداب ہو جاتا ہے۔ اس سے پہلے شادی کی حیثیت ایک کاروباری معاہدہ کی تھی' جس کا مقصد جسمانی ضرورتوں کی تسکین تھا۔ اب وہ اپنا فطری مقصد پورا کرتی ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی شخصیتوں کو ایک وسیع کل میں مربوط کرتی ہے اور یہ اتحاد ایک شاداب پودے کی طرح پھلتا پھولتا ہے۔ عورت' مصائب اور آلام کے درمیان ایک عجیب اطمینان حاصل کرتی ہے' جس میں ایک خاموش سرور مضمر ہوتا ہے۔ وہ اپنی بے کاری اور تعیش میں اتنی خوش نہیں تھی جتنی ان فرائض اور پابندیوں میں' جو اس کی نشوونما اور تکمیل کرتی ہیں حالانکہ بظاہر اسے نسل کی خاطر قربان کر رہی ہوتی ہیں۔ اور مرد اسے دیکھ کر اس سے دوبارہ محبت کرنے لگتا ہے۔ یہ ایک نئی عورت ہے' نئی صلاحیتوں سے معمور۔ اس صبر اور نرم دلی سے لبریز جو محبت کی شدت اور تندہی میں پہلے کبھی محسوس نہیں ہوئے تھے۔ اور اگرچہ اس کا چہرہ اب زرد ہے' اور اس کی ہیئت بدمعاشوں کی آنکھوں کے لئے کوئی کشش نہیں رکھتی' شوہر کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ موت کے منہ سے اس کے لئے یک نہایت قیمتی تحفہ لائی

ہے۔ ایک ایسا تحفہ جس کا بدل وہ کبھی پیش نہیں کر سکتا۔ ناخوشگوار کام اب خوشگوار ہو جاتا ہے۔ اور وہ گھر جو پہلے فقط ایک چار دیواری اور بستر تھا' اب نئی زندگی کی مسرتوں سے معمور نظر آتا ہے اور اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ مرد اپنے آپ کو مکمل محسوس کرتا ہے۔ ولدیت سے مرد محض سماج اور نسل کے رکن کی حیثیت سے اپنا فرض ادا نہیں کرتا' بلکہ وہ اپنی تکمیل کرتا ہے۔ وہ ان ذمہ داریوں کو قبول کرتا ہے' جو اسے بلوغت بخشتی ہیں۔ وہ جبلت والدی کی تسکین حاصل کرتا ہے اور بچوں کی رفاقت کو بڑھاپے کی خوشی کی ضمانت سمجھتا ہے اور کسی حد تک موت کے میاد سے بچ جاتا ہے۔ موت ہمارا گوشت اور خون لے جاتی ہے اور جوانوں کے لئے جگہ بناتی ہے۔ لیکن یہ جوان ہمارا لہو' ہماری زندگی اور ہماری روح ہیں۔ ہم موت کو اپنی زندگی کا فقط ایک حصہ دیتے ہیں۔ باقی حصہ ہم سے پرورش حاصل کر کے زندگی کے سیلاب میں نیا جنم لیتا ہے۔ ہمارے بچے ہمیں دکھ دیتے ہیں لیکن وہ بے پناہ سرور بھی بہم پہنچاتے ہیں۔ جو محبت کے نشہ سے بھی زیادہ تند و تیز ہوتا ہے۔ مرد کو تکمیل حاصل کرنی چاہئے' ایک علیحدہ شخصیت کی طرح نہیں۔ جو تقابل کے چنگل میں گرفتار ہے' بلکہ ایک وسیع تر شخصیت کے جزو کی حیثیت سے' ایک عاشق کی حیثیت سے جو لینے سے زیادہ دیتا ہے۔ ایک باپ کی حیثیت سے' جو نسل کی بقا کے لئے' خوشی سے زندگی کے تسلسل اور بقا میں شریک ہوتا ہے۔ کیونکہ جزو کے کل سے تعاون میں اخلاق کی جان' زندگی کا راز اور مسرت کا سرچشمہ پنہاں ہے۔

باب یازدہم

بچوں کے متعلق ایک اعتراف

ا۔ ذاتی

خاندان کے متعلق اس قصیدۂ مدحیہ کے بعد ہم اس قدیم اور دشوار فرض پر غور کریں گے جسے بچوں کی تربیت کہتے ہیں۔ میں اس باب میں اپنے ذاتی تجربات بیان کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کیونکہ جن اسالیب اور نتائج کا میں ذکر کروں گا وہ ایک نہایت محدود تجربہ کا نچوڑ ہیں۔ اور میں انہیں جوں کا توں بیان کر دوں گا۔ وہ تجربہ کیا ہے؟ ایک بچے کا اپنے والدین سے تعلق۔ میں شروع ہی میں اس بات کا اعتراف کر دوں کہ میں تین اشخاص میں نہایت شدید دلچسپی رکھتا ہوں' اتنی زیادہ کہ کوئی فلسفہ کل اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔ قدرت ہم میں انانیت پیدا کرتی ہے' تاکہ ہم زندہ رہنے پر رضامند ہو جائیں۔ ہم میں سے کون شخص اپنے آپ کو بقا اور دوام کے نقطہ نظر سے دیکھ سکتا ہے۔

مجھے ایک بچے سے بہت محبت ہے۔ میرے لئے یہ تصور کرنا مشکل ہے کہ کوئی اور بچہ صحت' ذہانت' گلابی رخسار اور گھنے بالوں میں اس سے سبقت لے گیا ہو۔ جب میں اپنی بیٹی کو مدرسہ تک پہنچانے جاتا ہوں اور مدرسہ کے نزدیک اسے رخصتی سلام کہتا ہوں' اور یہ دیکھتا ہوں کہ کس کبریائی جذبہ حیات کے ساتھ وہ رقص کرتی ہوئی اپنی جماعت کی طرف جاتی ہے تو مجھے اس دنیا کے رنج و الم غیر اہم معلوم ہونے لگتے ہیں۔ یہ اچھلتی کودتی لڑکی تمام معموں کا حل ہے اور تمام دکھوں کا علاج۔ جب میں گھر کی طرف لوٹتا ہوں تو ایک آبائی سرور میری رگ رگ میں دوڑنے لگتا ہے۔ اور دکھ اور موت غرضیکہ ہر چیز قابل عفو معلوم ہوتی ہے' کیونکہ فطرت کے غیر جانبدار ظلم و ترحم نے ایک نہایت غیر معقول الم میں سے ایک حسین بچہ پیدا کیا ہے۔

تو یہ امر واضح ہے کہ اس معاملہ میں تعصب سے کام لے رہا ہوں' اور یہ بہت ممکن ہے کہ میں خاندان کے مسئلے پر غیر جانبداری سے کوئی بات نہ کہہ سکوں گا۔ یہ کوئی اصولی بحث نہیں ہے۔ فقط ایک اعتراف ہے۔ تربیت کی کوئی درسی کتاب نہیں بلکہ اپنے طرز عمل

میں ان مسائل کے بارے میں اتنا ہی ...
کا بیان ہے جو ممکن ہے قابل نفرت ہو۔ تاہم میں اپنے دل میں یہ ...
رکھتا ہوں جتنا کہ مابعد الطبیعات کے مسائل کے متعلق۔ اور درخشاں نسلوں سے ...
ہوں کہ میرے یہ خیالات نہایت فلسفیانہ اور گہرے ہیں۔ میرے ان اعتراضات میں سے اپنے
کلید ہیں۔ اور میں یہ امید کرتا ہوں کہ دوسرے لوگ
گھروں اور اپنی اولاد کے لئے روشنی حاصل کریں گے۔

۲۔ جسمانی

میرا خیال ہے کہ شروع سے ایتھل کو ہم روح اور بدن کا مرکب سمجھتے رہے ہیں۔ بدن پہلے پیدا ہوا اور روح اس وقت جب وہ پہلی دفعہ مسکرائی' اس وقت سے ہمیں یہ احساس ہونے لگا کہ یہ سرخ و سفید جسم' یہ بھرے بھرے بازو اور ٹانگیں' یہ نیلی آنکھیں' گلابی ہونٹ اور سنہری بال اگرچہ بذات خود بہت دلفریب ہیں لیکن دراصل ایک غیرمرئی زندگی کا طرز اظہار ہیں۔ وہ زندگی جو بہت جلد نفرت اور محبت کے جذبات سے معمور ہو گی' آرزو کرے گی' خواب دیکھے گی' حیرت زدہ ہو گی' پھلے پھولے گی' ایک نئی شخصیت بنے گی اور ایک ایسا مرکز جس کے گرد تمام دنیا گھومے گی۔ اس زندگی کا انحصار اس بدن پر ہو گا۔ ہم نے یہ سوچا اگر یہ بدن زیادہ طاقتور اور مضبوط بن جائے تو اس میں زندگی کا شعلہ زیادہ درخشاں ہو گا۔ ہم نے یہ عہد کیا کہ جب تک ایتھل دس برس کی نہ ہو جائے ہم اس کے بدن کی حفاظت اپنا اولین مقصد سمجھیں گے۔ ہمیں فطرت پر یہ اعتماد تھا کہ وہ جسم کامل میں سے رحم دلی اور ذہانت پیدا کرے گی۔ ہمیں یہ خیال تھا کہ کسی جسمانی مرض ہی کی وجہ سے بدکردار اور کند ذہن پیدا ہوتا ہے اور ایتھل کا تجزیہ نفسی کرنے یا اسے اخلاق کی تعلیم دینے کی بجائے ہم نے اسے تازہ ہوا۔ اور صحت مند غذا بہم پہنچائی۔

پہلے تین مہینوں میں ہم نے ایک خطرناک غلطی کی۔ ہم نے ایک نئی قسم کے دودھ کی آزمائش کے لئے اپنی بچی کو ایک تجربہ گاہ بنایا۔ یہ ایک ایسا جرم ہے جس کی یاد کئی سال کی آبائی شفقت بھی ہمارے دلوں سے محو نہیں کر سکی۔ اب ہم یہ جانتے ہیں کہ انسانی نسل کو نئے حکیموں اور پرانے حجاموں سے خبردار رہنا چاہئے۔ خوش قسمتی سے ہماری غلطی کوئی رنگ نہ لائی۔ غلط غذا کے باوجود ایتھل صحت میں روز افزوں ترقی کرنے لگی۔ جب ہمیں اپنی غلطی کا احساس ہوا تو ہم نے اس خوش نصیبی کو اس ہوا سے منسوب کیا جو ایتھل کو پہلے تین مہینوں میں میسر آئی تھی۔ ایک خاموش گاؤں کو ہوا جہاں فقط سانس لینا ہی زندگی

کو ہم آہنگ بنانے کے مترادف تھا۔ اس وقت سے [illegible] سوالات
عظیم معجزہ قادر مطلق کے اس معجزے یعنی [illegible] سے بھی [illegible] یوں نہ
ہو' ہر رات کھلے دریچے ہواؤں کو پکارتے ہیں۔ وہ آئے اور ا-تھل کے رخساروں کو پھولوں
اور شعلوں میں تبدیل کر دیں۔

کئی مرتبہ ملائم الفاظ سے اور گردن میں گداز باہیں ڈال کے ا-تھل ہم سے یہ اجازت مانگتی ہے کہ ہم اسے مقررہ وقت کے بعد تک جاگنے کی اجازت دے دیں لیکن اس معاملہ میں ہم ٹس سے مس نہیں ہوتے ہم اس تجویز پر بحث ہی نہیں کرتے اور اسے ایک مجرمانہ خیال سمجھ کر مسترد کر دیتے ہیں اور ا-تھل کو مقررہ وقت پر سلا دیتے ہیں۔ اب اگرچہ وہ دس برس کی ایک معزز خاتون ہے' وہ ہر روز سوا آٹھ بجے سونے کے لئے چلی جاتی ہے اور زینے سے ہمیں خدا حافظ اور شب بخیر کہتی ہے۔ ساڑھے آٹھ بجے تک وہ بستر میں لیٹ جاتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی یہ قانون توڑا بھی گیا ہے۔ مثلاً جب کوئی ماہر موسیقی ہمارے گھر میں پیانو بجانے آیا ہو۔ لیکن اکثر اوقات ہم اس قانون کی ایک مقدس فریضے کی طرح پابندی کرتے رہے ہیں۔ یہ ہمارے فلسفہ زندگی میں ایک نہایت اہم تفصیل کی حیثیت رکھتا ہے۔

ہوا کے بعد غذا۔ ہم نے یہ دیکھا کہ ا-تھل کو ترکاریاں' دودھ اور گندم کی ڈبل روٹی راس آئی۔ وہ مضبوط لمبی توانا اور تنومند ہوتی گئی اور ہمیں یہ محسوس ہوا کہ وہ اپنی مکمل نشوونما کے لئے ہر وہ چیز حاصل کر رہی ہے جس کی اسے ضرورت ہے۔ لیکن نبات خوروں کو یہ سن کر صدمہ ہو گا کہ ہم نے بہت جلدی ہی ا-تھل کی فہرست طعام میں ہفتہ میں دو ایک مرتبہ مرغ بھی شامل کر دیا۔ ہم اسے پیار سے "مرغ نبات خور" کہتے ہیں۔ اس عجیب غیر اصولی غذا پر یہ چھوٹا سا گھرانا جسمانی طور پر پھلتا پھولتا رہا۔ ا-تھل کی صحت ہمیشہ اچھی نہیں رہی۔ بچپن میں خسرہ نکل آئی۔ لیکن ایک ہفتے کے اندر ا-تھل نے اسے ہنستے کھیلتے ختم کر دیا۔ چار برس کی عمر میں اسے ایک سہیلی سے کالی کھانسی لگ گئی لیکن بہت جلد ہی وہ دور ہو گئی' آٹھ برس کی عمر میں اس کا گلا سوج گیا۔ لیکن اپریشن سے بالکل ٹھیک ہو گیا۔ اس کی لوح صحت پر یہ چند داغ ہیں' ورنہ ا-تھل کو میں اور بیماریوں سے زیادہ واسطہ نہیں رہا۔ وہ اکثر یہ سوال پوچھتی ہے کہ پیٹ میں درد کس طرح ہوتا ہے؟

غذا کے بعد کھیل' جو حواس اور اعضا کو ہم آہنگی' اختصار حرکت اور وحدت سکھاتا ہے۔ ہوش مند والدین یہ جانتے ہیں کہ کون کون سے کھلونے مختلف اعضا اور صلاحیتوں کی

تربیت کے لئے موزوں ہیں۔ اس سلسلہ میں پہلا اصول یہ ہے کہ وہ صحت مند ہوں
مشاہدے' سبک دستی اور کھلی ہوا میں آزاد حرکت کی قوتوں کو بروئے کار لائیں' بال' ...
سکوٹرز' تیر کمان چکر' کودنے کے لئے رسی' بیں بال اور ٹینس کا سامان۔ اور اگر آپ دیہات
سے بھری ہوئی گلیوں سے دور دیہات میں رہتے ہوں تو باغیچے۔ یہ کھلونے اس فطرت کی
مدد کرتے ہیں جو ہمیں کھیلنے پر آمادہ کرتی ہے تاکہ ہماری ہر صلاحیت درجہ کمال تک پہنچے۔
ان میں سے بہترین کھیل ہیں' تیرنا اور سکیٹ کرنا۔ گرمی اور سردی کے موسم انہیں کھیلوں
کے لئے ایجاد ہوئے تھے۔ ہر عضو بند ہم آہنگی سے حرکت کرتا ہے۔ سانس گہری اور تیز
ہوتی ہے۔ خون میں تموج پیدا ہوتا ہے اور دل خوشی سے اچھلتا کودتا ہے۔ میں افسوس کے
ساتھ یہ اعتراف کرتا ہوں کہ میں سکیٹ نہیں کر سکتا۔ لیکن میں یہ عہد کرتا ہوں کہ
آئندہ سردی کے موسم میں جب ا-تھل سکیٹ کرنا سیکھے گی تو میں بھی گر پڑ کے سیکھنے کی
کوشش کروں گا۔ میں تصور میں لڑکے لڑکیوں کو باہوں میں باہیں یا کمر میں ہاتھ ڈال کے
ہنستی ہوئی آنکھوں اور دمکتے ہوئے رخساروں کے ساتھ سرما کے آسمان کے نیچے حرکت کال
کے گیت گاتے ہوئے برف پر تیرتے دیکھ رہا ہوں' اور ہم دونوں یہ کھیل کھیلنے جائیں گے۔
ایک بوڑھا مصنف بھی یہ کھیل کھیل سکتا ہے۔ جب برف کے گالے فضا میں پرواز کریں
گے تو ہم تینوں کس قدر لطف اندوز ہوں گے۔

۳۔ اخلاقی

جسم کو اولین اہمیت حاصل ہے اور اس کی نشوونما کا حسن سرچشمہ مسرت ہے لیکن جب اس کی بنیادیں مضبوط ہو جائیں' ہاضمہ صحت مند باقاعدگی کے ساتھ کام کرنے لگے اس طرح کہ اس کے متعلق سوچنے کی ضرورت ہی نہ پڑے تو کردار کی تربیت کے مسائل قابل غور بنتے ہیں۔ اگر بچہ کھانے کے معاملہ میں حریص' کھلونوں کے معاملہ میں کنجوس' کھیل میں لڑاکا' مغرور' باتونی' جھوٹا' تلون مزاج' خلوت پسند یا صفائی سے بھاگنے والا ہو تو ہمیں کیا کرنا چاہئے؟

پہلی بات یہ کہ بچے پر کوئی پابندی نہ لگائیں۔ اگر کوئی بچہ بری حرکت کرے تو اس سے معافی مانگ لیں کیونکہ آپ نے اسے غلط غذا دی ہے یا اس سے برا سلوک کیا ہے۔ پابندیاں لازمی ہیں۔ لیکن ان کی تعداد بہت کم ہونی چاہئے۔ غالباً یہ بہتر ہو کہ والدین ہر پہلی جنوری کو پچھلی پابندیاں منسوخ کر کے نئی پابندیوں کی فہرست تیار کریں۔ بہت سے والدین

جو دولت یا محبت حاصل کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ بچے پر پابندیاں عائد کر کے زندگی سے انتقام لیتے ہیں۔ بچے کے ساتھ تحکمانہ انداز اختیار کرنا کمزوری کی علامت ہے۔ کمزور آدمی تحکم کو پسند کرتے ہیں اور بات بات پر اعتراض کرنے کا حق شادی کے دکھوں میں ڈھارس بندھاتا ہے۔ بچے کو خوش رہنے دیجئے اور اپنے آپ کو یہ فریب نہ دیجئے کہ آپ مستقبل کے لئے حال کی بہت بڑی قربانی کر رہے ہیں۔ ہم یہ عہد کر چکے ہیں کہ جب تک ا۔تھل کی شادی نہ ہو جائے ہم اسے خوش رکھیں گے۔ اس کے بعد کا خدا حافظ۔

بچے کے ساتھ حاکمانہ سلوک' اس میں بغاوت اور شورش کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ یہ اصول نیوٹن کے قوانین حرکت کی طرح یقینی ہے اور غالباً آئن شائن کے بعد بھی درست رہے۔ جب ہم حکم دیتے ہیں تو اس کی خودداری کی تمام پوشیدہ صلاحیتوں کو ابھارتے ہیں۔ ہر فرمان پر ہم افواج مدافعت کو حرکت کی دعوت دیتے ہیں۔ طلب کرو اور تمہیں مل جائے گا۔ حکم دو تو تمہیں مایوس ہونا پڑے گا۔ بچے کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ اس کی محبت اور اعتماد حاصل کرو' اور تمہاری درخواستیں اور نصیحتیں تمہارے احکام سے زیادہ موثر ثابت ہوں گی۔ ا۔تھل کے والدین اشارے کنائے کے ذریعے اس سے بہت کام کروا لیتے ہیں۔ ہم ا۔تھل کو مدرسہ تک پہنچانے جاتے ہیں اور اس کے خوشگوار زمانہ طالب علمی پر رشک کا اظہار کرتے ہیں۔ ہم یہ سوچتے ہیں کہ جب وہ یہ دیکھتی ہے کہ ہم اس کے اس زمانہ طالب علمی کی قدر کرتے ہیں تو کیا وہ اپنے بچپن کی مسرتوں کو زیادہ شدت سے محسوس نہیں کرتی ہو گی؟ دوپہر کے کھانے کے وقت ہم اس سے اس کی تعلیم کے متعلق سوال پوچھتے ہیں تو وہ خوش ہوتی ہے' کہ ہم اس کی تعلیم میں اتنی دلچسپی لے رہے ہیں۔ اور تاریخ' جغرافیہ' یہ یہاں تک کہ حساب میں ہماری دلچسپی کی وجہ سے وہ بھی ان مضامین میں دلچسپی لینے لگی ہے۔ وہ یہ محسوس کرتی ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ ان مضامین کا مطالعہ بے کیف ہو۔ یہ مضامین ایک جنگ' ایک سفر' ایک محبت نامہ یا ایک انکم ٹیکس رپورٹ کی طرح دلچسپ بن سکتے ہیں۔

یہی حال پیانو کا ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو امریکہ میں ہر گھر کا مسئلہ ہے۔ "جاؤ اور مشق کرو۔" یہ ایک بے ہودہ فقرہ ہے۔ کیونکہ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے' کہ "پیانو بجانا ایک بے کیف مشغلہ ہے۔ اس کی مشق کرب ناک ہے۔ جاؤ اور اسے برداشت کرو' تم اس کی مستحق ہو۔" ہم نے ا۔تھل کے سامنے ایک اور ترکیب کی۔ ہم نے محض اس سے یہ کہا کہ اگر تم پیانو سیکھنا چاہو تو سیکھو۔ ہم نے اس کا فیصلہ اس پر چھوڑ دیا۔ لیکن یہ تجویز

کرنے سے کئی ہفتے پہلے ہم نے اس سے موسیقی کی شوکت اور اسے تخلیق کرنے کی عظمت کا ذکر شروع کر دیا۔ اس کے بعد ہم نے ایک ایسے استاد کو ڈھونڈنا شروع کیا جو بے جان میزان سکھانے کے بجائے اسے ایسی دلفریب سریں سکھائے جن سے سارا گھر لہلہانے لگے۔ ہمیں ایک ایسا استاد مل گیا' اور جلد ہی ہمارا گھر ان نغموں سے معمور ہو گیا جو ننھے ننھے مگر تندرست ہاتھوں کا کرشمہ تھے۔ ہم بڑے بھی ا۔تھل کے ہم نوا ہو کر وہی گیت گانے لگے۔ وہ ہماری مسرت کو دیکھ بہت خوش ہوئی اور اپنے آپ کو ایک فن کار سمجھنے لگی۔ ابتدا ہی سے پیانو اس کے لئے موسیقی کی علامت بن گیا۔ شور و غوغا اور درد کی نہیں۔

کچھ عرصے بعد اس کی ترقی ایک جگہ آ کے تھم گئی۔ وہ زیادہ مشق کرنے سے گریز کرنے لگی۔ اور ہمیں جذبات اور رسوم کے عفریتوں سے جنگ کرنا پڑی' جو ہمیں جبر کرنے پر اکسانے لگے تھے۔ میں خود پیانو کے سامنے بیٹھ جاتا اور سبق کی مشق کرتا۔ پھر میں ا۔تھل کو یہ دعوت دیتا کہ وہ میرے ساتھ مل کر پیانو بجائے۔ اور جب وہ میرے ساتھ شامل ہونا پسند نہ کرتی تو میں خود ہی بجاتا رہتا۔ اس کے استاد نے ہمیں ایسے دو گانے سکھائے تھے' جو ہم دونوں مل کر گاتے رہتے۔ (اس وقت ا۔تھل نے مجھے آواز دی ہے "ابا! آؤ' میرے ساتھ مشق کرو۔") اس کا ذوق جلدی ہی عود کر آیا۔ اور وہ کچھ عرصے میں بیتھوون موزارٹ' شومان' شوبرٹ' ہینڈل۔ ہائیڈن اور باخ کے فن پارے بجانے لگی۔ ہم ذوق شوق سے یہ گیت گانے لگے۔ ہم نے ا۔تھل پر اپنی ممنونیت کا اظہار کر دیا کہ اس نے ہمارے دلوں کو نغموں کے نور سے منور کر دیا ہے۔ اسے یہ احساس ہونے لگا کہ موسیقی ایک نعمت ہے جسے حاصل کرنے کے لئے تکلیفیں اٹھانا بے سود نہیں ہے۔ "پیانو کو خیرباد" بجا کر اس نے کہا "اب میں سمجھی کہ آپ بیتھوون پر اس قدر فریفتہ کیوں ہیں!"

اپنی بات سمجھانے کے لئے اب میں تیرنے کا ذکر کروں گا۔ اگرچہ موسیقہ کے بعد تیرنے کا ذکر مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ کیا کبھی آپ نے والدین کو بچے کو تیرنا سکھاتے دیکھا ہے؟ وہ پہلے اسے تیرنے پر پھسلاتے ہیں۔ پھر تادیب کرتے ہیں اور پھر جبرا اسے پانی میں دھکیل دیتے ہیں۔ کچھ وقت تک یہ طریق کار کامیاب رہتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ بچے کے دل میں پانی کی وہ دہشت پیدا کر دیتا ہے' کہ بعض اوقات وہ کبھی تیرنا سیکھ نہیں پاتا۔ اس ضمن میں تھوڑی سی مثال ہزاروں جبر سے بہتر ثابت ہوتی ہے۔ ا۔تھل ہر بچہ کی طرح پانی سے ڈرتی تھی۔ اس کا خوف قدرتی تھا' جو کہ گذشتہ نسلوں کے خطرناک تجربوں پر مبنی تھا۔ ہم نے اسے تیراکی کا لباس پہنا دیا' اور اسے ریت پر کھیلنے دیا۔ لیکن ہم خود اس کے

سامنے تیرتے رہے۔ کچھ دنوں بعد اسے ہمارے ہنر پر رشک آنے لگا۔ اور وہ پانی سے کھیلنے لگی۔ ہم نے اسے ایک "بچاؤ پٹی" خرید دی۔ اور اس کے گرد باندھ دی' اور اسے یہ بتایا کہ اس کی مدد سے وہ گہرے پانی میں اپنے بال تر کئے بغیر تیر سکتی ہے۔ اس نے دوسرے لوگوں لڑکیوں کو دیکھا۔ اور ان کی نقل کرتے کرتے ہر سمت تیرنے لگی' ہم نے پٹی' اتار دی اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ وہ تیر سکتی ہے۔ اگلے برس اس نے ایک دوست کی مدد سے تیرنے کے اور طریقے سیکھے۔ اب وہ اپنے باپ کو تیرنا سکھاتی ہے اور اسے اپنے فن کی قوت اور تنوع دکھا کر شرمسار کرتی ہے۔ مثال اگر اچھی ہو تو اتنی مؤثر ثابت ہوتی ہے کہ اور کسی چیز کی ضرورت نہیں رہتی۔ بہترین گھر اور بہترین مدرسہ وہ ہے' جہاں جبر اور تحکم بہت کم ہو۔ یہ عجیب بات ہے کہ سزا اور حکم کے بغیر بچہ کا اخلاق کتنا سدھر جاتا ہے۔ اگر آزاد تعلیم ناکام رہتی ہے تو وہ محض اس لئے کہ ہم والدین ان اصولوں کی خود خلاف ورزی کرتے ہیں جن کی ہم اپنے بچوں کو تعلیم دیتے ہیں۔ ہم توازن کی تعلیم دیتے ہیں اور خود خوب کھاتے پیتے ہیں۔ ہم دوست داری کی تعلیم دیتے ہیں اور خود بازاروں میں لڑتے بھڑتے ہیں۔ ہم مٹھائیوں اور جذباتی فلموں کے خلاف جہاد کرتے ہیں اور خود چوری چھپے ان سے لذت اندوز ہوتے ہیں اور ایک دن بچہ ہماری چوری پکڑ لیتا ہے۔ ہم سختی سے نرم مزاجی کا مطالبہ کرتے ہیں اور درشتی سے علم کا فرمان جاری کرتے ہیں۔ ہم انکساری کی نصیحت کرتے ہیں اور خود کامل دیوتاؤں کا روپ دھار لیتے ہیں لیکن بچے ہماری نصیحتوں سے نہیں' ہماری مثال سے متاثر ہوتے ہیں۔ جو بچے ماں باپ کو بہت زیادہ تکلیف دیتے ہیں' ممکن ہے کہ وہ ہمارے ماضی کو دوہرا رہے ہوں۔ مجھے اپنے بچوں سے ملایئے تو میں آپ کو بتادوں گا کہ آپ خود کیا ہیں۔

اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ کا بچہ حلیم الطبع ہو تو خود حلیم الطبع بنئے۔ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ کا بچہ صفائی پسند ہو تو خود صفائی پسند بنئے۔ اس کے علاوہ اور کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ بچے کے ساتھ سخت کلامی کرنا۔ اس کے دل میں درشت گوئی کا نقش بٹھانا ہے' جس کی وہ بعد میں نقل کر سکتا ہے۔ اچھی صفات صرف مستقل اچھی مثال ہی سے پیدا ہو سکتی ہیں۔ یہ کام مشکل ہے۔ اور اس کے لئے ہماری شخصیتوں کو از سر نو تعلیم و تربیت کی ضرورت ہے۔ اس طرح بچے ہماری تربیت کرتے ہیں۔ کئی مرتبہ راقم الحروف ان اعلیٰ اصولوں کی خلاف ورزی کر کے سوقیانہ طریقے پر چلا ہے' اور عقل کو کھو کر غصہ میں جبر اور تحکم پر اتر آیا ہے۔ میں نے یہ معیاری اصول اس لئے قائم کئے ہیں کہ میں اپنی تہذیب

کر سکوں اور اپنے قول اور فعل میں مطابقت پیدا کر سکوں۔

ہم نے ایتھل کی شخصیت میں ہر جبلت کو کسی اچھے مقصد پر مرکوز کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ پہلے ہر ننھے حیوان کی طرح حریص رہی ہے اور اپنے کھلونوں میں کسی اور کو شریک بنانے سے گریز کرتی رہی ہے۔ لیکن وہ ہمارے اس طرز عمل سے متاثر ہوئی ہے کہ ہم ہر چیز میں اسے شریک بناتے تھے اور اس کی ہر طرح مدد کرتے تھے۔ ہمارے اس دوستانہ رویہ سے اس میں خود اعتمادی پیدا ہوئی' اور وہ دوسروں کے ساتھ بہتر اور فیاضانہ برتاؤ کرنے لگی۔ کچھ مدت تک وہ پیسوں کی دھن میں رہی۔ ہم نے اس کا ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ اس شرط پر کہ وہ اپنا کمرہ صاف رکھے گی' اپنا بستر خود درست کرے گی۔ صبح سویرے اٹھے گی' مدرسہ وقت پر پہنچے گی اور اپنا سبق خوب یاد کرے گی۔ میرے دوستوں نے اس ماہانہ وظیفہ پر مجھے مطعون کیا ہے کہ میں ایتھل کو بگاڑ رہا ہوں۔ اور مجھے خود بھی کبھی کبھی اپنے طرز عمل کی حکمت پر شک پیدا ہوا ہے۔ ابھی یہ کہا نہیں جا سکتا کہ آیا میرے دوست غلط کہہ رہے ہیں یا صحیح۔ لیکن میرا خیال ہے کہ علائم ان کے خلاف ہیں۔ وظیفہ سے ایتھل کی حرص بڑھی نہیں کم ہوئی ہے۔ اس وظیفے سے وہ کھلونے خریدتی ہے اور کبھی کبھی ہمارے لئے بھی تحفہ خرید لاتی ہے۔ میری آئندہ سالگرہ پر اس نے مجھے ایک اچھا تحفہ دینے کے لئے اسی وظیفے میں سے کچھ رقم جمع کی ہے۔ ابھی ابھی اس نے ہمیں اس بات پر آمادہ کر لیا ہے کہ ہم اسے ایک چھوٹا سا گھوڑا خرید دیں۔ جب ہم اس بات پر آمادہ ہو گئے تو وہ مجھ سے کہنے لگی "میں اس کی قیمت اپنے وظیفے میں سے ادا کروں گی۔" لیکن اس مرتبہ اس کی تنخواہ ناکافی ثابت ہو گی۔

یہی حال خودداری کا ہے۔ خودداری ایک مصیبت' ایک بے ہودگی بن سکتی ہے۔ یا یہ شخصیت کی نشوونما میں مدد و معاون ہو سکتی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی بچہ منکسر المزاج یا حقیر بنے' اور جب ایتھل خود سری کرتی ہے تو میں اس خیال سے مطمئن ہو جاتا ہوں کہ وہ بڑی ہو گی تو جو شخص اس سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہے گا وہ اس کی زندگی حرام کر دے گی۔ تھوڑی سی تندی اور جذبہ مدافعت' شخصیت کی ترکیب کے ضروری عناصر ہیں۔ خودداری عزت کی ماں ہے اور ہمت اور جرات کے جذبات پیدا کرتی ہے۔ وہ لامتناہی طور پر کسی اچھے مقصد کے لئے استعمال ہو سکتی ہے۔ ہم ایتھل سے یہ کہتے ہیں' کہ وہ اتنی خوددار ہے کہ یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ کوئی شخص اسے گندا یا غلیظ دیکھے۔ اس کی خودداری اسے اپنے حق سے زیادہ کوئی چیز لینے' تحفوں کے پیچھے بھاگنے یا کام میں کسی اور شخص کو بخت

لینے نہیں دیتی۔ خودداری سزا کا بہت اچھا بدل ہے۔ یہ ایک ایجابی محرک ہے' کوئی سلبی اقدام نہیں۔ یہ بہادری اور استقلال پیدا کرتی ہے اور بزدلی اور کم ہمتی کو کچل دیتی ہے۔ نیٹشے نے یہ سوال پوچھا تھا کہ نیکی کیا ہے؟ اور خود ہی جواب دیا "بہادری۔" لیکن خودداری کے بغیر کوئی کیونکر بہادر ہو سکتا ہے؟

غالباً ہم بچے کی شخصیت کی تعمیر کے سلسلے میں مذمت کی جگہ تعریف و توصیف کو دے سکتے ہیں۔ مذمت روح کو مرجھا دیتی ہے اور کسی خامی کو ہمیشہ کے لئے قابل نفرت بنا دیتی ہے' تعریف ہر خلیہ کو پھیلاتی ہے' ہر عضو کو توانائی بخشتی ہے اور کسی مشکل ترین کام کو ایک معرکہ' ایک فتح بنا دیتی ہے۔ انانیت سے ہم دنیا کو متحرک کر سکتے ہیں۔ کسی کام کی خامیوں کی مذمت کی بجائے ہمیں اچھی طرح کئے ہوئے کام پر نظر رکھنی چاہئے اور اس کی تعریف کرنی چاہئے تاکہ وہ ہمارے حافظہ میں خوشگوار طریقہ پر محفوظ رہے اور ہمیں بہتر اسلوب سے کام نبھانے کی ترغیب دے۔ اگر ا۔تھل ہمیں یہ اطلاع دیتی ہے کہ وہ حساب اچھی طرح نہیں کر سکی (حساب اس کے لئے ہوا ہے) تو ہم افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔ ہم اسے کوسنا نہیں چاہتے۔ خدا کرے اسے یہ راز معلوم نہ ہونے پائے کہ اس کے نمبر ہمارے ان نمبروں سے کہیں زیادہ ہیں جو ہم اپنے زمانہ طالب علمی میں حاصل کرتے تھے۔ لیکن جب وہ گھر آ کے اپنے اعلیٰ نمبروں کا مژدہ سناتی ہے تو ہم خوشی سے رقص کرتے ہیں اور اس کی ہر فتح کا جشن نت نئے طریقوں سے مناتے ہیں۔ جب وہ کوئی خاص کارنامہ کرتی ہے تو ہم اس کے حساب میں ایک ڈالر جمع کروا دیتے ہیں (اگرچہ میرے دوست یہ بات سن کر بہت بگڑتے ہیں) اگر مذمت اور تادیب کی بجائے تعریف و تحسین کا طریقہ ناکام رہا تو؟ ہم پہلے طریقہ کی کامیابی پر دوسرے طریقہ کی شکست کو ترجیح دیتے۔ ہم ہر اس منصوبہ کی تائید کرتے ہیں جو ا۔تھل کی خوشی میں اضافہ کرے۔ رنج و الم سے درشت خو بنانے کی بجائے محبت کی فراوانی سے خود سر بنانا ہمیں زیادہ پسند ہے اور مشکل مرحلوں پر درشتی اور سخت گیری نہیں بلکہ محبت ہماری مدد کرتی ہے۔

خدا جانے یہ زحمت ہے یا رحمت کہ قسمت نے ہمیں فقط ایک بچہ عطا کیا ہے۔ اگر ہمارے اور بچے بھی ہوتے تو ہم ا۔تھل پر اتنی توجہ صرف نہ کر سکتے۔ میں نے دو تین بچوں والے گھرانے دیکھے ہیں۔ ان کا شور و شغب مجھے پسند نہیں۔ میں اپنا کام گھر ہی میں کرتا ہوں اور ا۔تھل اکثر میرے پاس رہتی ہے۔ لیکن اگر اس کے بہن بھائی بھی ہوتے تو میں شاید گھر سے ایک میل دور کوئی کمرہ لے لیتا۔ اب ا۔تھل کا قرب میرے کام میں مخل نہیں

ہوتا۔ دوسرے کمروں میں اس کی آواز یا کبھی کبھار میرے کمرہ پر اس کا تبسم مجھے مزید ... کر دیتا ہے۔ میں اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ میں اپنا کام شہر سے انتشار میں نہیں بلکہ ایک شخصیت کے خوش گوار نشوونما کی معیت میں انجام دیتا ہوں۔

تاہم اکلوتے بچے کی نعمت دشواریاں بھی ساتھ لاتی ہے۔ لیکن ہم ان پر اس طرح قابو پاتے ہیں کہ اس کے ہجولیوں کو گھر میں بلا لیتے ہیں' یا کبھی ا-تمل کو ان کے ہاں بھیج دیتے ہیں۔ اپنے ایک بھانجے کو چھٹیوں میں اپنے پاس رکھ لیتے ہیں۔ کبھی کبھی دوسرے گھروں میں ہفتہ اور اتوار گزرتے ہیں۔ اور سب سے اہم یہ کہ ہم خود بچے بن جاتے ہیں اور ا-تمل کے مطالعہ اور کھیلوں میں اس کے شریک ہوتے ہیں۔ وہ فرانسیسی میں سبق لے رہی ہے۔ ہم ہفتہ بھر اس کے کام میں شرکت کریں گے اور اسے ایک تقابلی کھیل بنا کر کھیلیں گے اور ہر لفظ کو ابہام اور جوڑ توڑ سے اس کے ذہن نشین کروا دیں گے۔ یا حساب میں اسے مشکل کام ملتا ہے' ہم کھانے کی میز پر بیٹھ جاتے ہیں' اور سارا کنبہ ایک گھنٹہ تک جمع' تفریق' ضرب' تقسیم کرتا رہتا ہے۔ کیا یہ والدین کے لئے تضیع اوقات نہیں؟ لیکن آپ کس طرح اپنا وقت ضائع کرتے ہیں؟ ہم اپنے لمحات فرصت اور کس بہتر طریقہ سے صرف کر سکتے ہیں؟

ولدیت کا راز یہ ہے کہ دوبارہ بچے بن کر اپنا وقار اور اپنا مرتبہ بھول کر بچہ کے برابر ہو کر ہم اس کے ساتھ کھیلیں۔ شاید اس بے تکلفی سے ہم بچہ کی محبت اور اعتماد حاصل کر لیں' جو تعلیم کی جان ہے۔ اگر ہم دیانت داری سے بچہ کے فطری اخلاقی سرچشمہ ہیں؟ ہم ا-تمل کو بتاتے ہیں کہ ہر خیال' غیر مرئی طور پر اس کے چہرہ سے ظاہر ہوتا ہے' اور شخصیت کا ہر جزو چہرہ پر لکھا جاتا ہے۔ لیکن ہم ان ناتواں عقلی اصولوں سے ہی مطمئن نہیں ہو جاتے۔ اگر ہم اسے راست گو بنانا چاہیں تو ہمیں خود بھی راست گو بننا پڑے گا' چاہے اس سے دوسرے کو تکلیف ہی کیوں نہ ہو۔ ہمیں اسے کوئی سزا نہیں دینی چاہئے۔ صرف ہم اس پر یہ جتلا دیں کہ اس کی غلطی سے ہم سب کو دکھ ہوا ہے۔ ہمیں اعتماد ہے کہ مثال اور محبت سے وہ ہمارے ساتھ دیانت داری برتے گی۔ بالغ لوگوں کے ساتھ جھوٹ بعض اوقات جائز ہے۔ کیونکہ یہ حقیقت سے ناراض ہوتے ہیں۔ لیکن جھوٹ بچوں کے لئے شاید ہی کبھی مفید ہوتا ہو۔ کیونکہ وہ علم کے بھوکے اور پیاسے ہوتے ہیں۔ لیکن ماہرین اخلاق حقیقت سے جی چراتے ہیں۔ بالخصوص جب کہ بچے اس کی تلاش کریں۔ اخلاق دوسری چیزوں کی طرح اس معیار پر پوری نہیں اتری۔ لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے

باپ نے اس سے ہمیشہ راست گوئی سے کام نہیں لیا۔ ہم پھر کوشش کریں گے۔

۴۔ جنسی

راست گوئی کا سخت ترین امتحان بچہ کی جنسی تعلیم میں پیش آتا ہے۔ ہم اس شدید تجسس کی کیوں مدافعت کرتے ہیں۔ جو سائنس اور تعلیم کی بنیاد ہے؟ میرا خیال ہے کہ امریکہ مسیحی وراثت نے ہمیں محبت کے جسمانی پہلو سے دہشت زدہ کر دیا ہے۔ تاریخی نقطہ نظر سے اس کی توجیہہ یہ ہے کہ حیوان بھی تناسل کے وقت علیحدگی اختیار کرتے ہیں تاکہ خارجی خطرہ سے محفوظ رہیں۔ انسانی نقطہ نظر سے اس کی توجیہہ یہ ہے کہ ہم نے شادی کی عمر کو ملتوی کر کے عنفوان شباب سے دور جا پھینکا ہے' اور اس لئے ہمیں اس بنیادی جبلت کی ہر غیر ضروری تحریک سے گریز کرنا پڑتا ہے۔ یہ ایک مشکل سوال ہے اور ہم فیصلہ کر چکے ہیں کہ ہم حقیقت کا ساتھ دیں گے۔ ہم آخری لحہ تک اس کے ذہن سے یہ سوال دور رکھیں گے۔ جدید زندگی کی شدید فضا میں یہ سوال بہت جلدی پیدا ہو جائیں گے اور اس سے پہلے کہ دوسرے بچے اپنے واہمہ کی مدد سے ان سوالوں کے جواب دیں ہم خود ان کا جواب دینا چاہتے ہیں۔ ہم اس سوال کا جواب بھی دوسرے سوالوں کی طرح دیں گے۔ اس معاملہ میں "تقدس" بگھارنا شرارت اور لاعلمی کو دعوت دیتا ہے ہمیں جنس کا ہاضمہ اور تنفس کی طرح ایک سائنس دان کی معروضیت کے ساتھ ذکر کرنا چاہئے۔ حقیقت "تقدس" کی چادر اوڑھے بغیر ہی خاصی صحت مند ہے۔

علم اور صحت ہی بہترین ماہرین نفسیات ہیں۔ جہاں جسم مضبوط اور ذہن صاف ہو۔ ذہنی امراض پیدا نہیں ہوں گی۔ ڈڈرو نے کہا ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنی بیٹی کو علم تجزیہ بدن سکھائے گا۔ میں اتنی جلد بازی سے کام نہیں لوں گا۔ اس سلسلہ میں جوانوں کی پریشانیاں ہمارے لئے تکلیف دہ ثابت نہیں ہونی چاہئیں۔ ہمیں چاہئے کہ فطرت کو اپنا کام کرنے دیں اور وعظ اور جھوٹ سے پرہیز کریں۔ ہم بچہ کو تمام کھیلوں کے سامان بہم پہنچائیں گے اور اسے کھلی فضا میں لے آئیں گے۔ جب کوئی لڑکا انہماک اور جوش سے فٹ بال کھیلے تو اس کا اخلاق میرے نزدیک بالکل ٹھیک ہے۔

بچہ کی محبت کو اگر سچائی کی دولت میسر ہو تو یہ حسن اور مسرت کا باعث بنتی ہے۔ مثلاً اتھل مدرسہ سے آئی ہے۔ اس نے اپنے بازو میرے گرد حمائل کر کے کہا "ابا مجھے محبت ہو گئی ہے۔" مجھے ایسی حالت میں کیا کرنا چاہئے؟ اسے اس کے خطرناک رومان پر برا بھلا

کہنا چاہئے؟ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ میں اس کی بات سن کر ہنس دیتا ہوں اور اس سے پوری تفاصیل طلب کرتا ہوں۔ میں اس درخشاں روح کو اخلاق سے کیوں تاریک کروں؟

لیکن جب عنفوان شباب آئے تو ہم کیا کریں۔ اس کی پہلی علامت پر ہم ا۔تھل کو علم سے مالا مال کر دیں گے۔ ہم ہر ممکن کوشش کریں گے کہ اس پر وہ حساسیت وہ استغراق، وہ شرمیلا پن طاری نہ ہو جو عموماً زندگی کی اس منزل کو الم ناک بنا دیتا ہے عنفوان شباب کے دور کو رنج و الم کا دور نہیں ہونا چاہئے۔ بلکہ روح کی بہار' سپردگی اور مقاصد اور شعور شاعری کا موسم۔ جسم اور ذہن کی صحت اور نشوونما کے کمال کا عہد ہونا چاہئے۔ اس زمانہ میں نئی ذہانت پھوٹتی ہے۔ اس منزل سے بدن کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔ شخصیت کی تعمیر مکمل ہو جاتی ہے اور ماہر تعلیم کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اب ذہن کے مسائل پر غور کرے۔

۵۔ ذہنی

میں نہیں جانتا کہ ا۔تھل کے ذہن کی ابتدا کب ہوئی لیکن جب تک اس نے یہ نہیں کہا کہ "ہم چھ برس کے ہو گئے ہیں۔" ہم نے اس کے متعلق غور ہی نہیں کیا۔ وہ یہ نہیں چاہے گی کہ میں اس کا یہ مطلب لوں کہ اس سے پہلے اس کا ذہن تھا ہی نہیں۔ کیا اس نے انگریزی زبان نہیں سیکھی تھی؟ اس ضمن میں بھی مثال احکام سے زیادہ موثر ثابت ہوئی۔ اس لئے ہمیں یہ ماننا پڑا کہ اگر ا۔تھل کو صحیح انگریزی بولنا ہے تو ہم بھی صحیح انگریزی بولیں اگر ہم ا۔تھل کی بولی میں غلیظ الفاظ شامل نہیں ہونے دینا چاہتے تو ہماری زبان پر بھی یہ الفاظ نہیں آنے چاہئیں۔ ہم نے روزمرہ کے ہر محاورہ کو ترک نہیں کیا کیونکہ ان میں سے اکثر محاورے زبان کو رنگین بناتے ہیں اور بعض اوقات کسی مطلب کو ایک لفظ میں ادا کر دیتے ہیں' جسے ڈاکٹر جانسن کی زبان میں ادا کرنے کے لئے شاید ایک پیراگراف کی ضرورت پڑے۔ لیکن ہم نے اسے ڈھیلی ڈھالی زبان سکھانے کی بجائے صحیح زبان سکھائی' اور اسے اس کی عمر کے مطابق بہترین ادب پڑھنے کو دیا۔

پھر ہمیں مدرسہ کا انتخاب کرنا پڑا۔ سوال یہ تھا کہ ہم ا۔تھل کو پڑوس کے عام مدرسے میں بھیجیں یا ایک مشہور خاص مدرسہ میں جو گھر سے کافی دور ہے۔ ہم دونوں مدرسے دیکھنے گئے' اور ہم اس ترقی پر حیران رہ گئے جو عام مدرسوں نے اس وقت سے اب تک کی ہے جب میں وہاں دس ڈالر ہفتہ لے کر پڑھایا کرتا تھا۔ روشن کمرے' چھوٹی جماعتیں' ہر طالب علم کے لئے علیحدہ ڈیسک' کار آگاہ اور زندہ دل استاد' ہر مادی اور علمی سہولت۔ ہمیں ان

آنکھوں پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ میں نے ان مدرسوں کے خلاف بہت کچھ سنا تھا' اور ان کے خلاف لکھا بھی تھا کہ یہ مدرسے قید خانے ہیں' جہاں بچے کبریائی صلاحیتیں لے کر آتے ہیں اور اجڑے ہوئے دیوتا بن کے یہاں سے نکلتے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ میں نے فقط لفظوں کی شعبدہ بازی دکھائی ہو۔

ہم نے ایتھل کو عام مدرسے میں داخل کرا دیا' اور وہ اس کے لئے مفید ثابت ہوا۔ اس مدرسے میں وطن پرستی کے جذبے کی ضرورت سے زیادہ تلقین ہوتی تھی۔ ہمیں اس بات پر کوئی اعتراض نہیں تھا کہ ایتھل اپنے وطن سے محبت کرنا سیکھے۔ بشرطیکہ وہ دوسری اقوام کی عظمت کی قدر کرنا بھی سیکھ لے۔ ایتھل چار مدرسوں میں تعلیم پا چکی ہے۔ اور چاروں کے چاروں انسانیت اور استعداد کا مجسمہ تھے۔ کچھ دوسروں سے بہتر تھے۔ مدرسہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ روایات و روابط کے نقطہ نظر سے۔ ایتھل جب ایک مدرسہ سے دوسرے مدرسہ میں جاتی تھی تو اس کی عادتوں اور دل چسپیوں میں فرق آ جاتا تھا۔ اب وہ ایک بہترین مدرسہ میں ہے اور ہم مطمئن اور ممنون ہیں۔

اس تجربے کی بنا پر میں کوئی کلیہ قائم نہیں کروں گا' اور میں چاہتا ہوں کہ بعض علاقوں میں عام مدرسوں کی حالت خاطر خواہ نہیں ہے۔ روابط اور روایات' مدرسہ کا ایک اہم جزو ہیں۔ ایمرسن نے کہا تھا کہ اپنے بیٹے کو کالج بھیجو اور لڑکے اس کی تربیت کریں گے۔ اس سلسلے میں ہم نے نیویارک کے ایک نہایت اعلیٰ سکول کا تجربہ کیا۔ ہمیں جلدی ہی احساس ہونا شروع ہو گیا کہ ایتھل کو یہ مدرسہ پسند نہیں۔ وہ اس شور و شغب اور دھاندلی کی شاکی تھی' جسے پرنسپل نے آزادی کا نام دے رکھا تھا۔ اگرچہ اس نے وہاں چند دلچسپ صنعتیں سیکھیں اور کھلی فضا میں منظم کھیل کھیلے' لیکن وہ ہم سے اکثر یہ پوچھتی تھی کہ "آخر وہ کب مجھے کچھ پڑھائیں گے۔" ایک برس کے بعد ہم نے اسے ایک عام مدرسے میں داخل کرا دیا۔ اور یہ دیکھا کہ غیر معمولی ذہانت کے باوجود وہ جماعت سے بہت پیچھے تھی۔ ہمیں اسے پڑھانے میں بہت وقت صرف کرنا پڑا۔

صحیح مدرسہ دریافت کرنے کے بعد اس سے تعاون کرنا ضروری ہے۔ والدین کا یہ فرض ہے کہ وہ دیکھیں کہ بچہ مدرسے سے ناغہ نہ کرے یا وہاں دیر سے نہ جائے۔ اس کی روزانہ ترقی اور ماہانہ ترقی پر نظر رکھیں۔ گھر کے کام اور مطالعہ میں دلچسپی لیں۔ ایسا کر کے ہم محض مدرسے سے تعاون ہی نہیں کرتے' بلکہ بچہ کی مدد کرتے ہیں۔ کوئی قابل قدر بالیدگی شخصیت کے لئے رحمت ہے۔ جب ہم کھیتوں اور جنگلوں میں سیر کے لئے جاتے

ہیں تو باتوں کا رخ تاریخ، جغرافیہ یا ادب کی طرف بدل دیتے ہیں اور بڑے آدمیوں کی دلچسپ کہانیاں، پرستانی کہانیوں اور افسانوں سے زیادہ مفید ثابت ہوتی ہیں۔

جغرافیہ ایک بے کیف مضمون ہے؟ جہاز چاہے بندرگاہ میں کھڑا ہوا یا سفر کے لئے بادبان اٹھا چکا ہو۔ ایک محرک رومان حقیقت نہیں ہے؟ ہر بچہ دوسرے ممالک کو پسند کرتا ہے۔ اس لئے جغرافیہ پڑھانے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے حقیقی یا مصنوعی سفر استاد جماعت کو شنگھائی یا سنگاپور لے جاتا ہے اور ایشیا کے تمام عجائبات ان کا خیر مقدم کرتے ہیں، یا وہ دریائے نیل کے کنارے کنارے سکندریہ سے حبشہ کا سفر کرتے ہیں اور ہزاروں نادر قبائل کو دیکھتے ہوئے جوہنسبرگ یا کیپ ٹاؤن پہنچ جاتے ہیں۔ اور افریقہ فقط ایک نام کی بجائے حقیقت بن جاتا ہے۔ ہر مدرسہ کو ہومز اور نیومین کے فلمی سفرناموں سے آراستہ ہونا چاہئے۔ جو عام بے ہودہ فلموں سے کہیں زیادہ دلچسپ ہوتے ہیں۔ اور تاریخ؟ یقیناً بقول کارلائل "بڑے آدمیوں کی سوانح عمری" ہونا چاہئے۔ بچہ کے دل میں ایک دفعہ عظمت کا احترام پیدا ہو جائے تو وہ ساری عمر اس کے ساتھ وفا کرتا ہے۔ چاہے دوسری محبتیں اس کے دل سے غائب ہو جائیں۔

مملکت ذہن میں داخل ہونے کے لئے عظیم شخصیتیں اب بھی زندہ ہیں اور تعلیم دیتی ہیں۔ صرف پڑھنا اور دیکھنا شرط ہے۔ عجلت کے بغیر وہ تصویریں اور وہ اصنام دیکھنا، جن میں فن کاروں نے اپنا فلسفہ زندگی سمو دیا ہے۔ پارتھینون کی عظمت یا شارتر کے حسن و نزاکت کا اطمینان قلب سے مشاہدہ کرنا، یا استقامت سے وہ کتابیں پڑھنا، جنہیں وقت نے ہر عہد کے علمی خس و خاشاک سے علیحدہ کر کے ہم تک پہنچایا ہے، اصل تعلیم ہے۔ جب ایتھل ہمیں رفیل اور ریمبرانٹ، لیونارڈ اور مائیکل انجلو، رینلڈز اور گینزبرو، ریوبنز اور وان ڈائیک کے افسانے سناتی ہے (جو اس نے مدرسہ میں سنے ہوتے ہیں) تو ہمیں کتنا لطف آتا ہے۔ اس کی عمر میں، مجھے ان عظیم الشان شخصیتوں کے وجود کا وہم و گمان تک نہ تھا۔ اس سے بھی زیادہ دل چسپ مشغلہ اسے اقلیم ادب سے آشنا کرنا اور اسے شیکسپیئر اور شیلے، ملٹن اور بائرن، گوئٹے اور ہیوگو، وٹمین اور پو کے افسانے سنانا ہے۔

وہ حال ہی میں اس ادب کے مطالعہ سے فارغ ہو رہی ہے جو خاص طور پر اس کی عمر کے بچوں کے لئے لکھا گیا ہے۔ اس ادب کے پرانے شاہکار مثلاً "ایلس ان ونڈر لینڈ" اور لیر کی "نان سنس بک" نہایت قابل تعریف ہیں۔ لیکن بعد کی اکثر کتابیں بچے کی ذہانت کو کم تر سمجھ کر لکھی گئی ہیں۔ اس لئے غیر مفید ہیں۔ ان میں بچوں کے لئے نشوونما کی کوئی

تحریک موجود نہیں۔ ہوشیار بچوں کی اگر اس ادب پر پرورش کی گئی تو وہ پڑھنے کا ذوق کھو دیں گے۔ بہت سی کتابیں' جو بظاہر بالغوں کے لئے لکھی گئی ہیں۔ نو دس برس کے بچوں کا سامان تفریح بن سکتی ہیں۔ مثلاً "دی تھری میکیٹیر ز۔" "دی ٹلیسمین" اور "لے مزرابل" اور بچہ اس کتاب کو زیادہ پسند کرتا ہے' جس کے متعلق اسے بتایا جائے کہ یہ بالغوں کے لئے لکھی گئی ہے۔ بچے کے لئے دنیا میں کوئی کتاب "رابنسن کروس" اور گلیور کے سفر سے زیادہ مفید نہیں۔ اور یہ کتابیں بچوں کے لئے نہیں لکھی گئی تھیں بلکہ موخرالذکر تو اب تک اچھی طرح بالغوں کی سمجھ میں نہیں آئی۔

ہر اس گھر میں جہاں کتابوں کو نوازا جاتا ہے۔ ہفتہ میں کم سے کم ایک شام باآواز بلند پڑھنے کے لئے مخصوص ہونا چاہئے۔ بچے اور بالغ باری باری کتاب پڑھ سکتے ہیں۔ غلطیوں کی اصلاح مطالعہ کے بعد علیحدگی میں ہو سکتی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایتھل اور اس کے سیاہ آنکھوں والے رشتہ دار۔ لوئی اور ہم تین بزرگوں نے مل کر ایوخ آرڈن پڑھی تھی' اور بچوں نے اس کے ہر جملہ میں دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔ کتاب کے خاتمے پر ہم سب خاموش ہو گئے اور ایتھل اپنی ماں کے بازوؤں میں چھپ کر رونے لگی۔ ہم اب وینس کے تاجر کے بہت سے نسخے خریدیں گے اور کردار متعین کر کے جلتی آگ کے سامنے اپنی خوش الحالی کے جوہر دکھائیں گے۔

میرا خیال ہے کہ ہم اعلیٰ تعلیم مدرسہ اور کالج سے نہیں بلکہ ذاتی مطالعہ سے حاصل کرتے ہیں۔ مسٹر ایوریٹ ڈین مارٹن نے اس اصطلاح کی بہت خوب وضاحت کی ہے' اور میں بڑے پرزور انداز سے ان کی کتاب ان لوگوں کے لئے تجویز کرتا ہوں جو ذہنی بلوغت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ آج ہم اس آدمی کو تعلیم یافتہ سمجھتے ہیں جو صبح' دوپہر یا شام کو اخبار پڑھ سکتا ہو اور اگرچہ ہمارے کالج سٹینڈرڈ کاروں کی طرح ہر سال گریجویٹ پیدا کرتے ہیں۔ ہماری زندگی میں صحیح تہذیب کی اب بھی خاصی کمی ہے۔ ہمارے ہاں لاکھوں مدرسے ہیں اور مشکل سے چند درجن تعلیم یافتہ اشخاص۔ اسی لئے مسٹر ویلز اور دوسرے مصنفین نے کالج کی تعلیم کے فوائد کے متعلق شک ظاہر کیا ہے۔ یہ انتہائی یاسیت ہے۔ لیکن یہ بہتر ہو گا اگر کوئی شخص یہ محاسبہ کرے کہ آیا مدرسوں اور کالجوں کی افراط نے ہمیں زیادہ ذہین بنا دیا ہے؟ ہمارے مدرسوں اور کالجوں نے سپنسر کی اس توضیح تعلیم سے بہت نقصان اٹھایا ہے' کہ یہ فرد کو ماحول سے سازگار بننا سکھاتی ہے۔ تعلیم کی یہ تعریف ایک بے جان' میکانکی تعریف تھی' جو میکانکی فلسفہ سے اخذ کی گئی تھی اور جو ہر تخلیقی روح کے لئے ناخوشوار تھی۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میکانکی اور نظری سائنس نے ہمارے مدرسوں کو تسخیر کر لیا ہے اور "بے فائدہ" مضامین یعنی ادب، تاریخ، فلسفہ اور آرٹ کو بڑی حد تک نظر انداز کر دیا ہے۔ اس طرح ہم اچھے چپڑاسی، اچھے کلرک اور اچھے کاری گر تو ضرور بن جاتے ہیں لیکن اپنی فرصت کے لمحات کو مصور اخباروں کے مطالعہ میں غرق کر دیتے ہیں اور ان تھیٹروں میں جمع ہو جاتے ہیں، جو ہمیں ایک ہی محبت کے مناظر متواتر دکھاتے رہتے ہیں۔ یہ میکانکی اور عملی تعلیم مکمل نہیں بلکہ ادھوری شخصیتیں پیدا کرتی ہے۔ یہ تہذیب و صنعت، حیاتیات کو طبیعات اور ذوق کو دولت کے تابع کرتی ہے۔ لیکن تعلیم کا مقصد شخصیت کی تکمیل ہونا چاہئے۔ اسے انسان کی ہر تخلیقی صلاحیت کو ابھارنا چاہئے اور اس کے ذہن کو دنیا کے ہر دلچسپ اور سبق آموز پہلو سے آشنا کرنا چاہئے۔ وہ شخص جو کروڑوں روپے کا مالک ہے لیکن جس کے لئے بیتھوون، کورو یا ہارڈی۔ یا غروب میں خزاں کے جنگلوں کی روشنی بے معنی چیزیں ہیں۔ انسان نہیں محض ایک انسان کا ہیولیٰ ہے آدمی دنیا اس کی روح کے دھندلے دریچوں کے لئے بند ہوتی ہے۔ وہ تعلیم جو خالصتاً "سائنٹیفک" ہے، لوگوں کو محض ایک آلہ بنا دیتی ہے۔ وہ اسے حسن سے نا آشنا کر دیتی ہے اور اسے وہ طاقتیں عطا کرتی ہے جو حکمت سے بعید ہوتی ہیں۔ اگر سپنسر نے تعلیم پر کچھ نہ لکھا ہوتا تو دنیا کے لئے بہتر ہوتا۔

یہ اچھا ہوا کہ لاطینی اور یونانی زبانیں ہمارے کالجوں میں اب پہلے زور شور سے نہیں پڑھائی جاتیں کیونکہ ان پر ان کی اہمیت سے کہیں زیادہ محنت اور جاں فشانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہائنے نے کہا تھا "اگر رومیوں کو پہلے لاطینی زبان پڑھنا پڑتی تو ان کے پاس ساری دنیا کی تسخیر کے لئے وقت نہ ہوتا۔" اگرچہ یونان اور روما کی زبانیں سیکھنا محض ماہرین لسانیات کے لئے لازمی ہے۔ لیکن ان قوموں کا ادب تعلیم کے لئے لابدی ہے۔ کیا کوئی شخص ورجل، ہوریس لیوکریٹس، سسرو، ٹیسی ٹس اور مارکس اور ییٹس کو نظر انداز کر کے بھی ذہنی بلوغت حاصل کر سکتا ہے؟ لیکن تعلیم کے تمام ممکن ذرائع میں سے جن کا مجھے علم ہے، کوئی ذریعہ یونانی زندگی کے مطالعہ سے زیادہ جامع اور حسین نہیں۔ یونانی زندگی اپنی جمہوریت اور استماریت، اپنی خطابت اور تمثیل، شاعری اور تاریخ، معماری اور بت تراشی، سائنس اور فلسفہ کے متنوع پہلوؤں کے ساتھ بہترین ذریعہ تعلیم ہے۔ اگر کوئی طالب علم پیریکلیز اور احیائے علوم کے عہد کے ادب سے واقفیت حاصل کر لے تو وہ ایسی تعلیم حاصل کر لے گا جو کوئی کالج اسے نہیں دے سکتا۔ تعلیم کا یہ مطلب نہیں کہ ہم تجارت

زمین دوزی، علم نباتات، صحافت یا فلسفہ علم میں مہارت حاصل کر لیں، بلکہ یہ کہ ہم اپنی نسل کی اخلاقی، ذہنی اور جمالیاتی وراثت کو جذب کر کے اپنے آپ پر اور خارجی دنیا پر قابو حاصل کریں۔ اور یہ کہ ہم روح اور بدن کے لئے بہترین رفیق چنیں اور یہ کہ ہم تہذیب میں خوش خلقی، علم میں حکمت اور شعور میں عفو کا اضافہ کرنا سیکھیں۔ ہمارے کالج کب اس قسم کے انسان پیدا کریں گے؟

۶۔ دربارہ سرور

ا۔تھل شام کے وقت آگ کے پاس بیٹھی ہوئی کتنی اچھی لگتی ہے۔ اس کی مضبوط سرخ ٹانگیں کرسی کے آگے پھیلی ہوئی، اس کے بھرے بھرے برہنہ بازو، اس کا سرخ رین اس کے بلاؤز پر چمکتا ہوا، اس کے گیسو کتاب پر گرتے ہوئے، اس کا چہرہ دلچسپی اور ذوق سے فروزاں، اس کی روح دور دراز مقامات پر سفر کرتی ہے۔ اپنی سرحدیں بڑھاتی ہوئی اور اپنے آپ کو ہر روز عظیم شخصیتوں کی صحبت کے زیادہ سے زیادہ قابل بناتی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ ہر ایک سے سیفو سے لے کر ڈیوسے، امپیڈوکلیس سے لے کر نیطشے تک ابدھا سے لے کر ڈوسٹوفسکی اور لاؤتزے سے لے کر اناطول فرانس تک گفت و شنید کرے گی۔ ہم اسے پھلتے پھولتے سقراط سے حکمت لیونارڈو سے سپردگی، مسیح سے نرم دلی سیکھتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ وہ ہمیں سپنوں میں ایک عظیم الشان شخصیت بنتی نظر آتی ہے۔

ہمیں امید ہے کہ وہ اتنی عالم کبھی نہیں بنے گی کہ زندگی سے محبت نہ کر سکے، اور یہ کہ وہ کبھی کتابوں کو دوستی، فطرت اور مامتا سے بہتر نہیں سمجھے گی۔ اگر اس نے کسی دن ایک بچہ کو اٹھا کر اپنے قد سے اونچا نہ کیا (جس طرح ہم اسے اٹھاتے ہیں) تو ہم اسے مکمل نہیں سمجھیں گے۔ لیکن وہ آزاد ہو گی، حتیٰ کہ ہمیں مایوس کرنے میں بھی آزاد ہو گی۔ کوئی دوسرے کی خاطر نظام زندگی نہیں بنا سکتا۔ وہ اپنی راہ کا انتخاب کرے گی اور اپنی نیکی کا تصور خود قائم کرے گی۔ ہمارے لئے یہ کافی ہے کہ وہ ہماری بیٹی ہے، اور ہماری اس مبہم زندگی میں سرچشمہ مسرت بن کے آئی ہے۔

باب دوازدہم

شخصیت کی تعمیر نو

ا۔ شخصیت کے عناصر

بچہ کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کا ذکر تو ہو چکا۔ کیا ہم بڑوں کے پاس کوئی طریقہ ہے جس کے ذریعہ ہم اپنی شخصیتیں بہتر بنا سکیں؟

اس پرزور اور پیچیدہ عہد میں ایک ذہین دماغ کے لئے ایک نادر موقع ہے کہ وہ سائنس کی پیدائش پر نظر رکھے۔ معملوں میں شور و شغب سے یہ ظاہر ہے کہ فلسفہ جو ناشکر گزار سائنسوں کی ماں ہے' ایک اور بچہ کو جنم دے رہا ہے۔ اور ذہن کا مطالعہ مابعد الطبیعات کے تاریک بطن سے آہستہ آہستہ مشاہدہ اور تجربہ کی روشنی میں آ رہا ہے۔ ابھی تک تولید کا عمل پورا نہیں ہوا۔ حتیٰ کہ فرائڈ میں بھی یہ بچہ ابھی تک ماں سے وابستہ ہے اور فکر اور وہم کی افراط سے اس کا دم گھٹا جا رہا ہے۔

آج نفسیات کا مقام وہی ہے جو تین سو برس گزرے طبیعات کو حاصل تھا۔ جب فرانسس بیکن نے اپنی "ایڈوانس منٹ آف لرننگ" لکھی تھی' اس جرات کے ساتھ' جس نے "احیائے علوم" کی بے باکی کو بھی متحیر کر دیا تھا۔ بیکن نے سائنسوں کے لئے ایک منشور تیار کیا تھا' اور ان اہم مسائل کی طرف اشارہ کیا تھا' جنہیں حل کرنے کی ضرورت ہے۔ اور ان فتوحات کی پیش گوئی کی تھی' جو اس نئے علم سے ہمیں حاصل ہو سکتی تھیں۔ آج یہ فتوحات حقیقی ہیں اور انہوں نے بیکن کے تخیلات کو بھی پس پشت ڈال دیا ہے۔ طبیعات اور کیمیا' ریاضی اور میکانکس نے دنیا کی شکل اس طرح بدل دی ہے کہ وہ آدمی کی رضا کی تابع ہو گئی ہے۔ صرف آدمی اس کے عزم اور اس کی شخصیت میں فرق نہیں آیا۔ ممکن ہے کہ نفسیات بھی اسی قسم کے معرکوں کو سر کرنے والی ہو۔ اگر کوئی اور بیکن اس کے مسائل کو توضیح کر دے اور اس کی فتوحات کی پیش گوئی کرے تو دنیا اس کا یقین کرے گی؟ ہم ایک عظیم اور نادر سمندر کے ساحل پر کھڑے ہیں' جو ابھی تک واہمہ کی

تاریکی میں گھرا ہوا ہے۔ ہم اس کی گلیوں اور اس کی مسافتوں سے آشنا نہیں' اور یہ بھی نہیں جانتے کہ کتنے خوشگوار جزیرے اس سمندر سے پرے ہیں لیکن یہ نئی سائنس پھلے پھولے گی اور آزمائش کرتی ہوئی تعصب اور جہالت کے بادلوں میں اپنی راہ گزر خود بنائے گی۔ تین سو برس بعد نفسیات وہاں ہو گی جہاں آج طبیعات ہے۔ یعنی روڈاں کے کسی صنم کی طرح نامکمل اور متجسس۔ لیکن پھر بھی "ذہن" یا "دل" یا "روح" پر غالب ہو گی اور ہمارے عزائم کے انتشار میں نئے علم سے ایک اعلیٰ نسل کی طاقت اور رحم دلی پیدا کرے گی۔

ہم بنیادی طور پر اپنے آپ میں دلچسپی رکھتے ہیں اور جہاں تک نفسیات ہم سے متعلق ہے اور مجرد تصورات سے نہیں' یہ ایک تمثیل کی طرح دلچسپ ہے' جس کے ہیرو ہم خود ہیں۔ ہم آخرکار کیا ہیں؟ بندر یا دیوتا؟ یا بندر جو دیوتا بننے والے ہیں؟ وہ "انسانی فطرت" کیا ہے جو بہت سے لوگوں کو اٹل المیہ کی طرف لے جاتی ہے؟ شخصیت اور عمل کے اجزا کیا ہیں؟ کیا وہ اتنے ہمہ گیر اور گہرے ہیں کہ شخصیت کبھی نہیں بدل سکتی؟ یا کیا ہم بیرن منشاؤزن کی طرح اپنے آپ کو اپنے جوتوں کے تسموں کی طرح اپنی وراثت سے علیحدہ کر سکتے ہیں؟ ہمیں اس وقت اور سب چیزوں کو فراموش کر کے شخصیت کی نوعیت پر غور کرنا چاہئے۔ ہم اسے مشاہدہ اور سوجھ بوجھ کے لئے ٹکڑے ٹکڑے کریں گے۔ اس کے بعد اگر ممکن ہوا تو ہم ان ٹکڑوں کو جوڑ دیں گے۔

پرانی نفسیات' جب انسانی کردار پر غور کرنے کی طرف مائل ہوتی تھی تو شخصیتوں کو دموی' سوداوی' صفراوی اور بلغمی مزاجوں میں تقسیم کیا کرتی تھی۔ یہ الفاظ کو کچھ عجیب سے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن ان کا مطلب یہی ہے کہ انسان خوش طبع' غمگین' جوشیلے یا انگریزوں کی طرح ٹھہرے ہوئے مزاج کے ہوتے ہیں۔ ممکن ہے یہ تقسیم صحیح ہو لیکن یہ الفاظ محض صفات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ یہ انسانی کردار کی توجیہہ نہیں کرتے ہم اس کے موجود کے متعلق یہ قیاس آرائی کر سکتے ہیں کہ وہ شخصیت کے بارے میں ایک دلچسپ بدنیاتی نظریہ رکھتا تھا جو لہو یا سودا' صفرا یا بلغم سے متعین ہوتی تھی۔ بین نے شخصیتوں کو عقلی' جذباتی یا ارادی شخصیتوں میں تقسیم کیا تھا۔ جو عقل یا جذبات یا ارادہ کے غلبہ سے بنتی ہیں۔ لیکن چونکہ ارادی شخصیت جذباتی بھی ہو سکتی ہے (جس طرح الزبتھ یا سکندر کی تھی) یا عقلی بھی ہو سکتی ہے (جیسے نپولین اور سیزر کی) اور عقلی شخصیت جذباتی ہو سکتی ہے (جیسے افلاطون' اے بی لارڈ' والٹیئر یا نیطشے) ہم جس دروازہ سے داخل ہوئے تھے اسی سے

باہر نکلے ہیں۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں انسان کا مطالعہ کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک طریقہ ماحول سے شروع ہوتا ہے اور انسان کو محض ماحول سے سازگار بننے کا آلہ سمجھتا ہے۔ یہ نظریہ فکر اور ذہن کو مادہ میں تحلیل کر دیتا ہے۔ اور سپنسر کی مادیت اور واٹسن کے نظریہ کردار کا لباس پہنتا ہے۔ یہ ایک ایسا نظریہ ہے جس کے بڑے بڑے مفکر' ڈیموکریٹس' ایپی کیورس' لیوکریٹس' ہوبز اور حتیٰ کہ نرم مزاج سپینوزا نمائندے ہیں۔ حیاتیات میں اس نے ہمیں ڈارون اور قدرتی انتخاب کا تصور عطا کیا۔ اجتماعیات میں اس نے ہمیں بکل' بٹز اور مارکس دیئے اور اقتصادی اثرات غیر شخصی اور غیر ارادی واقعات کے تصور سے تاریخ کی توجیہہ کی۔

دوسرا طریقہ داخلی کیفیتوں سے ابتدا کرتا ہے۔ یہ انسان کو حوائج۔ محرکات' اور خواہشات کا نظام سمجھتا ہے جو ہمیں ماحول کے مطالعہ' استعمال اور تسخیر پر مجبور کرتا ہے۔ یہ نظریہ مادہ کو ذہن میں تحلیل کر کے لذت اندوز ہوتا ہے۔ یہ ارسطو کی روح سے شروع ہوتا ہے اور برگساں اور ولیم جیمز کی ارادیت میں کمال حاصل کرتا ہے۔ ان تین مفکروں کے علاوہ افلاطون' ڈے کارٹ' لائبنز۔ کانٹ اور شوپنہار بھی اس نظریہ کے حامی ہیں۔ حیاتیات میں اس نظریہ نے ہمیں لیمارک اور نظریہ ارتقا کی یہ توجیہہ دی کہ ارتقا آرزو کی متواتر کوششوں سے عمل میں آتا ہے۔ اجتماعیات میں اس نے ہمیں گوئٹے' کارلائل' اور نیٹشے دیئے اور تاریخ کی توجیہہ' نفسیاتی اثرات' اختراعی ذہانت اور غالب عزائم کے تصورات کے ذریعہ کی۔

شخصیت کا وہ تجزیہ جو ہم ابھی پیش کرنے والے ہیں' دوسرا طریقہ اختیار کرتا ہے اگرچہ ہم ان مشکلات سے آگاہ ہیں جو اس کے راستے میں ہمیں درپیش ہوں گی۔ یہ طریقہ انسان کو ماحول کا اتنا اثر نہیں سمجھتا جتنا کہ اسے ماحول بدلتے ہوئے دیکھتا ہے۔ ہر باغیچہ اور ہر طیارہ انسان کی فعالیت کی علامت ہے۔ شخصیت اس نقطہ نظر سے جبلی آرزوؤں کا مرکب ہے۔ یہ ان جبلتوں کا نظام ہے جو ماحول' پیشہ اور تجربہ سے متاثر ہوتی رہتی ہیں۔ ہم اس جگہ انسانی شخصیت کی بنیادی محرکات کی ایک فہرست پیش کرتے ہیں' جو انہیں اخذ کی ہوئی صفات سے ممیز کرتی ہے۔

شخصیت کا نقشہ

جبلتیں: ایجابی	جبلتیں: سلبی	عادتیں: ایجابی	عادتیں: سلبی	احساسات: ایجابی	احساسات: سلبی
غذا تلاش کرنا	احتراز	شکار	صفائی	بھوک	تنافر
		چیرنا پھاڑنا		ظلم	
		جمع کرنا		طمع	
		حرص			
لڑنا	فرار	قریب جانا	پسپائی	غصہ	خوف
		تجسس	تذبذب	حیرت	شک
		عمل	فکر		
		غلبہ	سپردگی	غرور	انکسار
عمل	سونا	کھیلنا	آرام کرنا	خوشی	تکان
میل ملاپ	تخلیہ	بولنا	خلوت پسندی	بزم آرائی	حیا
		تاثر پذیر			
		نقل			
		آرزوئے قبولیت		نخوت	شرم
تناسل	انکار	جنس مخالف کا قرب	منہ سرخ ہونا	جنسی آرزو	کسر نفسی
والدین کی دیکھ بھال				والدین کی محبت	

شخصیت کا نقشہ

یہ جبلتیں، عادتیں اور احساسات انسانی شخصیت کے عالم گیر اجزا ہیں۔ ہر مرد اور ہر عورت میں یہ اجزا ہوتے ہیں۔ ہم شخصیت اور مزاج میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں کیونکہ یہ اجزا، ایک ہی مقدار میں دو شخصوں میں کبھی ظاہر نہیں ہوتے۔ ہماری جنس اور ہماری نسل ہم میں خاصی جبلتیں پیدا کرتی ہے۔ ماحول یہ طے کرتا ہے کہ ہم کن چیزوں کی

جستجو کریں، اور کون سی عادتیں ڈالیں۔ خطرہ سے خالی ماحول غیض و غضب کے جذبہ کو خالی خولی رعب میں تبدیل کر دیتا ہے۔ خطرہ زیادہ ہو تو یہی جذبہ غضب، مکاری بن جاتا ہے۔ جبلت وہی ہے لیکن اس کا اظہار مختلف ہے۔ معمولی زخم فرار کو عقلمندی میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ ایک سخت زخم اسے بزدلی بنا دیتا ہے۔ اس طرح تمام تجربہ۔ تحریک اور امتناع کا عمل بن جاتا ہے۔ ہر روز کوئی میلان کامیابی کی وجہ سے مستحکم ہو جاتا ہے اور کوئی اور میلان، ناکامی یا بے عملی کے باعث ناتواں ہو جاتا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک شخص میں خفتہ صلاحیتیں موجود ہیں، جن میں سے ماحول ایک کو چن کر مضبوط بنا دیتا ہے۔ جس طرح مقناطیس لوہے کے ٹکڑوں کو لکڑی سے جدا کرتا ہے۔ اس لئے شخصیت کو بدلنے کا پہلا اصول یہ ہے کہ ماحول کو بدل ڈالو۔ اپنی شخصیت کے ساز کے غیر استعمال شدہ تاروں کو نئی طاقتوں کے زیر اثر لاؤ اور ان سے بہتر موسیقی پیدا کرو۔

ان عناصر کو زیادہ واضح کرنے کے لئے ہمیں ان کے متعلق چند اور باتوں کا بھی دھیان رکھنا چاہئے۔ یہ دیکھئے کہ ہر جبلت ایک بدنیاتی نظام کا نفسیاتی اظہار ہے۔ بھوک خالی اور بے تاب نلیوں کا نتیجہ ہے۔ جنگ اور فرار، بازوؤں اور ٹانگوں کے لئے بنے ہیں (لنکن نے کہا "اگر خدا نے ایک انسان کو کمزور ٹانگیں عطا کی ہیں تو وہ بھاگنے پر مجبور ہے") عمل کی جبلتیں (رینگنا، چلنا، دوڑنا، کودنا، پھینکنا وغیرہ) جسم کے تمام اعضاء کی ہم آہنگی کا اظہار ہیں۔ تناسل مجمد عناصر کا نتیجہ ہے اور اجتماعی ربط، جو کنبہ سے شروع ہوتا ہے۔ تناسل کا۔ ہر جبلت ہمارے طبعی نظام میں جڑ پکڑتی ہے اور شخصیت کی ہر تبدیلی جو ایک جبلت موخ کرتی ہے۔ بدن اور روح دونوں کو مجروح کرتی ہے۔

پھر یہ بھی دیکھئے کہ ہر جبلت کے ساتھ ایک جذبہ ملحق ہوتا ہے۔ یہ جذبہ جبلت کی طرح فطری اور گہرا ہوتا ہے۔ بھوک (جذبہ) غذا کی تلاش کے ساتھ وابستہ ہے۔ اور کراہت کا جذبہ احتراز کے ساتھ۔ اسی طرح پیکار کی جبلت کے ساتھ غصے کا جذبہ اور فرار کی جبلت کے ساتھ خوف کا جذبہ وابستہ ہے۔ اور یوں ہی تجسس کے ساتھ تحیر اور تذبذب کے ساتھ شک۔ غلبہ کے ساتھ غرور اور مغلوبیت کے ساتھ انکسار، عمل کے ساتھ خوشی اور آرام کے ساتھ تکان، بزم آرائی کے ساتھ ایک اجتماعی تسکین اور کبھی کبھی خلوت کے ساتھ ایک بے نام سکون۔ مجامعت کے ساتھ آرزو، پس پائی کے ساتھ شرم اور بچوں کی دیکھ بھال کے ساتھ مامتا کا جذبہ، ہر جبلت ہماری سرشت میں داخل ہے۔ اور ہمارے احساسات کی آگ سے ہماری فطرت کے اندر پیوست کی گئی ہے۔

آخر میں دیکھئے کہ ہر شخص میں تقریباً ہر جبلت کا تضاد موجود ہے۔ ایمپیڈوکلیس نے کہا تھا کہ ہر چیز کا مثبت اور منفی ہوتا ہے۔ جبلتوں کے بارے میں بھی یہ قول صحیح ہے۔ ہم غذا کی تلاش اور غیر صحت مند چیزوں سے احتراز کرنے کی جبلتوں سے آراستہ ہیں۔ لڑنے اور فرار کرنے، غالب آنے اور مطیع ہونے، تجسّس سے آگے بڑھنے اور شک سے ساکن رہنے، حرکت کرنے اور چیزوں کو توڑنے پھوڑنے، بیٹھنے، آرام کرنے اور سونے، محبوب کے قریب جانے اور مدافعت کرنے، خودنمائی کرنے اور محجوب ہونے، قیادت کرنے اور پیروی کرنے، کسی بات کی ابتدا کرنے اور نقل کرنے، بزم آرائی اور خلوت پذیری کی جبلتیں ہم میں ساتھ ساتھ موجود ہیں۔

۳۔ سلبی

یہاں ان عناصر کی تقسیم میں ہمیں انسانی شخصیتوں کے بنیادی امتیاز کا پتہ چلتا ہے ہم تاریخی واقعات کو سمجھنے یا اپنے ہمسائیوں سے روابط قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اگر ہم انسانوں کو خوش باش اور اداس یا نیک اور بد میں تقسیم کر دیں۔ قدرت اور تاریخ کے نزدیک صرف ایک ہی امتیاز قابل قبول ہے، اور وہ ہے ایجابی اور سلبی شخصیتوں کا امتیاز۔ ہم نیکی اور بدی کے امتیاز کی مدد سے ہزاروں عینی منصوبے بناتے ہیں لیکن حقیقت طاقت کے نقطہ نظر سے انہیں برباد کر دیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن میں ایجابی صلاحیتیں غالب ہوتی ہیں۔ ان میں قریب جانے، تلاش کرنے اور مغلوب کر کے ملکیت حاصل کرنے کے رجحانات حاوی ہوتے ہیں۔ ہم انہیں ایجابی شخصیتوں کا نام دیں گے۔ اور پھر وہ لوگ ہیں، جن میں سلبی محرکات غالب ہوتے ہیں۔ جن لوگوں میں تذبذب، فرار، گوشہ گیری اور اطاعت کے جذبات تسلط پاتے ہیں، ہم انہیں سلبی شخصیتوں کا نام دیتے ہیں۔ کسی کی شخصیت مکمل طور پر ایجابی یا سلبی نہیں ہوتی۔ یہ امتیاز مردانہ اور زنانہ کے امتیاز کی طرح بہت سے درجات اور امتزاجات کے امکانات کا حامل ہے۔ اگر ہم یہ کوشش کریں کہ ان شخصیتوں کے کمال کا تصور کریں تو ہمیں وہ حدود معلوم ہو جائیں گی جن کے درمیان شخصیت پھلتی پھولتی ہے۔

۱۔ سلبی شخصیت

سلبی شخصیت والے انسان کا قد عموماً چھوٹا ہوتا ہے، اور اگرچہ وہ اپنے چہرہ، ہیئت اور ذہن کے ہر حسن کی بے حد تعریف کرتا ہے وہ ہمیشہ اپنی جسمانی کم تری کے تکلیف دہ

احساس میں مبتلا رہتا ہے۔ وہ قد آور اور توانا مزدور یا صاحب عمل آدمیوں پر حاسدانہ نظر ڈالتا ہے۔ سلبی شخصیت میں جسم اور طاقت نہیں ہوتی۔ اس میں طاقت ور بننے کے لئے لو نہیں ہوتی۔

اسے کھانا کھاتے دیکھئے' اسے بالکل اشتہا نہیں ہوتی۔ وہ غذا کے بارے میں عموماً بہت حساس ہوتا ہے اور بہت جلد ناخوشگوار کھانوں سے متنفر ہو جاتا ہے۔ وہ ذبیحہ خانوں کا تصور کئے بغیر گوشت نہیں کھا سکتا اور مچھلی کے شکار کو بربریت سمجھتا ہے۔ وہ لذت اور شغف سے کھانا کھانے کی بجائے اسے پرندہ کی طرح چگتا ہے جس نے پہلی دفعہ کوئی کیڑا منہ میں لیا ہو۔ وہ احتیاط سے اپنی انگلیاں صاف کرتا ہے اور کھانے کے بعد ہمیشہ یہ سوچتا ہے کہ کہیں میں نے بیرے کو ناکافی ٹپ تو نہیں دیا۔ وہ ہوٹل سے اس توقع کے ساتھ باہر نکلتا ہے کہ اسے کوئی نہ دیکھے۔ لیکن ساتھ ہی اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہر شخص اسے دیکھ رہا ہے۔

وہ دوسروں کو اس طرح دیکھتا ہے کہ کوئی اسے نہ دیکھے۔ وہ اس کی آنکھوں کے علاوہ ہر چیز کو دیکھتا ہے اور اس کی طاقت اور نیت کا اندازہ کرتا ہے۔ اگر اسے ذلت یا خطرہ سے سابقہ پڑے تو وہ حیرت اور خوف سے کانپتا ہے۔ وہ فعال غصہ محسوس نہیں کرتا بلکہ ایک چڑچڑے غضب میں جلتا بھنتا رہتا ہے۔ اس کا تشدد ایک ایسے شخص کا نقاب ہے جو یہ جانتا ہے کہ وہ ہتھیار ڈال دے گا۔ وہ ذمہ داری اور آزمائش سے گھبراتا ہے اور اپنے گھر کے تحفظ اور سکون کا خواہاں رہتا ہے۔ وہ کتابیں بالخصوص خطرہ اور عمل کے افسانے اور عزم اور قوت کے فلسفے پڑھنا پسند کرتا ہے۔ وہ امریکی گلہ بان اور فوق البشر کا مدح خوان ہے' اور یہ سمجھتا ہے کہ اگر دنیا کے لوگ ذہین ہوتے تو اسے قیادت سونپ دیتے۔ اگر وہ کسی کام میں کامیاب رہے تو اس کامیابی کا ذمہ دار خود کو سمجھتا ہے۔ اگر وہ ناکام رہے تو اپنے آپ کو بے گناہ گردانتا ہے۔ یہ ماحول (یعنی دوسرے لوگوں) حکومت یا تقدیر کا قصور تھا کہ وہ ناکام رہا۔ وہ دنیا کے بارے میں مایوسی لیکن اپنے متعلق امید آفرینی سے کام لیتا ہے۔

پھر بھی بدن کی کوتاہیوں کے باعث اسے تخیل کی جو فراوانی میسر ہے وہ اس کی وجہ سے عظمت حاصل کر سکتا ہے۔ اس کا تخیل جسے عمل یا معروضی مشاہدہ کی تصدیق حاصل نہیں ہوتی' مابعد الطبیعات اور شعر و سخن کی دنیاؤں میں آزاد گھومتا ہے۔ اور اگر وہ کچھ عرصہ کے لئے نادیدہ اقلیموں کو ترک کر کے محنت کرے' تو وہ عینی حسن' یا عینی فلسفوں کی تخلیق کرتا ہے اور ادب اور فن میں نئی ہیئتیں پیدا کرتا ہے۔ یہ شخص اپنے کمال میں ایک

عظیم الشان فن کار بن سکتا ہے' اور زوال میں محض ایک سوچنے والا مفکر نہیں بلکہ فقط ایک ایسا شخص جس کی عادت سوچنا ہے۔ جوں جوں تہذیب ترقی کرتی ہے اور زندگی پیچیدہ ہوتی جاتی ہے اور جسمانی توانائی بقا کے لئے اتنی لازمی نہیں رہی' ہر شہر میں اس قسم کے خیالی لوگوں کی فراوانی ہے۔

اس قسم کے انسان میں عمل کے محرکات کم اور کمزور ہوتے ہیں۔ وہ کھیلوں کا شائق نہیں۔ فقط فکر اور زبان کے کھیل کھیلتا ہے۔ وہ صنعت ایہام پر طبع آزمائی کرتا ہے لیکن پانی میں تیرتا نہیں۔ وہ کھیل دیکھتا ہے ان میں شریک نہیں ہوتا۔ دیکھنا کرنے سے آسان ہے۔ آرام کرنے کی آرزو اس پر غالب رہتی ہے۔ اگر اسے گھوڑے کی سواری میسر ہے تو وہ چلتا نہیں۔ اگر وہ بیٹھ سکتا ہے تو کھڑا نہیں ہوتا۔ اگر وہ سو سکتا ہے تو جاگتا نہیں۔ اس لئے کہ وہ اچھی طرح سو نہیں سکتا۔ وہ اتنا بیدار نہیں رہا ہوتا کہ اسے نیند آئے۔ اس کے اعصاب تھک جاتے ہیں لیکن اعضاء نہیں تھکتے۔ اور چونکہ عمل اس کی قوتوں کو جذب نہیں کرتا اور جذبات' جسمانی عمل میں اظہار نہیں پاتے' وہ ہمیشہ بے کل رہتا ہے اور اسے کبھی سکون میسر نہیں آتا۔

فرار اور تعطل اس کی اصلیت ہیں۔ وہ تلخ حقائق سے احتراز کرتا ہے۔ وہ خوابوں کی دنیا میں پناہ لیتا ہے' جس میں وہ بہت سی فتوحات حاصل کرتا ہے۔ اس کا شرمیلا پن ایک خفیہ گوشہ گیری بن جاتا ہے اور اس کی گوشہ گیری ایک چالاک قسم کی ریاکاری ہوتی ہے جو عموماً فطری طور پر کمزور انسانوں میں پائی جاتی ہے۔ وہ ان معنوں میں نرم پسند بھی ہے کہ وہ خلوت سے گھبرا کو کبھی کبھی چند منتخب دوستوں کی محفل میں شریک ہوتا ہے۔ اگر اسے کبھی کوئی اس کی بات سننے والا مل جائے تو وہ اپنے آپ کو جنت میں محسوس کرتا ہے۔ قہوہ خانوں میں اس قسم کے لوگ اکثر جمع ہوتے ہیں۔ وہ عام قبولیت کا بھوکا ہوتا ہے۔ وہ کم ہمتی کی وجہ سے رسم و رواج کے ساتھ مطابقت پیدا کرتا ہے۔ اگرچہ اس میں رئیسانہ شعور عزت نہیں ہوتا۔ وہ کسی حد تک ایک جمہوری ضمیر کا مالک ہوتا ہے جو وفاداری سے اجتماع کے اخلاق کی نمائندگی کرتا ہے' وہ عموماً نرم دل' شفیق' شکرگزار' وفادار اور پراحترام ہوتا ہے۔ وہ ظلم نہیں کرتا اور نہ اس میں کوئی کھردرا پن ہوتا ہے۔ وہ جنسی بے راہ رویوں پر مائل ہوتا ہے' لیکن وہ صرف معمولی قسم کے جرائم کا مرتکب ہو سکتا ہے۔

یہ ہیں اس کی محرکات۔ وہ اس لئے ناتواں ہے کہ اس کے پاس کوئی ایسا مقصد نہیں ہوتا' جو اس کی زندگی کو وحدت میں منسلک کرے۔ وہ ہمیشہ بے قرار مگر قرار کا متلاشی رہتا

ہے۔ وہ ایک سے دوسرے منسوب ہے۔ اور ایک سے دوسری جگہ اپنی بے قراری کو پہنچ
ہے۔ وہ ایک ایسا جہاز ہے جو کبھی ساحل پر نہیں رکتا اور اس کا سامان سڑتا گلتا رہتا ہے۔
وہ باقاعدگی یا محنت کا اہل نہیں اور اگرچہ وہ کبھی کبھی مصروف نظر آتا ہے' وہ کسی معینہ
مقصد کے لئے جم کر کام نہیں کر سکتا۔ وہ نیت میں شدید مگر عمل میں تساہل پسند ہوتا ہے۔
وہ کبھی کبھی جذباتی شدت کا اظہار کرتا ہے جس سے توانائی کا دھوکا ہوتا ہے' لیکن وہ شدت
جلد ہی منتشر ہو جاتی ہے۔ وہ خواہشوں سے معمور مگر عزم سے خالی ہوتا ہے۔ آخر کار وہ
محبت میں جویندہ' ہونے کی بجائے وہ پابند ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ بظاہر اپنی محبوبہ کے قریب جاتا
ہے اور اس کی تسخیر کرتا ہے لیکن دراصل اس کی محبوبہ ایک سیاستدان کی غیر مرئی نزاکت
کے ساتھ اسے قابو میں لاتی ہے' درحقیقت' وہ اپنی تسخیر پر شرمسار ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ
شاید وہ ایک تخیلی محبت سے زیادہ محظوظ ہوتا۔ لیکن وہ تقدیر کے آگے سر تسلیم خم کر دیتا
ہے اور ایک وفادار اور محنتی شوہر بن جاتا ہے اور کبھی کبھی بچوں کا باپ بن جاتا ہے اور
اپنے بچوں کے لئے جان توڑ مشقت کرتا ہے۔ اس کی زندگی احساس زیاں سے تاریک ہو
جاتی ہے اور وہ یہ سوچتا ہے کہ اگر وہ پیدا نہ ہوا ہوتا تو بہتر ہوتا۔ اس احساس کے ساتھ وہ
وقت سے پہلے مر جاتا ہے۔

۳۔ ایجابی شخصیت

اس انسان کی شخصیت ایجابی ہے۔ اس کے پاس صحت' توانائی' لہو اور گوشت کی افراط
ہے۔ وہ دنیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال سکتا ہے اور اپنی کج کلاہی کو قائم رکھ سکتا ہے۔
اگر وہ آپ کو دیکھتا ہے تو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر۔ لیکن حقیقت میں وہ آپ کو نہیں
دیکھتا۔ وہ اپنے کام میں منہمک ہے اور اپنے مقصد میں مگن۔ وہ اشخاص میں نہیں' مقاصد
میں دل چسپی لیتا ہے۔ اس کی تمام ایجابی محرکات مضبوط ہیں۔ وہ شوق سے بے تکلف ہو
کر کھاتا ہے۔ اس کی اشتہا کی تسکین کے لئے ہزاروں جانور قربان کئے جاتے ہیں۔ زمین کی
زرخیزی کا محاصرہ کرنے کا یہ فطری رجحان ملکیت اور جلب منفعت کا ایک جنون بن جاتا
ہے۔ اس کا اصول ہے حاصل کرنا اور قابض رہنا۔ اور چونکہ وہ سلبی شخصیت سے زیادہ
کامیاب ہے۔ وہ ہر جدید قوم کو اپنے انداز شخصیت میں ڈھال دیتا ہے' یعنی اسے بے طرح
ہوس ناک بنا دیتا ہے۔ (یا غالباً اس کی بیوی بہت فضول خرچ ہے)۔
پچھلے زمانہ میں کوئی افسر' تاجر' ٹریڈیونین لیڈر یا انجینئر ہونے کی بجائے کوئی خواب یا

سپاہی ہوتا اور اس کی جنگ جوئی کی صفت ابھی تک قائم ہے۔ اگرچہ وہ آج کم شدید ہے اور پس پردہ کام کرتی ہے۔ وہ اسی طرح ایجابی ہے جیسے کہ اس وقت ہوتا تھا جب لوگ زرہ بکتر سے لڑا کرتے تھے۔ جنگ جوئی کی ہی صفت اس کے مقاصد کو توانائی بہم پہنچاتی ہے۔ اس کی آرزوئیں بزدلانہ خواہشات نہیں ہیں' بلکہ اٹل قوتیں ہیں۔ ان کی خاطر وہ ذمہ داریوں' خطروں اور بے پناہ مشقتوں کا بار اٹھاتا ہے۔ اس میں نیکی کم اور جرات زیادہ۔ ضمیر کم اور خودداری زیادہ ہے۔ اس کے مقاصد عظیم الشان ہیں۔ وہ پابندیوں کو حقارت اور انکسار کو شک کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کا سابقہ کسی ایسے شخص سے ہو جو اس سے زیادہ مضبوط اور مستقل مزاج ہو تو وہ اس کے سامنے جھکتا نہیں بلکہ رشک اور رقابت کے ساتھ اس کی عزت کرتا ہے۔ وہ اگر شکست کھاتا ہے تو جان توڑ لڑائی کے بعد۔

وہ جذبہ تجسس سے لبریز ہے۔ ہر چیز اسے دل کش معلوم ہوتی ہے۔ اور اس کا ذہن فعالیت کے ساتھ عجیب و غریب چیزوں سے کھیلتا ہے۔ اسے نظریوں سے کوئی شغف نہیں۔ اس کا ہر سوچ بچار براہ راست عمل اور اپنے مقصد سے متعلق ہوتا ہے۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی کہ کوئی شخص کیوں اعلیٰ ریاضی' شاعری' مصوری یا فلسفہ پر سر دھنتا ہے۔ اس کے برخلاف اگر وہ مفکر ہے تو وہ فکر اور عمل دونوں سے یکساں سروکار رکھتا ہے۔ وہ ارسطو نہیں سینیکا ہے۔ بارکلے نہیں' بیکن ہے' اور کانٹ نہیں والٹیر ہے۔

وہ فکر پر نہیں' عمل پر یقین رکھتا ہے۔ اور سیزر کی طرح یہ سمجھتا ہے کہ اگر کسی کام کا کوئی حصہ بھی ادھورا رہ جائے تو وہ کام مکمل نہیں ہوا۔ اسے پرشور زندگی پسند ہے۔ وہ دیہاتی سادگی اور امن کو پسند نہیں کرتا۔ وہ یہ سوچتا ہے کہ امن بڑھاپے کے لئے بنا ہے اور مرد کو اس سے گریز کرنا چاہیے۔ وہ رعب داب سے زندگی بسر کرتا ہے اور اس احساس سے اسے خوشی ہوتی ہے' کہ دوسرے انسان اینٹوں کی طرح ہیں۔ وہ انہیں ایک معمار کی طرح جیسے چاہے استعمال کرے۔ وہ اتنا خود اعتماد اور خوش طبع ہے کہ اکثر لوگوں کو اس کی قیادت قبول کرنے میں ایک پوشیدہ مسرت محسوس ہوتی ہے۔ اس کا پیہم عمل اسے صحت مند بناتا ہے اور اسے فکر اور پریشانی کی مہلت نہیں دیتا۔ وہ زندگی سے لطف اندوز ہوتا ہے اور ماضی اور مستقبل کے متعلق زیادہ نہیں سوچتا۔ وہ جنت الارض کے تصور کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتا ہے اور یہ خبر اس کے لئے عین اطمینان کا باعث ہو گی کہ سب انقلاب پسند کل صبح سولی پر چڑھا دیئے جائیں گے۔ اسے سب خیال پرستوں سے نفرت ہے یعنی ان لوگوں سے جو تقریریں کرتے ہیں مضامین لکھتے ہیں اور اپنے بلند مرتبوں کی بلندی سے بین

الاقوامی مسائل کو حل کرتے ہیں۔

لیکن بعض حالتوں میں یہ شخص بھی ایک صاحب فکر ہو سکتا ہے۔ شاعر یا مصور نہیں۔ فلسفی یا وہ سائنس دان نہیں جو اپنے کل پرزوں یا قدیم کتابوں میں گم رہتا ہے بلکہ ایک مخترع اور ایک معمار جو نئی ہیئتیں تعمیر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ایک انجینئر جو بڑے سے بڑے بڑے دریاؤں پر پل باندھتا ہے۔ ایک بت تراش جو سنگ مرمر میں زندگی پیدا کرتا ہے یا وہ سائنس دان جو کسی نئی حقیقت کی خاطر ساری دنیا کی مخالفت مول لینے کے لئے تیار ہے۔ پھر بھی جہاں وہ فکر کی ایک زندگی بسر کرتا ہے وہاں وہ عمل کی سینکڑوں زندگیاں گزارتا ہے۔

بالعموم وہ مدنی الطبع ہوتا ہے۔ وہ ہر شخص سے اچھی طرح ملتا ہے سوائے ان لوگوں کے جن کے خیالات عام نہج سے بہت مختلف ہوں' وہ شام کو خلوت چاہتا ہے' لیکن اس خلوت کا مفہوم گوشہ تنہائی نہیں بلکہ گھر کی خلوت ہے۔ وہ محاسبہ خاطر بہت کم کرتا ہے۔ اس کے ذہن میں الجھنیں کم ہوتی ہیں اور وہ کبھی نفسیات کا ذکر نہیں کرتا۔ جب اس کی بیوی اس دق کرتی ہے تو وہ کلب چلا جاتا ہے۔ جب کلب سے اکتاتا ہے تو اپنے آپ کو کام میں کھو دیتا ہے۔ اس کی فعال زندگی کی پابندیاں اس میں ذہنی انتشار نہیں پیدا ہونے دیتیں۔ وہ ایک صاحب عزم انسان ہے۔ اس کے یہاں عزم کا مفہوم عزائم کی کثرت نہیں بلکہ وحدت ہے۔ آرزوؤں اور خواہشوں کا انتشار نہیں جو باہم متصادم اور ایک دوسرے کو ختم کرنے پر آمادہ ہوں بلکہ ایک واحد مقصد کے رشتے میں منسلک' مقاصد کا ایک باربط نظام جو اس کی شخصیت کے کسی غالب اور مستقل تصور سے پیدا ہوا ہے' اس کا عزم ایک منظم عزم ہے۔ وہ امکانات کی حدود متعین کر کے مستقل مزاجی سے مقاصد اور ان کے وسائل کی تسخیر کرتا ہے۔ وہ مکمل کام کرتا ہے' ادھورے نہیں۔ وہ اپنی کوششوں میں اس قدر منہمک ہوتا ہے کہ وہ یہ نہیں سوچتا کہ دوسرے لوگ اس کے کام پر کیا تبصرہ کریں گے۔ وہ خاموش مزاج ہے۔ زیادہ باتیں نہیں کرتا۔ وہ قول یا عمل کی شدت میں اپنی طاقت ضائع نہیں کرتا۔ وہ والہانہ جذبات کا مالک ہوتا ہے۔ عظیم والہانہ جذبات جو ایک مقصد کے سانچے میں ڈھل کر ایک جذبہ بن جاتے۔ وہ بکھرے ہوئے جذبات نہیں جن کا انجام انتشار ہوتا ہے۔ وہ ضبط نفس کی لذتوں سے آشنا ہے۔ وہ فوری آرزوؤں اور محرکات پر قابو پاسکتا ہے اور اس طرح آہستہ آہستہ اپنی تکمیل کرتا ہے۔ اس کی تشکیل صحت اور ذہانت کے امتزاج سے ہوئی ہے۔

وہ محبت میں پہل کرتا ہے- اور راستی اور استقامت کے ذریعے جو اسے سب عورتوں کا محبوب بناتی ہے فتح پاتا ہے- وہ جلدی شادی کرتا ہے' کیونکہ وہ جلدی فیصلہ کر سکتا ہے- اور تجسس قرب کو محتاط پسپائی پر ترجیح دیتا ہے- اس کے نزدیک بیوی اور بچوں کی ذمہ داری تنہائی اور جنسی تنوع سے بہتر ہے- کنبے کی ذمہ داریاں اسے مضبوط بناتی ہیں- وہ جلال کے ساتھ جمال کا امتزاج کرنا جانتا ہے- اس کے بچے اس سے محبت ہی نہیں بلکہ اس کی عزت بھی کرتے ہیں- آخری عمر میں وہ آرام اور تفریح کا فن سیکھتا ہے اور بڑھاپے میں پوتوں اور نواسوں کے وجود سے نئی زندگی حاصل کرتا ہے- وہ مرنے سے پہلے اس بات پر کبھی شک نہیں کرتا کہ زندگی ایک نعمت تھی- اسے صرف اس بات پر افسوس ہوتا ہے کہ اسے زندگی کا کھیل اب نئے کھلاڑیوں کے سپرد کرنا ہو گا-

۴- شخصیت کی دوبارہ تعمیر کرنا

ہم نے دو مثالی خاکے پیش کئے ہیں اور اس طرح انسان کو مستحکم اور ناتواں میں تقسیم کر دیا ہے- اگر اس امتیاز کو قطعی سمجھا جائے تو ہمارے خاکے بے کار ہیں- اگر ہم انہیں ساتھ ساتھ رکھیں تو ہمارے لئے یہ آسان ہو گا کہ ہم اپنی شخصیت کا تجزیہ کریں اور اس کی ازسرنو تنظیم کر سکیں- کیا ہم ایک معمولی حد تک اپنے آپ کو سلبی صفات اور خامیوں سے منزہ کر سکتے ہیں- اور اپنے اندر وہ ایجابی استحکام پیدا کر سکتے ہیں' جو ہمارے دلوں کا پوشیدہ صنم ہے؟ کیا ہم سوچ سمجھ کی مدد سے اپنے قد و قامت میں اضافہ کر سکتے ہیں؟

اکثر لوگ اس سوال کا جواب ایک یاس آفریں "نفی" میں دیتے ہیں- ہمیں یہ بتایا جاتا ہے- کہ شخصیت ہماری تقدیر ہے اور ہم جو کچھ پیدائش کے وقت ہوتے ہیں تا دم آخر وہی رہتے ہیں- بسا اوقات شخصیت کی صفات' جسمانی حالت صحت اور تندرستی پر مبنی ہوتی ہیں- ان صفات کو کیونکر بدلا جا سکتا ہے-

لیکن کچھ شہادتیں ایسی ہیں' جو انسانی شخصیت کے اس جامد عقیدہ کو جھٹلاتی ہیں- ہمارے اپنے زمانہ کی تاریخ سلبی شخصیتوں کے ایجابی شخصیتوں میں بدلنے کی ایک نہایت حیرت انگیز مثال پیش کرتی ہے- پچاس برس گزرے کہ عورتوں کو مردوں کے مقابلہ میں سلبی سمجھا جاتا تھا' اور ان کو ان تمام ناموں سے یاد کیا جاتا تھا جو ہم نے کم زور شخصیت کو بیان کرنے میں استعمال کئے ہیں- ان کی جسمانی کم زوری ایک احساس کمتری کی بنیاد بن گئی تھی' جو ان کے اس پر تاسف کی شکل میں ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مرد کیوں پیدا نہیں ہوئیں-

اور اس تاسف کے اثر سے جو ان کے ذہن کے نہاں خانوں میں آگ کی طرح جلتا رہتا تھا' ان کی زبان کبھی کبھی شعلے برساتی تھی۔ وہ فطرتاً عمل کے معاملہ میں نرم روی سے کام لیتی تھیں۔ اور اگر کبھی کبھی وہ زبان درازی اور تیز گفتاری سے کام لیتیں تو یہ محض ان کی جسمانی کمتری کا ایک ردعمل ہوتا۔ بنیادی طور پر وہ صنف نازک ہی تھیں۔

عورت کی حیا اور تسلیم اس جسمانی اساس پر استوار تھی۔ مرد کی طرح۔ کارگری اس کے لئے مسرت آفریں اور ولولہ انگیز نہیں تھی۔ نسلاً بعد نسل اس کی تقدیر تھی' بچوں کی ماں بننا۔ وہ اپنے آقا کے سامنے سر تسلیم خم کرتی' محبت سے اس کی مار پیٹ برداشت کرتی' اپنے بدن کے ساتھ اپنا نام اور جائداد اس کے سپرد کر دیتی اور اس کی رضا پر راضی رہتی۔ زندگی اس کے لئے اندوہناک اور بے کیف تھی۔ اور وہ کبھی کبھی شعر و افسانہ میں جذب ہو کر اپنے لئے ایک روشن دنیا کی خیالی تخلیق کر لیتی تھی۔

اور پھر صنعت نے سے اپنے شکنجہ میں جکڑ لیا۔ اس کی زندگی میں تنوع سیلاب کی طرح داخل ہوا۔ اسے شخصی ذمہ داری اور اقتصادی خود اختیاری حاصل ہوئی۔ اسے اپنی محنت کی کمائی میسر آئی اور اس نے اپنے اخلاق کی خود تربیت شروع کی۔ اس نے مرد کے تفوق پر شک کرنا شروع کیا۔ اس نے مرد کو بنیادی طور پر قابل تسخیر پایا تھا۔ لیکن اب اسے یہ انکشاف ہوا جیسے مرد نے کچھ دیر پہلے انکشاف کیا تھا کہ جدید زمانہ میں سبک روکی جیت نہیں ہوتی اور جنگ میں زور آور کو فتح میسر نہیں آتی اور انتخاب جسمانی طاقت اور گوشت پوست کے ہاتھوں سے نکل کر ذہانت اور چالاکی کے ہاتھوں میں چلا گیا ہے۔ اسے یہ جان کر مسرت ہوئی کہ جسمانی کمتری کامیابی کے راستہ میں کوئی ناقابل عبور خلیج نہیں ہے اور یہ کہ دنیا کی بعض عظیم ترین شخصیتیں جسمانی طور پر بہت کمزور تھیں۔ اور پھر یہ بھی کہ ایک عورت بھی اپنے تنگ اور چست لباس اور دم گھونٹنے والی روایات کے باوجود قیادت اور طاقت حاصل کر سکتی ہے اور اپنی روح کی مالک بن سکتی ہے۔

اس لئے جب انقلاب عظیم آیا تو اس نے اپنی سلبی صفات ترک کر کے اس اپنے اندر ایجابی اوصاف پیدا کئے۔ وہ ایک شخصیت بن گئی جو پہل کرنے نظم و نسق اور معروضی فکر کی اہلیت رکھتی تھی۔ اس نے ہوس ملکیت پیدا کی اور دولت حاصل کرنے کے ہزاروں طریقے دریافت کئے۔ اس نے بازاروں کی گہما گہمی کی خاطر گھر کی خاموش کو ترک کیا اور پانی کی جگہ پاؤڈر استعمال کرنا شروع کیا۔ اس نے اپنے لباس میں قطع و برید شروع کی اور اپنا گلا اور گردن ننگی کر دی۔ عبادت کم کر کے وہ کھیل کود میں زیادہ دلچسپی لینے لگی۔ اس

نے اپنی نئی آزادی کی خوشگوار ہوا کو اپنے اندر جذب کرنا شروع کیا اور روحانی طور پر تومند اور بہادر بن گئی۔ تقریباً ایک ہی نسل میں اس نے غیر معمولی سرعت سے اپنے اندر ایجابی صفات پیدا کر لیں۔

مرد حیران رہ گیا اور اس نے "جدید عورت" کے متعلق اخلاقی قسم کا شکوہ شروع کیا۔ لیکن یہ انقلاب اس کی تدبیر و رضا کے بغیر آیا تھا اور اس کی اجازت کے بغیر جاری رہا۔ اس نے عورت کو صنعت، تجارت، تعلیم اور دیگر شعبوں میں اپنا مدمقابل پایا۔ یہ شعبے ازل سے اس کی ملکیت تھے۔ وہ کام اور عزم میں عورت کی اس خوداختیاری سے نالاں تھا۔ اس کا دل قدیم زمانہ کی باحیا دوشیزاؤں، انگور کی بیلوں اور بچوں کے ساتھ گھریلو قسم کی لذتوں کے لئے تڑپتا تھا۔ اس نے بہادری اور حیرانی سے اس حملہ کا مقابلہ کیا۔

وہ ناکام رہا۔ امریکہ میں عورت نے سلبی اطاعت سے ایجابی غلبہ تک کا عبوری دور تقریباً مکمل کر لیا ہے۔ باکرہ کی حیا اور ایفائے مناکحت کی قدیم صفات ختم ہو گئیں۔ اب مرد حجاب سے آنکھیں نیچی کرتا ہے اور جدید دوشیزہ کے ٹخنوں، پنڈلیوں، گھٹنوں اور دیگر پرکشش صفات کو پرحیا تحیر کے ساتھ دیکھتا ہے۔ "محبت اور وفا اور اطاعت" کے الفاظ اب شادی کی رسم سے خارج کر دیئے گئے ہیں۔ جلدی ہی یہ الفاظ بحال کر دیئے جائیں گے۔ لیکن اب یہ الفاظ مرد ادا کرے گا۔ مگر اب یہ الفاظ لایعنی ہوں گے۔

اس فوری انقلاب سے شخصیت کے بدلنے کے امکانات کا اندازہ لگایئے۔ ظاہر ہے کہ یہ صفات جنہیں ہم نے سلبی اور ایجابی کے نام دیئے ہیں، لابدی طور پر بدن کے ساتھ وابستہ نہیں۔ ہاں، ان کی اساس بدن کی توانائی اور ناتوانی ہے۔ لیکن وہ غیر محدود طور پر موقع اور ماحول سے بدلی جا سکتی ہیں۔ لاکھوں عورتوں نے اپنے اندر کم ہمتی سے جرات اور اطاعت سے غلبہ کی صفات پیدا کی ہیں۔ ظاہر ہے۔ کہ اگر ہم چاہیں تو شخصیت بدلی جا سکتی ہے۔

لیکن یہاں ہمیں کچھ مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ہم میں سے کچھ لوگ اپنی شخصیت کو بدلنا ہی نہیں چاہتے۔ ہم اپنے آپ کو اس قدر کامل محسوس کرتے ہیں اور اپنی خامیوں کو اتنا حسین سمجھتے ہیں کہ اپنی بنیادوں کی تھوڑی بہت مرمت کرنے کا خیال ہمیں ناخوشگوار معلوم ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ایک اخلاقی مسئلہ بھی وابستہ ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ایجابی شخصیت نیک بھی ہو۔ کوئی قوم جس میں فقط ایجابی قسم کے اولوالعزم انسان ہوں رقابت اور پیکار کا بیت الجنون بن سکتی ہے۔ ہمیں یہ تسلیم کر لینا چاہئے کہ ہم یہاں

نیکی کی تلقین نہیں کر رہے۔ اور ہمارے نسخے کسی قدر غیر اخلاقی ہوں گے۔ ... طور پر نیکی نہیں بلکہ طاقت پیدا کرنے پر زور دے رہے ہیں تو وہ اس لئے کہ شخصیت ... استحکام ایک اعلیٰ خوبی ہے۔ حالات کی درشتی لاکھوں شخصیتوں کو شکستہ اور لاکھوں ... تموں کر دے گی۔

اگر ہمیں اپنے آپ کو مضبوط بنانا ہے تو ہمیں سب سے پہلے عزم کا مطلب سمجھنا چاہئے۔ عزم کوئی ناقابل فہم حقیقت نہیں جو شخصیت کے عناصر میں وہ مقام رکھے جو آرکسٹرا میں کنڈکٹر کو حاصل ہوتا ہے۔ جو کبھی ایک طرف اور کبھی دوسری طرف جھکتا ہے۔ عزم انسان کی تمام محرکات اور رجحانات کے مجموعہ کا نام ہے۔ یہ محرکات جن سے شخصیت کا تانا بانا تیار ہوتا ہے' اپنے سے باہر کوئی قائد نہیں رکھتیں۔ انہیں محرکات میں سے کوئی مضبوط رجحان دوسروں پر غالب آتا ہے اور ان میں ربط اور وحدت پیدا کرتا ہے۔ اسے قوت عزم کہتے ہیں۔ یعنی ایک غالب آرزو دوسری آرزوؤں سے اس قدر بلند و ارفع ہے کہ وہ اس کی طرف کھنچی آتی ہیں' اور اس کے ساتھ ساتھ ایک ہی منزل کے حصول کے لئے چلنے کو تیار ہیں۔ اگر ہم کوئی ایسا غالب مقصد نہ پا سکیں جس کی خاطر ہم اپنے دل کی دوسری آرزوؤں کو قربان کر سکیں تو ہمیں وحدت میسر نہیں آ سکتی اور ہمارا انجام کسی دوسرے کے مکان میں ایک اینٹ بنا ہو گا۔

اس لئے وہ کتابیں پڑھنا بے کار ہے جو شخصیت کی تعمیر کی آسان راہیں سمجھاتی ہیں کیونکہ شخصیت کی تعمیر کی راہ دشوار گزار بھی ہے اور طویل بھی۔

یہ راہ زندگی کی راہ ہے۔ عزم' آرزوؤں کے ربط کا نام ہے۔ اور جیسا کہ شوپنہار نے کہا تھا' یہ پھلتی پھولتی زندگی کی مخصوص ہیئت ہے۔ اور اس کی توانائی اور مقام اس صورت میں بڑھتا ہے کہ زندگی نئے کاموں اور نئی فتوحات سے دوچار ہو۔ اگر ہم مضبوط بننا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنا مقصد اور اس کے حصول کے وسائل متعین کرنے چاہئیں۔ اور ہر دشواری کے باوجود اس سے وفا کرنا چاہئے۔ بہتر یہی ہے کہ شروع میں ہم وہ کام کریں' جس کے متعلق ہمیں اعتماد ہو کہ ہم کر سکتے ہیں' کیونکہ ہر ناکامی ہمیں ناتواں اور ہر کامیابی ہمیں مضبوط بناتی ہے۔ ایک کامیابی سے دوسری کامیابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ معمولی فتوحات سے ہمیں بڑی فتوحات کی طاقت اور اعتماد میسر آتا ہے۔ مشق سے عزم بنتا ہے۔ لیکن ہم ضرورت سے زیادہ محتاط بھی ہو سکتے ہیں۔ اور بڑی بڑی مہموں کی دعوت کو مسترد کر کے مستقل طور پر اپنے لئے ایک ادنیٰ مقام مقرر کر سکتے ہیں۔ اس بات پر نظر رکھئے کہ معمولی

لزمات آپ کو مطمئن نہ کریں۔ اپنی فتح کو ایک دن منا کر دوسرے دن کسی بہتر اور اعلیٰ کام کے لئے تیار ہو جایئے۔ خطرہ کا مقابلہ کیجئے اور ذمہ داری کا بوجھ اٹھایئے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ آپ کو پچھاڑ سکتے ہیں اور تباہ کر سکتے ہیں۔ لیکن کسی کی موت کی تاریخ کسی فلسفہ کے نقطہ نظر سے ایک نہایت معمولی تفصیل ہے۔ اگر خطرات اور ذمہ داریاں آپ کو ختم نہیں کر دیتیں تو آپ کو مضبوط بنا دیں گی اور آپ کو عظمت کی طرف ابھاریں گی۔ "بن جاؤ یا مر جاؤ!"

تجزیہ نفسی کا ایک ناقابل اعتبار دور ہمیں انسانی شخصیت اور تقدیر کی لچک کی ایک اور مثال پیش کرتا ہے۔ آڈلر کے روشن نظریہ کی رو سے کہ جینئس اور ذہنی مرضی کی بنیاد کوئی جسمانی خامی ہوتی ہے۔ جسم کا وہ نقص جو اپنی لابدی موجودگی سے روح کو مجروح کرتا ہے، اسے اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ اس خامی کو دور کرے۔ فرانسس بیکن نے کہا تھا "جس کسی کی شخصیت میں کوئی مستقل قابل تنافر صفت ہو، اس میں یہ پیہم تحریک موجود ہوتی ہے کہ اپنے آپ کو تضحیک اور استہزاء سے محفوظ کرے۔" اس لئے پاؤں پھرے بائرن نے پوری مہارت سے رقص کرنا سیکھا۔ اور اتنے گناہ کئے کہ سماج میں "شیر مرد" متصور ہونے لگا۔ ہکلا ڈیمو ستھینیز کامل مقرر بن گیا اور بیتھووون نے سماعت کھو کر لاثانی موسیقی پیدا کی۔ عورت نے اپنی جسمانی کمزوری اور محکومی کے خلاف "مردانہ احتجاج" کے ساتھ روایات اور مشکلات کی بیڑیوں کو توڑ پھینکا۔ آڈلر کہتا ہے کہ "فرد کا احساس کم تری اس میں ترقی کرنے کی آرزو پیدا کرتا ہے۔" جو لوگ پیچھے رہ جاتے ہیں، کوشش کر کے آگے بڑھتے ہیں اور دوڑ میں سبقت لے جاتے ہیں۔ مزدوروں کے طبقے میں سے بڑے بڑے مصنف پیدا ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی مریض جسموں نے اعلیٰ روحوں کو پناہ اور لذت بخشی ہے۔

۵۔ نسخہ

لیکن یہ ساری باتیں عمومی اور مبہم ہیں۔ ہمیں اپنے سوال کا ذرا زیادہ قریب سے غور کرنا چاہئے۔ سوال یہ ہے کہ ذہنی اور اخلاقی طاقت حاصل کرنے کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہئے؟

پہلے تندرستی تلاش کرو۔ باقی صفات خود بخود پیدا ہو جائیں گی۔ یا ان کی کمی اس قدر محسوس نہیں ہو گی۔ جیسا کہ نیٹشے نے کہا تھا "ایک شریف آدمی کا اولین فرض یہ ہے کہ کامل حیوان بنے۔" اس کے لئے لازمی ہے کہ ہم اچھے آباو اجداد کا انتخاب کریں۔ لیکن

چونکہ یہ انتخاب مشکل ہے اس لئے ہم کم سے کم اچھی غذا اور اچھی عادات کا انتخاب
کر سکتے ہیں۔ مولشاٹ نے کہا تھا کہ انسان کافی حد تک وہی کچھ ہے جو کچھ وہ کھاتا ہے۔
کھانے کے متعلق کوئی عالم گیر کلیہ قائم نہیں ہو سکتا۔ ہر شخص کو ان غذاؤں سے اجتناب
کرنا چاہئے جو اسے نقصان دیتی ہیں۔ جو چیز آپ کو نقصان دیتی ہے اس پر خط تنسیخ کھینچئے
اور اسے اپنے ہاضمہ کے قریب نہ آنے دیں۔ حتیٰ کہ خط تنسیخ کھینچتے، کھینچتے آپ ایسی
غذا پر پہنچ جائیں جو آپ کے معدہ کے لئے سکون بخش ہو۔ اور اگر آپ کے معدہ کا فضلہ
دوا کے بغیر خارج نہ ہو تو اپنے آپ سے یہ پوچھیں کہ وہ کون سا خطرناک مادہ ہے جو آپ
کو کمزور بنا رہا ہے۔ یہ سفید آٹا ہے یا کیک اور مٹھائیاں ہیں، یا وہ کھانا جس میں سبزی اور
پھل وغیرہ شامل نہیں۔ اپنے معدہ کو کھلا رکھئے اور منہ کو بند۔ یہی حکمت کی کلید ہے۔

اگر ہمیں اپنے آپ کو نئے سرے سے تعمیر کرنی ہے تو ہمیں معدہ سے ابتدا کرنی
چاہئے۔ اور پھر جسم کے ہر حصہ کو پھلنے پھولنے کی اجازت ملنی چاہئے۔ قدرت نے ہمیں
ارباب علم، کلرک، صحافی اور فلسفی بننے کے لئے پیدا نہیں کیا تھا۔ اس نے ہمیں اس لئے
پیدا کیا ہے کہ ہم حرکت کریں۔ بھاری وزن اٹھائیں، دوڑیں، کودیں پھاندیں۔ اس نے
ہمیں بازوؤں اور ٹانگوں کی زندگی بسر کرنے کی موزوں ساخت عطا کی۔ بہترین زندگی میں
جسمانی اور ذہنی مشاغل کا امتزاج ہوتا ہے۔ ولیم قیصر کی لکڑی کاٹنے کی عادت میں ضرور کوئی
حکمت ہو گی۔ لیکن یہ ایک ایسی عیاشی ہے جس کا ہر شخص متحمل نہیں ہو سکتا۔ زندگی اس
قدر پیچیدہ اور پرتقابل ہے کہ ہمیں عظمت حاصل کرنے کے لئے ایک ہی موضوع اور
مقصد پر طاقت اور وقت صرف کرنا پڑتا ہے لیکن ہمیں کم سے کم اپنے باغیچوں کی گھاس خود
کاٹنی چاہئے۔ اپنی باڑوں اور اپنے درختوں کو قطع و برید خود کرنی چاہئے۔ اور ہمیں گھر کے
ساتھ ایک باغیچہ بنانے کے لئے ہر ممکن قربانی کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ شاید کسی دن ایک
پورے باغ کی اصلاح کی فرصت مل سکے۔ صحت، شہرت سے کہیں بہتر ہے۔ کیونکہ فطین
جب تک زندہ رہتا ہے اندوہ میں مبتلا رہتا ہے۔ اور صرف مرنے کے بعد ہی مشہور ہوتا
ہے۔

صحت اور طاقت حاصل کرنے کے لئے ہمیں ایک نئے ماحول کی ضرورت ہے۔ اور یہ
بات ہمیشہ باعث تسکین ہوتی ہے کہ ہم اپنی وراثت کو نہیں بدل سکتے لیکن اپنے حالات کو
بدل سکتے ہیں۔ انیسویں صدی کے جبری فلسفے نے انسان کا تصور یوں کیا تھا کہ وہ وراثت اور
ماحول کا مرکب ہے۔ لیکن یہ خیال غلط ہے، کیونکہ انسان مرکب ہے وراثت، ماحول اور

اس عجیب ترقی پسند طاقت کا جسے ہم زندگی کہتے ہیں۔ یہ بات اس قدر صحیح ہے (اور ہم اسے لوح دل پر رقم کر سکتے ہیں) کہ جب تک ہم ان خارجی محرکات کو نہیں بدلتے جو لحظہ بہ لحظہ ہم پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ ہم اپنے آپ کو بنیادی طور پر نہیں بدل سکتے۔ کیونکہ یہ محرکات ہمیں اپنے سانچے میں ڈھالتی ہیں۔ ہم غلاظت پسند لوگوں میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یا ان ناخواندہ لوگوں کے درمیان' جنہیں فقط مادی اور غذائی اشیاء سے دل چسپی ہے؟ ہر حالت میں ہمیں ان لوگوں سے دور کسی بہتر صحبت کی تلاش میں چلا جانا چاہئے۔ کیا ہمارے قرب و جوار میں کہیں کوئی بہتر روح' بہتر ذہن یا مضبوط شخصیت موجود ہے؟ ہم اسے ڈھونڈ نکالیں اور کچھ عرصے اس کی صحبت میں رہیں تاکہ اس کی چال ڈھال کو اپنے لئے نمونہ بنا سکیں۔ اس کے بعد اس سے بھی عظیم شخصیتوں کی کھوج کریں۔ عظیم شخصیتوں کے کلام سے بہرہ اندوز ہونا اس سے کہیں بہتر ہے کہ ہم بے وقوفوں پر حکمرانی کریں۔ سیزر کا یہ قول غلط تھا کہ روما میں مقام ثانی حاصل کرنا اس سے کہیں بہتر ہے کہ ہم وحشیوں کی سرداری کریں۔

اگر (جیسا کہ بہت ممکن ہے آپ سوچتے ہوں) آپ کے حلقہ احباب میں آپ سے بہتر کوئی شخص نہیں' تو ماضی کی عظیم شخصیتوں سے صحبت قائم کریں۔ بہت تھوڑے داموں پر آپ ان کے خیالات سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ ان کا کلام سن سکتے ہیں' اور اس منزہ فضا میں اپنے آپ کو سمو سکتے ہیں' جو ان کی شخصیتوں کے گرد رہتی ہے۔ یہ فرض کرنا غلط ہے' کہ کتابوں کے پڑھنے والے پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ یہ اثر آہستہ آہستہ محسوس ہوتا ہے' اس پانی کی طرح جو آب درہ بناتا ہوا رستا ہے۔ لیکن ہر برس کے بعد اس کا اثر بڑھتا جاتا ہے اور کوئی شخص بھی عظیم شخصیتوں کی صحبت سے کچھ حاصل کئے بغیر نہیں اٹھتا۔ نپولین کی صحبت میں رہنے' والٹ وٹمین کے ساتھ چہل قدمی کرنے اور فریڈرک اور والٹیئر کے ساتھ نیم شبانہ صحبت طعام قائم کرنے کے مواقع کے باوجود ادنیٰ رہنے کی کوئی وجہ جواز نہیں۔

یہ تو رہا خارجی ماحول۔ داخلی ماحول کا معاملہ زیادہ ٹیڑھا ہے۔ کیونکہ کس قدر وحست مجسم ہیں ہم۔ آرزوؤں کا ایک خار زار! ہمیں کیونکر معلوم ہو کہ ہمیں کن پودوں کی آبیاری کرنا ہے اور کن بوٹوں کو مرجھانے دینا ہے؟

شخصیت کا پہلا اصول ہے وحدت۔ یہی بات گوئٹے کے ان الفاظ میں پوشیدہ ہے۔ "کل ہونا یا کل میں شریک ہونا۔" اور دوسرا اصول ہے جستجو کرو پسپا نہ ہو۔ یہ ہے نشوونما

کی راہ' جس سے کوئی عقل مند انسان نہیں بنتا۔ اگر بچے بھی تو اشتہی کو قاعدہ نہیں بنانہ جبلتوں کے پہلے گروہ میں صفائی کا خیال رکھنا چاہئے۔ اگرچہ یہ صفت تنافر کی سلبی جبلت سے پھوٹتی ہے۔ نیطشے کہتا ہے کہ بچے میں احساس صفائی کو ایک والہانہ جذبہ کی شکل دینی چاہئے۔ اس کے بعد وہ اپنے اندر ہر خوبی پیدا کر لے گا۔ صفائی کا درجہ فقط خدائی کے بعد ہے۔ اور اگر خداؤں کا وجود نہ ہو تو کیا؟ لیکن ہم راہب بننا نہیں چاہتے۔ ہم ہمیشہ اس دین دار سیاست دان کو پنہاں رشک سے دیکھیں گے جو دین داری کو اپنی اشتہا کی تسکین میں مخل نہیں ہونے دیتا۔

جبلت رزم اور خودداری کے متعلق بھی ہمارا یہی رویہ ہو گا۔ یہ خوبیاں ہیں برائیاں نہیں۔ ہم ان کی اس لئے قطع و برید کریں گے تاکہ وہ پھلیں پھولیں۔ جنگ جوئی نہیں' نخوت نہیں۔ نخوت آئندہ فتوحات کا تصور ہے اور خودداری گزشتہ فتوحات کی یاد۔ جنگ جوئی کم زور کی جبلت رزم ہے۔ رزم کا لازمی طور پر یہ مطلب نہیں کہ شوروغل مچایا جائے اور لپاڈگی کی جائے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خاموشی اور استقلال سے ایک مقصد کی جستجو کی جائے۔ آرزومند ہونے کا مطلب ظالم اور ہوس ناک ہونا نہیں۔ مضبوط آدمی "دینے" میں بھی وہی لذت محسوس کرتا ہے جو کمانے میں۔ وہ ملکیت پانے سے زیادہ تعمیر کرنے میں خوشی محسوس کرتا ہے۔ وہ گھر بناتا ہے تاکہ دوسرے اس میں رہیں اور پیسہ کماتا ہے تاکہ دوسرے خرچ کریں۔ شخصیت غیر معمولی طور پر اپنے اوپر خرچ کرنے سے نہیں بنتی۔ بلکہ تعمیر و تخلیق سے سنورتی اور نکھرتی ہے اور عمل سے پھلتی پھولتی ہے۔ ہم ان پیشوں سے احتراز کریں جن میں فقط فکر و تدبر ہی ہو۔ کچھ کرنے کا موقع نہ ملے۔ یہ بہتر ہے کہ آپ نجار بنیں اور سورج کی روشنی میں خوشبودار لکڑی کاٹا کریں اور ہتھوڑے کی ہر ضرب کے ساتھ چیزیں بنتے دیکھا کریں۔ بہ نسبت اس کے کہ آپ ہر روز نفع و نقصان کی خانہ پری کرتے رہیں یا کسی گوشہ تنہائی میں خارجی دنیا کی حقیقت کے لئے نئے دلائل وضع کیا کریں۔ یہ بہتر ہے کہ آپ ایک گیت گائیں بہ مقابلے اس کے کہ آپ سو گیت سنیں۔ آیئے ہم کھیلیں اور ہنسیں اور اگر کسی روز زندگی ایک تلخ مذاق معلوم ہو تو مذاق کو یاد رکھیں اور تلخی سے درگزر کر دیں۔

شادی کریں جیسا کہ کتاب مقدس میں لکھا ہے۔ شادی جلنے سے بہتر ہے' کیونکہ وہ ہمیں اپنے آپ کے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچنے کے قابل بناتی ہے۔ نیطشے جیسے ذہنی مریض کے لئے بہن بیوی سے بہتر تھی۔ لیکن ایک صحت مند مرد کے لئے بہن کا قرب

ناکافی ثابت ہوتا ہے۔ ایک دفعہ یہ بنیادی مسئلہ حل ہو جائے تو ہم دنیا میں ہر عورت کی ہر ادا سے متاثر ہوئے بغیر چل پھر سکتے ہیں۔ ہم یہ جان جاتے ہیں کہ لباس چاہے کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں' عورتیں بنیادی طور پر یکساں ہوتی ہیں۔ فلسفہ کی زبان میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مختلف مجازی صورتوں کے پیچھے حقیقت ایک ہی ہوتی ہے۔ اس طرح ہم کسی قدر مطمئن ہو جاتے ہیں اور اپنی بیویوں سے محبت کرنا سیکھ لیتے ہیں۔ شاید یہ صحیح ہو کہ ایک شادی شدہ مرد پیسے کے لئے سب کچھ کر گذرتا ہے لیکن ایک شادی شدہ مرد ہی دلچسپیوں کے اس تنوع کے قابل ہو سکتا ہے۔

دوست بنائیے ! اگر آپ سے یہ نہیں ہو سکتا تو اپنے آپ کو ایسا بنانے کی کوشش کیجئے کہ آپ دوست بنا سکیں۔ تنہائی ایک دوا ہے۔ صحت کی خاطر ایک روزہ ہے' لیکن غذا نہیں ہے جیسا کہ گوئٹے نے کہا تھا۔ شخصیت' دنیا کے بہاؤ کے ساتھ بہہ کر ہی بنتی ہے۔ اگر ہم فقط خود نگری سے کام لیں تو کہیں کے نہ رہیں' چاہے ہمارا واحد شغف نفسیات ہی ہو۔ مستقل طور پر اپنے اندر دیکھنا اسی طرح خطرناک ہے جیسے ٹینس کے کھیلنے والے کے لئے کھیلتے وقت فاصلے' رفتار' زاویہ اور ضرب کے متعلق سوچتے رہنا یا پیانو بجانے والے کے لئے بجاتے ہوئے انگلیوں کی حرکات پر غور کرتے رہنا۔ دوست اس لئے مفید ہیں کہ وہ ہماری باتیں سنتے ہیں' اس لئے بھی کہ وہ ہم پر ہنستے ہیں۔ ان کے ذریعے ہمیں کسی حد تک معروضیت' منکسرالمزاجی اور خوش خلقی کا سبق ملتا ہے۔ ہم زندگی کے کھیل کے قواعد سیکھتے ہیں اور اس کھیل کے بہتر کھلاڑی بن جاتے ہیں۔ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ لوگ آپ سے پیار کریں تو انکسار پیدا کیجئے۔ اگر آپ تعریف کرانا چاہتے ہیں تو خودداری سے کام لیجئے۔ اگر آپ محبت اور تعریف دونوں کے متمنی ہیں تو اپنے اندر خارجی انکسار کے ساتھ داخلی خودداری پیدا کیجئے۔ لیکن خودداری بھی منکسرالمزاجی بن سکتی ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص اسے نہ دیکھے اور نہ سنے۔ بہت زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کیجئے چست فقرے' اگر وہ دل آزاری کا باعث بنیں تو قابل نفرت ہوتے ہیں۔ ہمارا اصول یہ ہونا چاہئے کہ کسی شخص کو غلط ثابت نہ کریں۔ وہ ہمیشہ اس کی بناء پر دل میں کینہ رکھے گا۔ "کچھ نہیں" دنیا کی مفید ترین چیز ہے۔ اکثر اوقات یہ ایک اچھا کام ہے اور ہمیشہ ایک اچھی بات ہے۔ سچی بات کہنے کے متعلق پریشان نہ رہیں۔ آپ سماج کے رواجوں کو قبول کیجئے تاکہ آپ اس کے قوانین کے ساتھ کبھی کبھی بے باکانہ طور پر پیش آ سکیں۔ سماج آپ کو سب کچھ کرنے کی اجازت دے سکتا ہے بشرطیکہ آپ اسے خوش اسلوبی سے کریں اور اس کا چرچا نہ

کریں۔ خاموشی سے آگے بڑھیے اور غیر ضروری عداوت مول نہ لیجئے۔ آگے بڑھتے ہوئے تجربہ کا خیر مقدم کرتے ہوئے زندگی کو اکساتے ہوئے کہ وہ آپ کو ہمیشہ لبریز رکھے' اس سے پیشتر کہ آپ اسے خیرباد کہیں اور زندگی کے شعلہ کو اپنے بچوں کی حفاظت میں چھوڑ جائیں۔

لیکن اس پورے بیان میں ذہانت کہاں ہے؟ کیا شخصیت فقط جبلتوں کا کھیل ہے جس میں عقل اور تخیل شریک نہیں ہو سکتے؟ کاش ایسے ہوتا۔ کیونکہ اس طرح شخصیت ایک آسان مسئلہ ہو جاتی اور فقط مضبوط جذبوں سے مضبوط انسان بن جاتے۔

لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ اور ایک کامل روح میں تخیل اس طرح جلوہ افروز ہوتا ہے جس طرح آگ میں روشنی۔ ہم تصورات میں کھو سکتے ہیں لیکن ہم دور بینی سے بڑی بڑی فتوحات بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ ایمرسن کہتا ہے کوئی جنگ لڑنے سے پہلے نپولین یہ کم سوچتا کہ فتح پانے کے بعد وہ کیا کرے گا..... وہ یہ بات زیادہ سوچتا تھا کہ شکست کھانے پر وہ کیا کرے گا۔ "جب میں کسی لڑائی کا منصوبہ بناتا ہوں تو میں ہر ممکن خطرہ اور مصیبت کو بڑھا چڑھا کر تصور میں لاتا ہوں۔" تخیل ہمیں برباد کر سکتا ہے' جس طرح اس نے نپولین کو ۱۸۱۲ء میں برباد کیا تھا' یا عمل سے پہلے بہت سے امکانات کا جائزہ لینے سے ہمیں ہزاروں بربادیوں سے بچا سکتا ہے۔

عقل کا وظیفہ یہ ہے کہ وہ عمل کی راہ نمائی کرے۔ جب یہ بذات خود ایک شغل بن جائے تو ہملٹ اور منطقی پیدا کرتی ہے۔ جنگ کا کوئی فیصلہ نہیں ہوتا' اور عضلات اور شخصیت گلتے سڑتے رہتے ہیں' اور جب یہ ایک آرزو کا دوسری آرزو سے کھیل' ایک جبلت کی دوسری جبلت پر تنقید' ایک جذبہ کا دوسرے جذبہ سے احتساب بنتی ہے تو انسان اس اعلیٰ مقام پر پہنچتا ہے' جہاں اس کے عناصر ادھر ادھر گھوم پھر کے ایک وحدت' ایک ربط میں یک جا ہو جاتے ہیں' اور ایک مربوط زاویہ نظر میں اور جامع طرز عمل میں جلوہ افروز ہوتے ہیں۔

ہماری جبلتیں ہمارے بادبانوں کے لئے ہوا کا کام کرتی ہیں۔ لیکن اگر وہ بغیر کسی روک ٹوک کے الگ الگ کام کریں تو وہ ہمیں غلاموں کی طرح اپنے پیچھے گھسیٹتی لے جائیں گی۔ کس نے وہ انسان نہیں دیکھا۔ جو فقط ہوس یا فقط جنس یا فقط جنگ یا فقط پرگوئی یا فقط کھیل ہے؟ ہر جبلت کے لئے کامل آزادی شخصیت کو ختم کر دے گی' جس طرح اس نے سائرس کے نوجوانوں کو تباہ کیا تھا۔ جنہیں عورتوں نے پالا اور ان کی ہر خواہش کی تسکین کی اور

اس طرح وہ کمزور انحطاط پذیر انسان بن گئے۔ اس لئے آرزو پر علم کے اثر میں جو خرد کی جان ہے، شخصیت کی تنظیم کے سامان موجود ہیں۔ ہمیں ان دو راہوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہے، دنیا ہماری تربیت کرے یا ہم خود اپنی تربیت کریں۔ شخصیت جیسا کہ مل نے کہا تھا۔ "ایک مکمل طور پر منظم عزم" کا نام ہے۔

ترکیب ہمیشہ تجزیہ سے مشکل ہوتی ہے۔ نفسیات نے ابھی تک انسانی فطرت کا شیرازہ یکجا نہیں کیا، جسے اس نے علیحدہ بکھیر رکھا ہے۔ انسان کو بیان کرنا آسان ہے لیکن یہ بتانا کہ اسے کیا بننا چاہئے یا وہ کیونکر بدل سکتا ہے مشکل ہے۔ ہم نے ایک عظیم مضمون کے فقط ایک پہلو سے بحث کی ہے، جو ہمارے عہد میں بہت سے روشن اذہان کو اپنی طرف کھینچے گا۔ ہمارے پاس علم ہے۔ اب ہمیں فن کی ضرورت ہے تاکہ ہم اپنے آپ کو از سرنو بنائیں، جس طرح ہم نے براعظموں اور سمندروں کو اپنے عزائم کے تابع کیا ہے، لیکن علم طاقت ہے اور ہر سائنس آخرکار ایک فن بن جاتی ہے تاکہ اس کے نتائج مملکت انسانی کو وسیع کریں۔ آئندہ نسل میں لوگ اسی طرح دل و دماغ کی تعمیر کریں گے جس طرح وہ آج جہازوں اور طیاروں کی تعمیر کرتے ہیں۔ انسانی جبلتیں، جو اس بدلتی ہوئی دنیا میں ساکن اور جامد رہی ہیں، اختراعات کی اس تیز رفتار کائنات میں شعوری طور پر نئے سانچوں میں ڈھل جائیں گی۔ اب بھی انسان کی ذہنی طاقت بہت بڑھ گئی ہے۔ حتیٰ کہ آج کا ایک اعلیٰ دماغ بنیادی طور پر کسان کے سادہ ذہن سے مختلف معلوم ہوتا ہے، کسی دن، ہمارے ذہن، ہمارے آلات کے، ہماری حکمت، ہمارے علم کے اور ہمارے مقاصد، ہماری صلاحیتوں کے مطابق ہو جائیں گے۔ اس وقت ہم انسانوں کی طرح زندہ رہیں گے۔

حصہ پنجم: جمالیات

باب سیزدہم

حسن کیا ہے؟

۱۔ فلسفیوں کا جمالیاتی شعور

اناطول فرانس نے کہا: "میں نہیں مانتا کہ ہم کبھی بھی پوری طرح یہ جان سکیں گے کہ کوئی چیز کیوں کر حسین بنتی ہے۔" اس عظیم فن کار اور عالم کا یہ خیال شاید ہمیں مسئلہ جمالیات سے منحرف کر دے۔ پھر بھی ہم اس مسئلہ کی پیروی کریں گے تو محض اس خیال سے کہ فلسفہ میں کوئی بات تیقن سے نہیں کہی جا سکتی۔

یہ عجیب سی بات ہے کہ فلسفہ اور نفسیات نے اس مسئلہ پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ ہر دل حسن کی پکار سنتا ہے لیکن حسن کی توجیہہ چند ہی لوگ کرتے ہیں۔ وحشی لوگوں کو موٹے ہونٹوں اور گہرے زخموں میں حسن نظر آتا ہے۔ یونانیوں کو حسن، شباب اور توازن میں دکھائی دیتا تھا اور رومیوں کے نزدیک تناسب، عظمت اور طاقت کا نام حسن تھا۔ احیائے علم نے اسے رنگ میں دیکھا اور جدید روح کو یہ موسیقی اور رقص میں اس کا جلوہ نظر آیا۔ ہر جگہ اور ہر زمانہ میں لوگ کسی نہ کسی حسن سے متاثر ہوئے ہیں اور اس کی کھوج میں انہوں نے کئی زندگیاں صرف کر دی ہیں لیکن صرف فلسفیوں نے اس کی فطرت معلوم کرنے اور اس کی طاقت کا راز دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہ مسئلہ دراصل نفسیات کا مسئلہ ہے۔ لیکن ماہرین نفسیات نے اسے فلسفہ کے سپرد کر رکھا ہے اور ہر سائنس اپنے ان مسائل کو فلسفہ کے سپرد کر دیتی ہے جنہیں وہ خود حل نہیں کر سکتی (اس لئے اہم ترین مسائل فلسفہ کے ماتحت آتے ہیں اور اس کے پاس بے کیف ہونے کی وجہ جواز کم ہے) جدید سائنس کا تعصب مادیت اس کے تمام واقعات کے مقداری قوانین نے اسے حسن کی طرح کے غیر مرئی حقائق کے متعلق بے بس بنا دیا ہے جب تک کہ حیاتیاتی نظریہ کو نفسیات قبول نہیں کرتی۔ جمالیات کے مسئلہ کا صحیح مقام

متعین نہیں ہو سکتا۔ فی الحال فلسفہ کو یہ حق حاصل ہے کہ ان معاملات میں دخل دے جن میں سائنس دخل دینے سے ڈرتی ہے اور جب حسن کچھ دیر کے لئے حقیقت کی جگہ لیتا ہے۔ اور حکمت میں ایک گوشہ قبولیت تلاش کرتا ہے' تو مابعد الطبیعات کی سوکھی ہڈیاں کسی قدر لرز اٹھتی ہیں۔

تاہم فلسفیوں نے اس دل فریب مضمون کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی' اور اسے گوشہ گمنامی میں چھوڑ دیا۔ اس میں فطرت پرستی کے کچھ عناصر موجود ہیں' جو مذہبی لوگوں کے مزاج کو راس نہیں آتی تھی۔ اس کی نوعیت اس قدر غیر معقول ہے کہ متشکک عقل پرست اس سے متاثر نہیں ہوئے۔ باؤم گارٹن نے جو پہلا مفکر تھا جس نے حسن کی فطرت کو ایک علیحدہ موضوع سمجھ کر اسے جمالیات کا نام دیا۔ اس نے اسے فلسفہ کے مضامین میں شامل کرنے کی معذرت کی۔ یقیناً اسے اندیشہ تھا کہ نام کو ایک علمی انداز دینے کے باوجود اس کے فلسفہ کے ناظروں کا ذہن اصنام اور حسین عورتوں کی طرف منتقل ہو گا اور اس امکان پر اسے ایک طرح کی شرمندگی سی تھی۔

حتیٰ کہ قدیم یونان میں جہاں حسن کی تخلیق کثیر و وافر تھی اور وہ محترم بھی سمجھا جاتا تھا اور فلسفی اس کے حسین میلان کی گہرائیوں تک پہنچنے میں ناکام رہے۔ پائتھاگورس نے جمالیات کا کھیل' موسیقی کو ریاضی کی نسبتوں میں تحلیل کر کے کھیلا' اور کائنات کو ایک توازن سے منسوب کیا۔ سقراط سے قبل کے یونانی ڈاروِن سے پہلے کے سائنس دانوں کی طرح حسن کو طبیعات اور ریاضی کی اصطلاحوں میں تحلیل کرتے تھے موسیقی ان کے نزدیک اصوات کی ترتیب تھی' اور مرئی حسن متناسب نسبتوں کی ترتیب کا دوسرا نام تھا۔

افلاطون۔ جو بنیادی طور پر ایک ماہر اخلاق تھا (جو اپنے ہم وطنوں کے انحطاط کو روکنا چاہتا تھا) دوسری انتہا پر چلا گیا اور اس نے حسن کو نیکی کا مترادف قرار دیا۔ فن اس کے خیال میں اخلاقیات کا ایک حصہ تھا اور موسیقی کے تعلیمی فوائد کے سوا اس کی جنت الارض میں فنون لطیفہ کا دخل کم ہی تھا۔ ارسطو کے فلسفہ میں ہمیں اس سوال کا جواب ملتا ہے۔ حسن' توازن' تناسب اور ایک مربوط کل میں اجزا کی فطری ترتیب کا نام ہے۔ یہ وہ تصور ہے جو "جزو کے کل سے ربط" کے اس تصور کے ساتھ خوش گوار طور پر ہم آہنگ ہے' جو ہم نے ان ابواب میں بیان کیا ہے۔ اور یہاں ہم کلیہ طرازی کی ترغیب کی مدافعت نہیں کر سکتے۔ لیکن توازن اور تناسب' نظم اور وحدت روح کو کیوں مسرور کرتی ہیں؟ یہ سوال ہمیں ہمارے کلیوں کی زد سے پرے لے جاتا ہے۔

وکلمین اور لیسنگ نے ان جوابوں پر کچھ اضافہ نہ کیا اور اس مسئلہ میں ونا...
ادھا دھند قیادت منظور کر لی۔ حسن و جمال کا مسئلہ ساخت اور ہیئت، ترشے ہوئے ...
مرمر اور پہاڑیوں پر ابھرتے ہوئے مندروں کا مسئلہ رہا۔ اور یہ پار تھینون اور ...
آرائشوں کے لئے مخصوص بن گیا۔ یہ حقیقت کہ کوئی صنم کسی گرم اور زندہ حسن کی نقل
ہے، اور حسن کا راز نقل سے زیادہ اصل میں مضمر ہے۔ ان درشت اور علمی ذہنوں کے
لئے قابل قبول نہیں تھی۔

کانٹ اور شوپنہار کے یہاں ایک نئی لے سنائی دیتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حسن وہ صفت
ہے جس کے ذریعے کوئی چیز، اس کے فوائد سے قطع نظر ہمیں پسند آتی ہے۔ جو ہم میں
ایک بے عزم تفکر، ایک بے غرض مسرت کو اکساتی ہے۔ اس معروضی اور غیر جانب دار
مشاہدہ میں شوپنہار کے نزدیک جمالیاتی اور فنی کمال کے اسرار پنہاں ہیں۔ ذہن کچھ وقت کے
لئے آرزو سے آزاد ہو جاتا ہے اور ان افلاطونی اعیان کا شعور پیدا کرتا ہے۔ جو عالم ...
عزم، کے خارجی پہلو ہیں۔ لیکن ہیگل ہمیں پھر یونانیوں کی طرف لوٹا کر لے جاتا ہے۔ حسن
پھر کثرت میں وحدت، مادہ کی ہیئت کے ذریعے تسخیر اور کسی الہیاتی مقصد کے حسیاتی اظہار
میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ تو یہ کیا عجب ہے کہ دنیا کی سب سے زیادہ بے کیف کتابیں حسن
کے بارے میں لکھی گئی ہیں۔

۲۔ حیوانوں میں جمالیاتی احساس

ممکن ہے کہ یہ نظریہ سرے سے غلط ہو۔ غالباً حسن، زندگی کا وظیفہ ہے۔ مادہ اور
ہیئت کا نہیں۔ شاید جہاں ریاضی اور طبیعات ناکام رہے ہوں۔ حیاتیات ہماری مدد کرے۔
آیئے ہم حیوانوں کا مطالعہ کریں اور احساس حسن کے سرچشمہ تک پہنچیں۔ ہمارا یہ
خیال غلط ہے کہ فقط انسان ہی کو جمالیاتی احساس ودیعت کیا گیا ہے۔ بہت سے حیوان اس ...
بے پر وبال دوپائے سے زیادہ حسین ہیں۔ جو دنیا پر حکومت کرتا ہے اور غالباً وہ ہمیں
حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ احساس حسن فقط ہم رکھتے ہیں کیونکہ ہم
حسن کو نظر اور بینائی کے ساتھ وابستہ کرتے ہیں۔ حیوانوں میں جمالیاتی لرزش شامہ کے
ذریعے پیدا ہوتی ہے۔ موسیو برجرٹ کا کتا کہتا ہے کتے کی بو، نہایت لذیذ بو ہے۔ اس کے
لئے انسانوں کی بو یقیناً نہایت ناخوشگوار ہو گی۔
تاہم حیوانوں کے لئے حس سامعت میں بھی حسن ہو گا۔ ہمارے بعض چوپائے آباؤ

اجداد موسیقی کے لئے خاص حساسیت رکھتے ہیں۔ ہیولاک ایلس لکھتا ہے۔ "چڑیا گھر میں مختلف حیوانوں پر جو تجربات کئے گئے ہیں۔ وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ سوائے چند سگ ماہیوں کے کوئی بھی موسیقی کے حس سے بے نیاز نہیں تھا اور سب کے سب کی بد آہنگ لے کو ناخوشگوار محسوس کرتے تھے' ایک شیر جو وائلین سن کر کسی قدر تسکین حاصل کرتا تھا' پکولو سننے پر غضبناک ہو گیا۔ اکثر حیوانوں کو وائلین اور بنسری پسند تھی۔ ایلس کا کتا۔ شوپاں کے ایک خواب آسا نغمہ پہ بھونکتا رہا۔ لیکن جب ایک نغمہ شادی بجا تو وہ سو گیا اور ڈین سوفٹ کہتا ہے: "کیا ایلین ہمیں یہ نہیں بتاتا کہ لیبیا کی گھوڑیاں موسیقی سن کر گاڑیوں میں جتنے کے لئے تیار ہو جاتی تھیں" (باحیا خواتین کو اس واقعہ سے اوپیرا زیادہ جانے کے خلاف سبق حاصل کرنا چاہئے)۔

حیوانوں کی آنکھیں بھی حسن کی حساسیت رکھتی ہیں۔ ڈارون کہتا ہے "کہ کچھ پرندے اپنے گھونسلوں کو رنگین پتوں اور گھونگوں' پتھروں اور پروں اور کپڑے کے ان ٹکڑوں سے سجاتے ہیں۔ جو انسانوں کے گھروں میں پائے جاتے ہیں" مرغ فردوس اپنے شریک زندگی کے لئے خاص گھونسلا بناتا ہے جو گھنی جھاڑی سے ڈھکا ہوتا ہے اور اس کے فرش پر گھاس پھونس چنی ہوتی ہے' وہ قریبی چشمہ سے سفید کنکر لا کر فن کارانہ طریق پر دو رویہ رکھتا ہے وہ دیواروں کو چمک دار پروں' سرخ بیریوں اور دوسری خوب صورت چیزوں سے آراستہ کرتا ہے۔ آخر میں وہ دروازے کو دریائی صدفوں اور درخشاں سنگریزوں سے ایک حسن و وقار بخشتا ہے یہ وہ قصر ہے جو مرغ فردوس اپنی محبوبہ کے لئے تیار کرتا ہے۔ بوش کہتا ہے! "صرف ایک مرتبہ اس محل کو دیکھنے سے یہ یقین ہو جاتا ہے کہ حسن و جمال سے لطف اندوز ہونا اس پرندے کی فطرت میں داخل ہے" کچھ پرندے اپنے آپ کو آئینہ میں دیکھتے ہیں۔ آئینہ کو سورج کی روشنی سے چمکایئے تو بہت سے چکاوک جمع ہو جائیں گے۔ باوجود گولیوں کی بوچھاڑ کے یہ پرندے اندھی آرزو سے متوالے ہو کر اس کی جانب بڑھیں گے۔ مینا' پہاڑی کوا اور دوسرے پرندے' چمک دار اشیاء چاندی اور جواہرات چراتے ہیں۔ خود پسندی تجسس یا ہوس۔ کون انہیں اس حرکت پر مجبور کرتے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا۔ لیکن بالا چیزوں میں حسن دیکھنے کی صلاحیت صرف چند جانوروں میں پائی جاتی ہے۔ اور ان کا جمالیاتی شعور معمولی اور ثانوی ہوتا ہے۔ اس حساس فکر مندی کے مقابلہ میں جو نر مادہ کے سامنے عہد تناسل میں خود نمائی کے لئے ظاہر کرتا ہے۔ ڈارون کہتا ہے "اکثر حیوانوں میں احساس حسن صرف جنس مخالف کی کشش تک ہی محدود ہوتا ہے۔"

ہمارے مطالعہ کے لئے اس منکسرالمزاج سائنس دان کا یہ سادہ قول نہایت مفید ہے اگر ڈارون صحیح کہتا ہے تو یہ بات ظاہر ہے کہ احساس حسن، جنسی کشش سے پیدا ہوتا ہے حسین چیز وہ ہے جسے ہم جنسی طور پر پسند کریں اور اگر دوسری چیزیں ہمیں حسین معلوم ہوں تو وہ محض ثانوی طور پر اور جمالیاتی احساس کے اس سرچشمہ سے وابستگی کی بنا پر حسین معلوم ہوتی ہیں۔ جب شوپنہار اپنے مضمون "حسین کی مابعدالطبیعات" میں اپنے مخصوص انداز میں کہتا ہے "حسین چیز سے لذت اندوز ہونا عزم سے تعلق کے بغیر کیونکر ممکن ہے؟" اس کا جواب ہے کہ یہ ممکن نہیں۔ حسین چیز پوشیدہ طور پر ہمارے عزم سے وابستہ ہے، اور شوپنہار کے اپنے مفروضوں کے مطابق فرد میں بنیادی عزم، عزم تناسل ہے۔

۳۔ بنیادی حسن۔ اشخاص

سب سے پہلے کوئی چیز اس لئے حسین ہے کہ ہم اس کی آرزو کرتے ہیں۔ ہم کسی چیز کی اس لئے آرزو نہیں کرتے کہ وہ حسین ہے۔ بلکہ ہم اسے اس لئے حسین سمجھتے ہیں کیونکہ وہ ہماری آرزو کا مقصد ہے۔

کوئی چیز جو ہماری فطرت کے کسی اساسی احتیاج کو پورا کرتی ہے اس میں جمالیاتی [illegible] دینے کے امکانات موجود ہیں۔ بھوکے انسان کے لئے کھانے کا ایک طشت اسی قدر حسین ہے جتنی کہ ایک خوش خور طالب علم کے لئے ایک بالغ عورت۔ طالب علم کو ذرا بھوکا رکھیئے تو حسین سے حسین عورت کے لئے اس کا ذوق بھی کند ہو جائے گا۔ وہ اسے صرف کھانے کی ایک اچھی چیز سمجھے گا۔ (یہ بنیادی بھوک ہمیشہ ہماری محبت میں قائم رہتی ہے) اس مصنف کے لئے جس نے کئی برس اپنی تصنیف کے چھپنے کی آرزو کی ہو۔ اس کی پہلی شائع شدہ تصنیف اسے اس قدر حسین معلوم ہو گی کہ کوئی ذہین قوم اسے ضائع کرنا گوارا نہیں کرے گی۔ لیکن ایک کسان یا کارندے کے لئے جو کتابیں لکھنے سے زیادہ صحت مند آرزوئیں رکھتا ہے، یہی صفحہ اس ردی کاغذ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا جس سے وہ اپنا استرا صاف کر سکتا ہے۔ حسین چیز وہ ہے جو اپنے ادنیٰ مظاہر میں اس چیز کا حیاتی پہلو ہے جو ہماری کسی قوی آرزو کی تسکین کرتی ہے۔ درحقیقت وہ مفید چیز سے محض شدت حاجت میں مختلف ہے۔ نیٹشے نے کہا تھا کہ حسین اور قبیح حیاتیاتی تصورات ہیں۔ جو چیز نسل کے لئے مضر رہی ہے بدصورت ہے۔ ہم شکر اس لئے نہیں کھاتے کہ وہ میٹھی ہے بلکہ اس لئے کہ اس میں ہمیں طاقت کا ایک اہم ماخذ ملتا ہے۔ تمام مفید چیزیں کچھ وقت کے بعد حسین

بن جاتی ہیں۔ مشرقی ایشیا کے لوگوں کو گلی سڑی مچھلی پسند ہے اس لئے کہ یہ واحد غذا ہے جس میں انہیں نائٹروجن ملتی ہے۔ سدرلینڈ کہتا ہے کہ "آسمان اس لئے نیلا نہیں کہ ہماری آنکھوں کو خوشگوار معلوم ہو لیکن ہماری آنکھیں آسمان کی نیلاہٹ سے خوگر ہو کر اسے پسند کرنے لگی ہیں۔ تمام ہیئتیں اور رنگ ہمیں اسی قدر لذت پہنچاتے ہیں' جس قدر کہ وہ ہماری نسل کے تجربہ میں عام ہو چکے ہوں۔ سبز گھاس اور نیلا آسمان حسین ہیں۔ لیکن عادت ایک سبز آسمان اور نیلی گھاس کو بھی ہمارے لئے پسندیدہ بنا سکتی تھی۔

ظاہر ہے کہ حسن' افادہ کے برعکس تسلین کی شدت سے وابستہ ہے جو آرزو کی شدت کی آئینہ دار ہے۔ کنجوس کے لئے مال و زر مفید نہیں۔ حسین ہیں۔ ہر وہ چیز حسین ہے جو شخصیت کو متحرک اور توانا بنائے۔ اسی لئے روشنی' ترنم اور نرم لمس حسین ہیں۔ بدصورتی ہماری توانائی کو کم اور ہمارے ہاضمہ اور اعصاب کو خراب کرتی ہے۔ کراہیت پیدا کرتی ہے' دانت کھٹے کرتی ہے' یا شاعروں کو انقلاب کی دعوت دیتی ہے' سینٹانا کہتا ہے کہ حسن لذت معروضی ہے۔ یا جیسا کہ سٹینڈھال نے غیر شعوری طور پر ہابز کی پیروی میں کہا تھا کہ "حسن لذت کا امکان ہے۔"

جس طرح قوموں میں فن افراط دولت اور بے کار طبقہ کی نمود کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح فرد میں بھی فن اس وقت پیدا ہوتا ہے جب اسے بھوک نہیں ستاتی اور جنسی تحریک بڑھ جاتی ہے۔ اس کا وفور احساس حسن میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔ ہمارا احساس حسن ہماری جنسی قوت کے ساتھ گھٹتا بڑھتا ہے۔ محبت اسی قدر حسن کی تخلیق کرتی ہے جس قدر کہ حسن محبت کی تخلیق کرتا ہے۔ ہر عاشق اپنی محبوبہ کو حسین ترین عورت سمجھتا ہے۔ ڈی گورمونٹ کہتا ہے "ایک بھدے مینڈک سے پوچھئے کہ حسن کیا ہے؟ تو وہ جواب دے گا کہ میری مادہ جس کی دو گول آنکھیں اس کے ننھے سرے سے نکلی ہوتی ہیں۔ جس کا منہ چپٹا' پیٹ زرد اور پیٹھ بھوری ہے۔"

حسن اس قدر واضح طور پر محبت سے متعلق ہے کہ وہ جنس انسانی میں جسم کے ان حصوں پر مبنی ہے جن کی حیثیت ثانوی جنسی صفات کی ہے ——— مثلاً سینہ' بال' کولہے' جسم کے دل آویز خطوط اور نرم و گداز آواز۔ اپنے مردوں کی نظر میں زیادہ دل آویز بننے کے لئے ادنیٰ نسل کی عورتیں مصنوعی طور پر ان حصوں کو بڑھا دیتی ہیں۔ اور اعلیٰ نسل کے لوگ کچھ عرصہ کے لئے اخفا کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ کیونکہ اخفاء مبالغہ کی طرح موثر ثابت ہوتا ہے۔ لباس پہننا (حیا کی طرح) حسن میں اضافہ کرتا ہے۔ کیونکہ یہ مدافعت

کی ایک صورت ہے اور مدافعت آرزو کو بھڑکاتی ہے۔ سنتیانا کہتا ہے "...
نہیں اتار سکتیں۔ کیونکہ ان کی صفات ہی ان کی ذات ہوتی ہیں۔" غالباً سنتیانا نے ...
اندازمیں یہ بات کہنے کی کوشش کی ہے کہ جدید مہذب اور تخیلی زمانہ میں ...
لئے لازمی ہے۔

ہماری نسل کے لئے عورت کا حسن' حسن کی بہترین صورت ہے جو دوسری صورتوں کا سرچشمہ اور معیار ہے۔ تائیس میں پاپنوچے کا تصور اس سے کہتا ہے "میں عورت ... ہوں۔ بے وقوف' تو مجھ سے بھاگ کر کہاں جائے گا؟ تو میری مثال پھولوں کی ... میں' کھجور کے درختوں کے کیف اور حسن میں۔ کبوتروں کی پرواز' غزالوں کی ... کی لہروں اور چاند کی نرم اور لطیف روشنی میں دیکھے گا۔ اگر تو آنکھیں بند کر لے تو مجھے اپنے اندر پائے گا۔"

اگر یونانی معیار اور محرکات غالب رہتے تو مرد کا حسن ہمارے جمالیاتی شعور پر مسلط رہتا۔ یونانی دوستی یونانی محبت پر غالب تھی۔ اسپارٹا اور ایتھنز میں حسن کا آدرش خوب صورت اور بہادر جوان تھا۔ اس لئے یونانی آرٹ کامل مرد کی رفعت کا آئینہ دار تھا اور اس میں کھیل کے میدان کی جھلک نظر آتی تھی۔ لیکن ہمارا احساس حسن ہمارے دور کی زندگیوں پر عورت کے غلبہ کی عکاسی کرتا ہے اگر کبھی کبھی مرد کا حسن ہمیں اس زمانہ میں بھی متاثر کرتا ہے تو وہ اس لئے کہ محبت کا وہ عنصر تقویت پکڑے جس کا اظہار دوستی کے رابطہ میں ہوتا ہے۔

عورت حسن کا سرچشمہ اور معیار اس لئے بنتی ہے کہ اس کے لئے مرد کی محبت' عورت کی مرد سے محبت کے مقابلہ میں زیادہ گہری اور مختصر ہوتی ہے اور مرد کی آرزو کی شدت عورت کے بے پناہ حسن کی تخلیق کرتی ہے۔ عورت مرد کے اس تصور کو تسلیم کرتی ہے کہ وہ مرد سے زیادہ حسین ہے اور چونکہ وہ ملکیت پانے سے زیادہ محبوب بننے کی خواہش مند ہے اس لئے وہ اپنے اندر ان پرکشش صفات کو اجاگر کرتی ہے جو آرزو کو تند و تیز بناتی ہیں۔ نیز یہ کہ عورت مرد میں حسن تلاش نہیں کرتی اور نہ اپنے محبوب میں اس کا تصور کرتی ہے وہ اس میں طاقت اور بچوں کے تحفظ کی صلاحیت ڈھونڈتی ہے اور یہ قابلیت کہ وہ دنیا کے خزانے اس کے قدموں میں لا ڈالے۔

حسن کی آرزو سے وابستگی کی ایک عمدہ علامت یہ ہے کہ جب محبوب چیز حاصل ہو جاتی ہے تو اس کے حسن کا احساس کم ہو جاتا ہے' بہت کم مرد اس فلسفیانہ صفت کے مالک

ہوتے ہیں کہ اس چیز کو بھی چاہیں جو ان کے پاس موجود ہے اور اس سے بھی کم لوگ اس چیز میں حسن پاتے ہیں جو آرزو کو متحرک نہیں کرتی۔ اکثر زندگیاں یونہی بسر ہوتی ہیں۔ تاہم اگر موت ہم سے ہمارے شریک زندگی چھین لے یا کوئی زندہ دل جوان ہماری ملکیت پر بامعانہ نظریں ڈالے تو آرزو پھر سے بھڑک اٹھے گی اور مردہ حسن کو جلا دے گی۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ وہی چہرہ جو ہمارے لئے بے کیف ہو چکا ہے۔ کسی اور شخص کی آنکھوں کے لئے، جو تواتر اور اعادہ سے تھک نہ چکی ہوں۔ رومان و شعریت کا مجسمہ بن سکتا ہے۔ خدا ہمیں یہ صلاحیت عطا کرے کہ ہم اپنے شریک زندگی کو اس طرح دیکھ سکیں جس طرح دوسرے انہیں دیکھتے ہیں۔

۴۔ ثانوی حسن ۔ فطرت

محبت حسن کی ماں ہے اس کا بچہ نہیں، وہ چیزوں کے نہیں انسانوں کے اساسی حسن کی واحد ماخذ ہے۔ لیکن ہم ان لاکھوں چیزوں کے حسن کی کیونکر توجیہہ کر سکتے ہیں۔ جو ہمیں حسین معلوم ہوتی ہیں لیکن ان کا محبت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا؟ ہم خارجی دنیا کے بے پناہ حسن کی وضاحت کیونکر کریں؟

جس طرح ہماری لغات میں بعض الفاظ کے معنی اساسی اور بعض کا ثانوی ہوتے ہیں، اسی طرح ہر جبلت کے بنیادی اور ثانوی مقاصد اور لذات ہوتی ہیں۔ غذا حاصل کرنے کی جبلت ملکیت کی عام جبلت بن جاتی ہے، جو ہر باقدر چیز کو حاصل کرنا چاہتی ہے۔ غذا یا محبوب کے لئے لڑنے کی جبلت ایک عام جبلت پیکار بن جاتی ہے، جس میں لڑنا آپ اپنا انعام ہے۔ اس طرح جمالیاتی جذبہ بھی محبوب سے محبوب کے ساتھ متعلق چیزوں اس کی عادات و اطوار اس کے قول و فعل کے انداز اور اس کی مملوکہ اور مشابہ چیزوں پر پھیل جاتا ہے۔ تمام دنیا محبوب کے حسن میں شرکت کرنے لگتی ہے۔

ان چیزوں پر غور کرو جو ہمارے لمس کو حسین معلوم ہوتی ہیں۔ مدور چیزیں عزم اور ملائم متحرک نہ خمیدہ چیزیں، یہ ہمیں کیوں لذت دیتی ہیں؟ کیا محض اس لئے کہ وہ مدور، ملائم یا خمیدہ ہیں؟ اور ایک مربع بعض اذہان کے لئے حسین ہو سکتا ہے۔ جس طرح ارسطو کے لئے وہ عمل کی علامت تھا، یا کیا ہم مدور اور خمیدہ اور ملائم اشیاء کو اس لئے پسند کرتے ہیں کہ وہ ہمیں محبوب جنس کے جسمانی خطوط کی یاد دلاتے ہیں۔

ذرا حسن شامہ پر غور کرو۔ ہم صاف جسموں کی پاکیزگی، پھولوں کی خوش بو یا خوش بو

کی مستی سے کیوں لذت اندوز ہوتے ہیں؟ کیا اس لئے کہ جنسی انتخاب پہلے شامہ کے ذریعہ کام کرتا تھا؟ پھول پودوں کے تناسلی عناصر کو محفوظ رکھتے ہیں' اور ہماری محبوب خوشبوئیں (ترکیبی کیمیا کے وجود سے پہلے) بعض قربانی کے جانوروں کے اعضائے تناسل سے نکلتی تھیں۔ ہر عورت دلوں کو مسخر کرنے والی خوشبوئیں استعمال کرنے کے فن سے واقف ہے۔

ذرا حسن سامعہ پر غور کرو' ہمارا حسن صوت کا تصور دراصل محبوب کی آواز اور نغمہ سے پیدا ہوا ہے۔ "عورت میں نرم آواز ایک نہایت حسین شے ہے۔" اور اس سے پیار سے زیادہ خوش آئند اور جاذب ہو سکتا ہے ایک درشت آواز سے کسی سڈول جسم کی جاذبیت آدھی رہ جاتی ہے۔ مانٹے گازا کہتا ہے کہ کچھ عورتوں کی آوازیں نہایت تکلیف دہ ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس عورت بقول ایلس ایک باریش نر آواز کو پسند کرتی ہے۔ کیونکہ بالعموم وہ حسن سے زیادہ طاقت کو پسند کرتی ہے اور مرد کی پرشوکت آواز جو کہ قوت کے جنسی انتخاب سے پیدا ہوئی ہے تحفظ اور فراوانی کی ضامن ہے۔

ممکن ہے کہ آواز ابتدا میں جنس کی پکار ہو۔ ایک حساس کان مینڈکوں کے ٹرانے اور پرندوں کے چہچہانے میں' ہومر کی شاعری کی متنوع موجیں اور شیکسپئر کے تصور کے سمندر سن سکتا ہے۔ آواز سے نغمہ پیدا ہوا۔ جو لازمی طور پر محبت سے وابستہ ہے (اگرچہ مذہب اور جنگ نے اسے کسی قدر چرا لیا ہے) نغمہ سے رقص پیدا ہوا۔ جو کہ محبت کی ایک رسم ہے اور نغمہ و رقص نے موسیقی سے جنم لیا۔

اس عشقیہ ابتدا سے موسیقی دور دراز تک پھیل گئی اور ابھی تک وہ اپنے سرچشمہ سے وابستہ ہے۔ اور کوئی لڑکی اس کے بغیر محبت نہیں کر سکتی۔ وہ لڑکی جو موسیقی کے ذریعہ اظہار محبت کرتی ہے' شادی کے بعد چند برس تک پیانو کے قریب نہیں پھٹکتی جب ایک حیوان مسخر ہو چکا ہو تو اسے اور مسحور کرنے سے کیا فائدہ؟ مرد جو اپنی محبوبہ کے سامنے بلند آواز سے گیت گاتا تھا' شادی کی کڑی ذمہ داریوں کے بوجھ کے تلے دب کر اپنی موسیقی کی صلاحیتیں کھو دیتا ہے۔ اور محض مجبوراً "سڑے وشکی' شوئن برگ اور رچرڈ سٹراؤس کی محبت میں بیٹھتا ہے۔

لیکن فقط محبت حسن سامعہ کے ان پہلوؤں کی توجیہہ نہیں کر سکتی۔ ترنم کی لذت ایک خودمختار عنصر ہے۔ تنفس کی آمدورفت دل کی دھڑکن حتیٰ کہ جسم کا دو طرفہ توازن ہمیں آواز کے مترنم زیر و بم کی طرف مائل کرتا ہے اور صرف جذبہ محبت ہی نہیں بلکہ ساری روح اس سے تسکین پاتی ہے۔ ہم گھڑی کی "ٹک ٹک" اور قدموں کی باقاعدہ چاپ میں

ترنم تلاش کر لیتے ہیں۔ ہم جھولنے' رقص' شعر' بازیگری اور صنعت تضاد سے لذت اندوز ہوتے ہیں۔

موسیقی اپنے ترنم سے ہماری ڈھارس بندھاتی ہے اور اپنے فراز میں ہمیں ان دنیاؤں میں لے جاتی ہے جو اس دنیا سے کم ظالم ہیں۔ یہ دکھ کو دور کر سکتی ہے' ہاضمہ کو بہتر بنا سکتی ہے' محبت کی تحریک کر سکتی ہے اور مفرور دیوانوں کو پکڑنے میں مدد دے سکتی ہے' اس کے ذریعہ پیراگوئے کے یسوعیوں نے انڈین غلاموں کے کام میں اضافہ کیا اور اس کی تلخی کو کم کر دیا۔ اس کے ذریعہ ایک سپاہی ایک مترنم تسکین کے ساتھ موت کے منہ میں جا سکتا ہے۔ ہائیڈین نے کسی جرنیل سے زیادہ ہیپس برگ خاندان کی خدمت کی اور یہ کوئی نہیں جانتا کہ زاروس کی فوجوں کی ہمت ان کے عظیم قومی ترانے کی کس قدر رہین منت تھی۔ تھورو کا خیال تھا کہ موسیقی سے زیادہ انقلاب آفریں کوئی چیز نہیں اور وہ حیران تھا کہ ہمارے دوسرے ادارے اس کی کیونکر تاب لا سکتے ہیں۔ تھورو ایک انقلابی تھا۔ موسیقی ہمیں انفعال کی کیفیت میں ڈھال سکتی ہے یا عمل پر آمادہ کر سکتی ہے۔ ٹالسٹائے نے گورکی سے کہا تھا: جہاں تم غلام رکھنا چاہو۔ وہاں تمہیں زیادہ سے زیادہ موسیقی بہم پہنچانی چاہئے۔ کیونکہ موسیقی ذہن کو کند کر دیتی ہے۔ یہ بوڑھا روسی پیورتن افلاطون سے قطعی اتفاق کرتا' جس کی جنت للارض میں کوئی شخص سولہ برس کی عمر کے بعد موسیقی سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا تھا۔

آخر میں ذرا حسن بصارت پر غور کرو' جب انسان نے قد استوار پایا تو شامہ نے اپنی طاقت اور قیادت کھو دی اور بصارت نے جلد ہی جمالیاتی احساس پر غلبہ پا لیا حسن بصارت بھی حسن سامعہ کی طرح ایک محبوب عورت کے حسن سے بہت دور ہے اور ہم پھر مسئلہ جمالیات کے مرکز پر پہنچ گئے ہیں۔ خمیدہ خطوط توازن و تناسب اور کثرت میں وحدت' محض حسن کا سبب ہیں۔ یا نتیجہ؟ وہ بنیادی حیثیت رکھتے ہیں یا ثانوی؟ کیا ہم عورت سے اس لئے محبت کرتے ہیں کہ وہ توازن' وحدت اور ہر پرکشش رنگ کا مجسمہ ہے؟ یا یہ صفات جہاں بھی ہم "انہیں دیکھیں ہمیں اس لئے متاثر کرتی ہیں کہ یہ ہمیں زن کامل کی یاد دلاتی ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ "اس عورت کی گردن بطخ کی مانند ہے۔" اور اس طرح ہم بطخ کو حسن کا معیار بنا دیتے ہیں۔ غالباً شروع میں ہم یہ محسوس کرتے تھے کہ اس بطخ کی گردن ایک حسین عورت کی گردن کی مانند ہے۔ حسین چیز وہ ہے جس سے محبت کی جائے۔ غالباً فن کا سرچشمہ حیوان یا انسان کی یہ صلاحیت ہے کہ وہ ان رنگوں کی نقالی کرتے ہیں جو

قدرت زمانہ تناسل میں طائر و حیوان میں پیدا کرتی ہے اور جو محبوب کی نظروں سے ...
چمکتے دمکتے ہیں۔ جیسا کہ ہم دیکھ آئے ہیں پرندہ اپنے گھونسلے کو آبدار چیزوں سے سجاتا
اور مرد اپنے جسم کو روشن رنگوں سے آراستہ کرتا ہے جو آرزو کو بھڑکاتے ہیں۔ جب ...
پہننے کی صلاحیت پیدا ہوئی تو رنگ جسم سے منتقل ہو کر لباس پر آ گئے' لیکن ان کا مقصد
تھا کہ وہ نظروں کو اپنی طرف کھینچیں' اور سرخ رنگ ایک ایسا رنگ تھا جو خون میں سب
سے زیادہ حرکت پیدا کرتا تھا۔ اس طرح نغمہ اور رقص' موسیقی اور بت تراشی کی تخلیق
محبت سے پیدا ہوتی ہیں' بت تراشی ایک ایسا فن ہے جو خود مختار معلوم ہوتا ہے اور وہ اس
لئے کہ اس کی جاذبیت کا راز حسن میں نہیں بلکہ رفعت میں مضمر ہے۔

رفعت کا حسن سے وہی تعلق ہے جو نر کا مادہ سے ہے اس کی لذت عورت سے
محبوب جمال سے نہیں بلکہ مرد کی ممدوح توانائی سے پیدا ہوتی ہے۔ عورت غالباً رفعت سے
زیادہ متاثر ہوتی ہے اور مرد حسن سے زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ وہ اسے استعمال میں زیادہ تیز۔
اس کی آرزو کرنے میں زیادہ شدید اور اسے تخلیق کرنے میں زیادہ مستقل مزاج ہے۔ جیسا
کہ برک نے ہمیں بتایا ہے رفعت' ایک محفوظ شخص کے لئے زیادہ خطرناک اور طاقت ور
ہوتی ہے۔ ہنی بال اور سیزر نے ایلپس کی رفعت پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ ان کے لئے ان
کی حیثیت منظر حسن کی نہیں' مجسمہ دہشت کی تھی' ان کی اس مردانہ بے نیازی سے روح
کی نسائی حساسیت کا مقابلہ کیجئے جس نے جدید انسان کی روح کے لئے ایلپس کو دریافت
کیا۔ اسے ان ویران بلندیوں پر فوجیں نہیں چڑھانا تھیں۔ غالباً (جیسا کہ سرجی کہتا ہے)
یونانیوں نے فطرت کی مصوری اس لئے نہیں کی کہ فطرت ان کے لئے ایک خطرہ تھی' جسے
وہ بے نیاز ہو کر نہیں دیکھ سکتے تھے۔

مناظر فطرت کی تحسین میں حسن سرچشمہ محبت سے بہت دور جا نکلتا ہے۔ مناظر
فطرت کو دیکھنے سے ہمیں جو لذت حاصل ہوتی ہے وہ مردانہ رفعت کی وجہ سے ہے لیکن
اس میں سے بیشتر اس مطمئن حسن سے پیدا ہوتی ہے جو کسی حسینہ کی آغوش میں پر خروش
سکون سے مشابہ ہے' ذرا کورو کو دیکھئے سرسبز لہلہاتے کھیت' سایہ دار شاہ بلوط اور وہ ندیاں
جو جھکی ہوئی شاخوں کے نیچے خراماں ہیں۔ اس فطری لذت میں عورت کا حسن کہاں پنہاں
ہے؟

ہمیں ایک ایسا کلیہ تلاش کرنے کی فکر نہیں کرنی چاہئے جو ساری دنیا پر حاوی ہو۔
فطرت ان کلیوں سے متنفر ہے جو اس کے غیر محدود تنوع کو نظر انداز کرتے ہیں۔ فطرت

ہمارے عالم گیر اصولوں کی ہزاروں استثنائیں ہو سکتی ہیں۔ ہمیں صرف اس بات سے مطمئن ہو جانا چاہئے کہ کوئی احساس جو دراصل جنسی ہو ان چیزوں پر پھیل جاتا ہے جو محبت سے قطعی طور پر غیر متعلق ہیں۔ جنس کی بڑھتی ہوئی توانائی اپنے وفور کو دیار منظر میں صرف کر سکتی ہے۔ جس طرح وہ مذہب، دوستی، اجتماعی خدمت اور فن کی آبیاری کرتی ہے۔

لیکن یہاں بھی ہمیں باریک رشتے ملیں گے۔ ایک بچہ زمین اور آسمان کے حسن سے متاثر نہیں ہوتا، محض نقل اور تعلیم کے ذریعہ ان سے لذت اندوز ہوتا ہے۔ لیکن جب محبت روح کو گرماتی ہے تو ہر قدرتی چیز حسین معلوم ہونے لگتی ہے۔ عاشق، درختوں، ندیوں اور تابناک سویروں پر اپنی محبت اور مسرت کو صرف کرتا ہے۔ پھول ہر قدرتی چیز سے زیادہ حسین ہیں۔ اور یہی پھول تناسل کے ذرائع اور علائم ہیں اور مردوں میں نرمی اور سپردگی کی نشانیاں۔ جب عمر ہمیں تواتر سے بے کیف بنا دیتی ہے اور جذبہ محبت مردہ ہو جاتا ہے تو فطرت کے دیدار کی لذت بھی ختم ہو جاتی ہے اور زیادہ عمر لوگ زیادہ کم عمر لوگوں کی طرح جنگلوں کے رنگ و بو سے ستاروں کی خوش آئند شوکت سے ابھرتے سمندر کی بے باک موجوں سے متاثر نہیں ہوتے۔ ارض و سما کے ہر حسن پر جنس کے دیوتا کے نقش قدم ثبت نظر آتے ہیں۔

۵۔ حسن ثالث۔ فن

حسن کا وفور، جو اشخاص سے اشیا تک پھیلتا ہے۔ اور ہماری سرزمین کو حسین بناتا ہے۔ آخرکار فن کی شورش تخلیق کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، مرد حسن سے آشنا ہو کر اس کے تصور کو حافظہ میں رکھتا ہے اور بہت سی دیکھی ہوئی حسین چیزوں کو ملا کر ایک نئی حسن کی تخلیق کرتا ہے۔ جس سے اس کا ادھورا کمال ایک واحد نظر میں منسلک ہوتا ہے۔

حیاتیاتی نقطہ نظر سے فن حیوانوں کے عہد تناسل کے رقص و نغمہ سے پیدا ہوتا ہے اور ان کی رنگ و ہیئت کے وفور کی کوششوں سے جنم لیتا ہے۔ جن سے قدرت محبت کے موسم کو مالا مال کرتی ہے جب مرغ فردوس نے اپنی محبوبہ کے لئے گھونسا بنایا تو فن پیدا ہوا، تاریخی نقطہ نظر سے فن صناعانہ مصوری لباس اور وحشی قبائل میں جسم کو مجروح کرنے کی رسم کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے "گروس کہتا ہے کہ آسٹریلیا کے وحشی جہاں جاتے ہیں اپنے ساتھ بوری میں سفید، سرخ اور زرد رنگ رکھتے ہیں، عام دنوں میں وہ گالوں پر ہلکے رنگ لگاتے ہیں اور زمانہ جنگ میں وہ اپنے بدن پر بے طرح رنگ مل کر انہیں عجیب و

دشمن خوف زدہ ہو جائے تہواروں اور محبت کے
غریب شکلیں دیتے ہیں تاکہ لڑکیاں ان کی طرف متوجہ ہوں' جنگ
اپنے سارے جسم پر رنگ ملتے ہیں تاکہ کچھ قبیلے اسے اس قدر پسند کرتے
دونوں کھیلوں کے لئے سرخ محبوب رنگ ہے' ہیں
اسے حاصل کرنے کے لئے سفر کی سخت صعوبتیں برداشت کرتے ہیں۔ مرد عورتوں سے
اپنے جسموں پر رنگ ملتے ہیں اور بعض علاقوں میں غیر شادی شدہ عورتوں کو
رنگ ملنے کی ممانعت ہے۔

لیکن رنگ دھل جاتا ہے اور وحشی یونانیوں کی طرح (جو رنگ کے جلدی مٹ جانے
کی وجہ سے مصوری کو تضحیک کی نظر سے دیکھتے تھے) کوئی زیادہ مستقل فن ڈھونڈتے
وہ جسم کو گودنا شروع کر دیتے ہیں۔ کبھی کبھار وہ جسم اور جلد کو کاٹ کر زخم میں مٹی
اسے پھیلا دیتے ہیں' ٹورز سٹریٹس میں مرد اپنے کندھوں کو زخمی کر لیتے ہیں' ان سب سے
زیادہ خطرناک فن کانوں اور نچلے ہونٹوں کو چھیدنے کا ہے بوٹوکیوڈو قبیلہ کا نام بوٹ سے
اخذ ہوا ہے جس کے معنی ہیں "میخ" جو اوائل شباب کانوں اور نچلے ہونٹوں میں چھید
جاتی ہے اور کبھی کبھی یہ میخیں خاصی موٹی ہوتی ہیں' حتیٰ کہ ان کا بنایا ہوا چھید چار انچ
تک کا ہو جاتا ہے۔ مہذب عورتوں کے سامنے جب اس بربریت کا تذکرہ کیا جاتا ہے
دہشت سے اپنے کانوں کے آویزے ہلانے لگتی ہیں۔

لباس کا اولین مصرف افادی نہیں جمالیاتی تھا۔ جب ڈارون نے ایک ٹھٹھرتے ہوئے
فیوجین پر ترس کھا کر اسے اوڑھنے کے لئے ایک سرخ کپڑا دیا تو اس نے نہایت خوشی سے
اس قیمتی کپڑے کے کئی ٹکڑے کر کے انہیں اپنے دوستوں میں بانٹ دیا اس کے دوستوں
نے ان ٹکڑوں کو آرائش کے طور پر اپنے جسم پر باندھ لیا۔ حسن کے لئے افادہ کی اس
قربانی سے موجودہ زمانہ کی لڑکی کس قدر قریب ہے جو گرمیوں میں پشمینہ پہنتی ہے اور
سردیوں میں بیباکی سے اپنی گردن برہنہ رکھتی ہے۔

اپنے جسم کو خوب آراستہ کرنے کے بعد وحشی انسان نے چیزوں کی ترصیع شروع کی
دشمن کو ڈرانے کے لئے اس نے ایکیلیز کی ڈھال کی طرح اپنے اسلحہ کو رنگین بنایا پتھر کے
اوازروں پر نقش و نگار کئے جو آج تک موجود ہیں۔ غاروں کی دیواروں پر ان حیوانوں کی
تصویریں کھینچیں جن کا وہ شکار کرنا چاہتا تھا۔ یا جن کی وہ پرستش کرتا تھا۔

مذہب نے' اگرچہ وہ حسن کا سرچشمہ نہیں ہے۔ فنون کی نشوونما میں محبت کے بعد
سب سے زیادہ حصہ لیا ہے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے بت تراشی ان کے گرد

میناروں کی تعمیر سے شروع ہوئی جو قبروں کی شناخت کے لئے بنائے جاتے تھے فن کے ارتقا کے ساتھ مینار کے بالائی حصے کو سر کی شکل دی گئی۔ اس کے بعد سارے مینار کو انسان کی کی ہیئت میں تعمیر کیا گیا۔ اس کے بعد صبر اور استقلال کے اضافہ سے بت تراش نے اپنی تخلیق کو زیادہ حسین بنانے کی کوشش کی اور اس دیوتا کی ان صفات کو اجاگر کرنے لگا جنہیں وہ غیر فانی بنانا چاہتا تھا۔ صرف اعلیٰ درجہ کی بت تراشی میں محبت کار فرما ہوتی ہے۔

فن تعمیر قبروں کی تعمیر سے شروع ہوا۔ دنیا کی سب سے قدیم تعمیرات اہرام مصر قبریں ہیں۔ کلیسا شروع میں مقبرے تھے جہاں مرے ہوئے بزرگوں کی پرستش ہوتی تھی۔ آہستہ آہستہ مردوں کو عمارت کے ساتھ میدان میں دفن کیا جانے لگا۔ لیکن آج بھی ویسٹ منسٹر ایبے میں پرانے بزرگوں کی قبریں کلیسا کی عمارت کے اندر ہیں۔ اس ابتدا سے وہ عظیم الشان مندر پیدا ہوئے جو یونانیوں نے پیلازا تھین اور دوسرے دیوتاؤں کے اعزاز میں تعمیر کیے تھے اور اسی قسم کی ابتدا سے انسان کی وہ حسین ترین تخلیقات یعنی گاتھی کلیسا' جو مقدس بزرگوں کے مقبرے ہیں۔

تمثیل کا سرچشمہ مذہبی رسوم اور تہوار ہیں۔ مشکک یوریڈیز کے وقت تک تمثیل کو ایتھنز میں ایک مقدس چیز سمجھا جاتا تھا اور جدید تمثیل جس کی نوعیت جدید فنون میں سب سے زیادہ غیر مذہبی ہے' نماز عشائے ربانی اور ان مقدس رسوم سے پیدا ہوئی جو زمانہ وسطیٰ میں مسیح کی زندگی اور موت کی عکاسی کرتی تھیں۔ کلیساؤں کی ترصیع میں بت تراشی نے ایک نئی شوکت اور رفعت حاصل کی اور مصوری مسیحیت کے زیر اثر اوج کمال پر پہنچی۔

لیکن مذہب کی خدمت بھی فن محبت سے اپنے خفیہ تعلق کا اظہار کرتا رہا۔ احیائے علوم کے عہد کی مقدس ترین تصویروں میں حسین جسم کی پرستش کا عنصر بھی شامل ہے۔ جب احیائے علوم روما سے وینس پہنچا تو فطرت پرستی کا عنصر غالب آیا اور مقدس محبت کی جگہ غیر مقدس محبت نے لے لی۔

جس طرح مذہبی فن خدائے جنس سے طاقت حاصل کرتا ہے' اسی طرح تخلیق حسن کا ہر عنصر خدائے جنس کا رہین منت ہے۔ ترنم فورا محبت سے وابستہ ہو کر نغمہ' رقص اور شاعری کی تخلیق کرتا ہے۔ نقالی' فن تعمیر اور مصوری کی نشوونما میں مدد دیتی ہیں۔ لیکن محبت ہی اس چیز کا انتخاب کرتی ہے جس کی ہم نقل کرتے ہیں۔ ترنم اور نقل کو جذبہ محبت میں سمو دو تو تمہیں بیشتر ادب کی توجیہہ مل جائے گی۔ حتیٰ کہ ڈانٹے کا کبریائی نغمہ جو بظاہر انسانی زندگی کا تمثیلی بیان ہے درحقیقت ایک نغمہ محبت ہے۔

جنسی توانائی کا یہ زیر زمین سمندر فنکار کے تخلیقی جذبہ کی آبیاری کرتا ہے۔ بعض فن کاروں میں یہ تعلق جنس اور فن کے بیک وقت بلوغ میں ظاہر ہوتا ہے اور اس اتحاد سے رومانی قسم کا جینیس پیدا ہوتا ہے۔ سفو' سکندر اور لیو کرنیٹس' بائرن شیلے' کیٹس اور سون برن' ہیوگو' روسو اور ورلین۔ پیٹراک' برونو اور گیورجیون شلر' ہانیے اور پو' شومن۔ شوبرٹ اور شوپین' سٹینڈبرگ' لونتری بیشیف اور چینو کونسکی وہ لوگ ہیں جن میں تخیل عقل پر حاوی ہوتا ہے اور جن میں جنس اور فن ایک ہی سرچشمہ سے پرخروش توانائی حاصل کر کے فن کار کو ختم کر دیتے ہیں اور اس کی جوانی کے خاتمہ سے پہلے ہی اسے جسمانی اور روحانی طور پر مردہ چھوڑ جاتے ہیں۔ چونکہ آرزو ان میں ایک مستقل اندوہ کی صورت اختیار کرتی ہے۔ وہ حساس جذباتی' خوگر الم اور بے طرح تخیل پرست ہوتے ہیں۔ عجیب و غریب اور نادر چیزیں ان کے لئے بے پناہ کشش رکھتی ہیں یہ لوگ محبت کی شاعری' مصوری' موسیقی اور فلسفہ پیدا کرتے ہیں اور ہر عاشق ان کی تخلیقات کی پرستش کرتا ہے۔

لیکن دوسرے فن کاروں میں جنس کا سیلاب سراسر تخلیق کی راہ اختیار کرتا ہے۔ محبت اپنی طاقت کھو دیتی ہے۔ جذبات قابو میں آجاتے ہیں۔ عقل پھلتی پھولتی ہے اور ذہن ہر چیز پر چھا جاتا ہے۔ اس عظیم ارتفاع سے کلاسیکی جینیس پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً سقراط۔ سفوکلیس' ارسطو' ارشمیدس' سیزر' گیلیلیو' گیوتو' لیونارڈو نیشین' بیکن' ملٹن' نیوٹن' ہوبز' باخ' کانٹ' گوئٹے' ہیگل' ترجینیف' فلابیئر رینان' اناطول فرانس' یہ متوازن دماغ لوگ ہیں۔ جنہوں نے آرزو پر قابو پا کر اپنے ذہن کے انتشار کو ارتفاع سے ستارہ رقصاں میں تبدیل کر دیا۔ یہ لوگ صبر اور استقلال کے ساتھ آہستہ آہستہ کام کرتے ہیں۔ آمد اور وجدان کے منتظر نہیں رہتے۔ ان کے قول و فعل میں توازن اور ضبط ہوتا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ نشوونما پاتے ہیں۔ اور تیس برس کی عمر کے بعد بہتر تخلیق کرتے ہیں اچھی شہرت پاتے ہیں اور بسا اوقات خاصی عمر تک زندہ رہتے ہیں۔ وہ رومانی قسم کے فن کار سے زیادہ ارتفاع کی وہ طاقت نہیں رکھتے جو تمام عظمت کا سرچشمہ اور طغرائے امتیاز ہے۔ لیکن اس سرچشمہ سے وہ جنس کے لئے کم اور فن کے لئے بہت زیادہ طاقت اخذ کرتے ہیں۔ مائیکل اینجلو' بیتھون اور نپولین کو اس لئے عظمت حاصل تھی کہ ان میں جینیس کی دونوں قسمیں ایک فوق البشر ربط میں متحد تھیں۔

نیطشے نے کہا ہے کہ "کسی شخص کی ذہانت ایک خونخوار چمگادڑ کی طرح ہوتی ہے۔"

یہ اپنے شعلہ میں انسان کو جلا دیتی ہے۔ محبت کا بھی یہی طریقہ ہے۔ اور اگر دونوں بیک
وقت کسی انسان پر حاوی ہو جائیں تو وہ عظیم اور روشن تخلیق کا موجب ہو گا۔ لیکن اس کی
آواز جلدی ہی بند ہو جائے گی۔ حسن اور فن کی طرح فطین بھی اپنی طاقت اس تخلیقی
سرچشمہ سے حاصل کرتا ہے جو مستقل طور پر نسل کو تروتازہ کرتا ہے اور زندگی کو غیرفانی
بناتا ہے۔

۶۔ معروضی حسن

ان سوالوں میں سے جو تشنہ جواب رہ گئے ہیں ایک سوال بالخصوص بہت اہم ہے۔ اور وہ یہ کہ آیا حسن معروضی حیثیت رکھتا ہے یا وہ ایک ذاتی اور داخلی تعصب ہے؟

ایلس جس کی رائے نہایت قابل احترام ہے (کیونکہ وہ اس کے علمی تجربہ پر مبنی ہے) یہ کہتا ہے کہ حسن شاہد سے مستغنی ہے۔ اور اپنے نقطہ نظر کی حمایت میں یہ کہتا ہے کہ دنیا کی اکثر نسلوں کے جمالیاتی رجحانات بنیادی طور پر ایک جیسے ہیں۔ لیکن جب ہم چینی موسیقی اور زولو جراحتوں کو دیکھتے ہیں تو یہ خیال اتنا صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ حسن اخلاق کی طرح جغرافیہ کے ساتھ بدلتا ہے۔ ڈارون ہمیں بتاتا ہے کہ تاہیتی کے وحشی چپٹی ناک کو پسند کرتے ہیں اور حسن کی خاطر اپنے بچوں کے نتھنے اور پیشانیاں دبا دیتے ہیں۔ مایا قبیلے کے لوگ زیورات سے اپنے بچوں کے ناک اور کان چھید دیتے ہیں۔ اور ان کے دانتوں کو گھس کر ان کے اوپر کچھ چڑھا دیتے ہیں اور ان کے سروں کو تختے کے نیچے دبا دیتے ہیں۔ اور انہیں بھینگا پن سکھاتے ہیں ' کیونکہ انہیں اسی میں حسن نظر آتا ہے۔ منگوپارک حیران رہ گیا کہ افریقہ کے کالے حبشی اس کی سفید جلد کا مذاق اڑاتے تھے۔ جب مشرقی افریقہ کے ساحل پر حبشی بچوں نے رچرڈ برٹن کو دیکھا تو وہ پکار اٹھے۔ "ذرا سفید آدمی کو دیکھو کیا وہ ایک سفید بندر کی طرح معلوم نہیں ہوتا؟" اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ زولو حبشی ایک کالے گریلے کی مانند ہے۔ غالباً ہم دونوں صحیح کہتے ہیں۔

یا بعض افریقی حسیناؤں کی چرب نوازی پر غور کرو۔ ڈارون کہتا ہے "اکثر لوگ یہ جانتے ہیں کہ بہت سی ہاٹن ٹوٹ عورتوں کے کولہے بے حد بڑھے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور سر اینڈریو سمتھ کو یہ یقین ہے کہ یہ خصوصیت مردوں کے لئے بہت کشش رکھتی ہے۔ اس نے ایک دفعہ ایک عورت کو دیکھا جو قبیلہ میں اپنے حسن کی وجہ سے مشہور تھی اس کے کولہے اتنے زیادہ بڑھے ہوئے تھے کہ جب وہ ہموار زمین پر بیٹھتی تھی تو اٹھ نہیں سکتی تھی

اور جب تک وہ ڈھلوان کے قریب نہ پہنچتی اسے اپنے آپ کو دھکیلنا پڑتا۔ مختلف حبشی قبائل میں کچھ عورتیں یہی خصوصیت رکھتی ہیں۔ اور برٹن کہتا ہے کہ سومال قبیلے کے مردوں کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ عورتوں کو ایک صف میں کھڑا کر دیتے ہیں اور جس کے کولہے سب سے زیادہ بھاری ہوں اسے اپنی بیوی بنا لیتے ہیں ایک حبشی کے لئے دبلے پتلے کولہوں سے زیادہ قابل نفرت چیز کوئی نہیں۔

حتیٰ کہ یورپ کے لوگوں میں بھی حسن کا معیار، مقام اور زمانے کے ساتھ رہا ہے۔ کبھی مضبوط اور فربہ ہونے کی رسم تھی۔ ریوبنز کی وسیع و عریض عورتوں، رمبراں کی فربہ لڑکیوں کو دیکھو حتیٰ کہ رےفیل کی عورتیں بھی جسمانی لحاظ سے فربہ ہیں۔ لیکن رینالڈز، گینزبرو اور رومنی کی حسینائیں جثہ میں بہت کم ہیں۔ اور وسلر کی عورتیں نازک اور لاغر ہیں ہمارے اپنے زمانہ میں نسائی حسن کا معیار فربہی سے نزاکت میں بدل گیا ہے۔ جسموں کے فیشن بھی لباسوں کے فیشن کی طرح بدلتے رہتے ہیں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جمالیاتی احساس میں ایک داخلی نسلی اور شخصی عنصر موجود ہے۔ فقط ایک عنصر معروضی ہے اور وہ یہ کہ تقریباً تمام دنیا کے صحت مند مرد ان عورتوں کو ترجیح دیتے ہیں جن کی ہیئت صحت مند ماںتا کی ضامن ہوتی ہے۔ بنیادی طور پر فطری وظیفہ کا کمال صحت مند ذوق کی تسکین کرتا ہے۔ پہلے عورت میں، بعد میں کسی اور چیز میں کوئی کام جو اچھے طریقہ پر نبھایا گیا ہو، کوئی زندگی جو اچھی طرح بسر کی گئی ہو، کوئی کنبہ جس کی اچھی طرح پرورش کی گئی ہو، کوئی اوزار جو اپنا کام بخوبی سرانجام دیتا ہو، ہمیں یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ یہ حسین ہے۔ اگر ہم بالکل صحیح الذہن ہوں تو ہمیں ایک تنومند عورت جو اپنے تندرست بچے کی پرورش کر رہی ہو دنیا کے تمام حسن کی معراج معلوم ہو۔ اس معاملہ میں زمانہ وسطیٰ اور زمانہ احیائے علوم اپنی "مریموں اور بچوں" کے ساتھ مذاق حسن میں ہم سے کہیں زیادہ بہتر اور صحیح تر تھے۔ ایک انحطاط پذیر فن کے ذریعہ گمراہ ہو کر ہم کمزور اور پتلی دبلی عورتوں کے پیچھے بھاگتے ہیں جو بچے پیدا کرنا کم جانتی ہیں لیکن بھڑکی طرح کاٹنے میں مہارت رکھتی ہیں۔

اگر ہماری جبلتیں غازہ و گلگونہ سے فریب نہ کھائیں یا مال و دولت سے گمراہ نہ ہو جائیں تو ہمارا احساس حسن حیاتیاتی طور پر صحیح ہو گا اور محبت بہترین وراثت اور اولاد کی ضامن ہو گی۔ حسن پھر فطرت کے مقاصد کے مطابق صحت کا پھول اور مغنی بنے گا۔ اور کامل طور پر تندرست بچوں کا ضامن ہو گا۔ وہ ایک بار پھر نسل کو کمزور نہیں مستحکم بنائے

۹۔ اخلاقیات اور جمالیات ایک دوسرے میں مدغم ہو جائیں گے اور ہم افلاطون کی طرح اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ "نیکی کا اصول حسن کے آئین میں تحلیل ہو جاتا ہے۔"
افلاطون اس معاملہ میں جھجکتا رہا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ کس طرف جھکے درشت اتھین کی حکمت کے سامنے یہ افرو ڈائٹ کی متبسم جاذبیت کے آگے۔ غالباً وہ جھجکنے میں عقل سے کام لے رہا تھا اور حسن جیسا کہ ہمارے ہاں موجود ہے ایک کامل ریاست کی بنیاد مشکل ہی سے بن سکتا ہے۔ لیکن اس حکمت سے کیا فائدہ جو ہمیں حسن سے محبت کرنا اور حسن فطرت سے بہتر حسن تخلیق کرنا نہ سکھائے۔ حکمت ایک وسیلہ ہے۔ جسم اور روح کا حسن ایک مقصد ہے۔ فن سائنس کے بغیر افلاس ہے۔ لیکن سائنس فن کے بغیر بربریت ہے حتیٰ کہ کبریائی فلسفہ بھی ایک وسیلہ ہے۔ لیکن جب ہم اس کی پرواز کو ایک بھرپور زندگی کی مربوط قدروں پر پھیلا دیں تو وہ مقصد بن جاتا ہے۔ کوئی فلسفہ جو حسن و جمال سے متاثر نہ ہو انسان کے قابل نہیں ہے۔
مصر کا کچھ نہیں رہا۔ سوائے ان پرشکوہ و جلال عمارتوں کے جو اس نے صحرا میں استوار کیں۔ یونان کا کچھ باقی نہیں سوائے اس کی حکمت و فن کے۔ زندہ حسن بہترین ہے۔ لیکن عمر اور وقت کے ساتھ وہ مرجھا جاتا ہے۔ صرف فن کار ہی ہنگامی حسن کو گرفت میں لا سکتا ہے اور اسے ایک غیر فانی ہیئت عطا کر سکتا ہے۔ ذرا گوئٹے کو سنئے:۔

تمام چیزیں فانی ہیں۔ پر اجلال فن ہی بقا سے آشنا ہو سکتا ہے۔
مرمر میں ڈھلا ہو سینہ ریاست کے فنا ہونے پر بھی زندہ رہتا ہے۔
اور پر ہیبت تمغہ، جسے کوئی مزدور زمین کی تہوں میں سے نکالتا ہے، شہنشاہ کی یاد کو محفوظ رکھتا ہے۔
دیوتا مر جائیں گے۔ لیکن ملکہ سخن لازوال ہے وہ موت سے بھی زیادہ طاقتور ہے۔